سلسلۂ مطبوعات مجلس علمیہ

عہد ابراہیم عادل شاہ ثانی

کے

متولّیان ریاست

(تالیف)

مولوی سید علی محسن صاحب ایم۔ اے (عثمانیہ)

(سنہ ۱۹۳۷ء)

دفعہ اول — مطبوعہ — قیمت عہ

اعظم جاہی مشین پریس حیدرآباد دکن

تعارف

مجلس علمیہ طیلسانئین عثمانیہ اس غرض سے قایم کی گئی ہے کہ عام طور پر تعلیم یافتگان جامعہ عثمانیہ اور بالخصوص طیلسانئین کے علمی و ادبی کارناموں کو منظر عام پر لائے اور اس طرح اردو زبان کی خدمت اور اردو میں اعلیٰ علمی کتابوں کی اشاعت کا کام انجام دے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے فی الحال یہ طریقہ اختیار کیا گیا ہے کہ ام۔ اے اور ایم ایس سی کے لیے مختلف علمی موضوعات پر جو محققانہ مقالے جامعۂ عثمانیہ کے پوسٹ گریجویٹ طلبہ سے لکھائے جاتے ہیں اور جن کو خود جامعہ عثمانیہ اور بیرونی جامعوں کے علما بہ حیثیت ممتحن کے تنقیدی نظر سے دیکھ کر قابل قبول قرار دیتے ہیں ان کو مجلس کے ترجمان "مجلہ طیلسانئین" میں طبع کرنے کے علاوہ کتابی صورت میں شایع کیا جائے۔ مجلس نے مقالات کے انتخاب میں بہت احتیاط کے ساتھ کام لے کر صرف ایسے مقالات کو شایع کرنے کا تہیہ کیا ہے جو بہ ہمہ وجوہ قابل قدر ہوں اور جن کی اشاعت سے صحیح معنوں میں علم و ادب کی خدمت مقصود ہو۔ توقع ہے کہ زیر نظر مقالہ اپنے موضوع کے متعلق اہل اردو کی معلومات میں اضافہ کا باعث ہوگا۔

سید محمد
معتمد مجلس علمیہ طیلسانئین عثمانیہ

فہرست مضامین

عہدِ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے متوین ریاست

بابِ اوّل

ابراہیم ثانی کی تخت نشینی کے وقت ملک کی عام سیاسی حالت

تمہید | بانیِ سلطنت یوسف عادل شاہ کے بعد سے ابراہیم ثانی تک چار بادشاہ تخت نشین ہوئے اسمٰعیل عادل شاہ نے تقریباً پچیس سال نہایت کامیاب حکومت کی اس کی وفات پر اس کا بڑا بیٹا ملّو عادل شاہ تخت نشین ہوا، مگر سخت نااہل ہونے کی وجہ سے چھ مہینے کے اندر ہی معزول کر دیا گیا اور اس کی جگہ اس کا چھوٹا بھائی ابراہیم اول سریر آرائے سلطنت ہوا، اس کے زمانۂ حکومت میں ایک طرف شولاپور اور کلیانی کے نہایت اہم قلعے ہاتھ سے نکل گئے جن پر نظام شاہیوں کا تصرف ہوگیا اور دوسری طرف رائچور اور مدگل کے مابہ النزاع علاقوں پر وجیانگر کا قبضہ ہوگیا اس طریقے سے جب علی عادل شاہ تخت نشیں ہوا ہے بیجاپور کے نہایت اہم اور سرحدی قلعے جن کے واسطے پچھلے بادشاہوں کے زمانہ میں کافی خوں ریزیاں ہو چکی تھیں دشمنوں کے قبضے میں چلے گئے تھے۔ علی عادل شاہ کے بعد ابراہیم ثانی تخت نشیں ہوا مگر اس کی تخت نشینی کے وقت ملک کی عام سیاسی حالت کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ عادل شاہ کے زمانۂ حکومت پر ذرا تفصیل سے ایک نظر ڈال لی جائے

علی عادل شاہ اول | ۹۶۵ھ مطابق ۱۵۵۷ء میں جب ابراہیم کا انتقال ہوا تو اس کا بیٹا علی عادل شاہ اول کے لقب سے اس کا جانشیں ہوا۔ اس کا زمانۂ حکومت بیجاپور کی تاریخ میں ایک خاص اہمیت رکھتا ہے۔ اس کے دور میں بیجاپوری سلطنت کو غیر معمولی ترقی حاصل ہوئی۔ نہ صرف یہ کہ اس کے مقبوضات میں اضافہ ہوا اور حدودِ سلطنت میں توسیع عمل میں آئی بلکہ دولت کی فراوانی کی وجہ سے اگر ایک طرف معاشی خوش حالی ملک میں پیدا ہو چلی تھی تو دوسری طرف تمدن اور معاشرت کی ترقی، علوم و فنون کی ہر دل عزیزی اور ان کا پھیلاؤ اس چیز کو ظاہر کر رہا ہے کہ ملک بحیثیت مجموعی شاہراہ ترقی پر گامزن ہے۔ علی عادل شاہ اپنے تدبر و فراست و

معاملہ فہمی اور سیاسی دوراندیشی کی بدولت ہمیشہ اپنے دشمنوں پر غالب رہتا ہے اور یہی وجہ تھی کہ وہ اپنے انتقال سے پہلے اپنے رقیبوں اور دشمنوں کو زیر کرنے میں کامیاب ہوا جو ہمیشہ بیجاپور کی بربادی کے درپے رہتے تھے اور اس کے جیتے جی کسی کی ہمت نہ بڑھتی تھی کہ اس کے مقبوضات پر دست تصرف دراز کریں۔

علی تخت نشیں ہوتے ہی ریاست کے کھوئے ہوئے مقبوضات حاصل کرنے کی طرف متوجہ ہوا۔ مدگل و رائچور وجیانگر کے راجہ کے قبضے میں تھے اور وجیانگر کی طاقت اس وقت انتہائی عروج پر تھی ایسی صورت میں اس مقتدر اور باحیثیت ریاست سے مقابلہ کرنا خود اپنی بربادی کا بیڑا اٹھانا تھا اور بخلاف اس کے اگر وجیانگر کو دوست بنا لیا جائے اور وہاں کے راجہ سے خوشگوار تعلقات پیدا کر لیئے جائیں تو کم از کم بیجاپوری ریاست کے دوسرے دشمنوں کو نیچا دکھانے کا اچھا موقع مل سکتا تھا۔ اسی غرض سے علی عادل شاہ نے شروع ہی سے اس امر کی کوشش کی کہ رام راج والیٔ وجیانگر کو اپنا دوست بنائے چنانچہ بوتراب شیرازی اور کشور خاں کو ریاست بیجاپور کے سفیر کی حیثیت سے دربار وجیانگر میں روانہ کیا گیا یہاں سفیروں کی بڑی آؤبھگت ہوئی اور انکو خوش کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا خود رام راج نے ان سفیروں کی روانگی کے وقت اپنے مقربین سے ایک شخص کو اس غرض سے بیجاپور روانہ کیا کہ دربار وجیانگر کی طرف سے علی عادل شاہ کی تخت نشینی پر مبارکباد دے۔ اسی اثناء میں رام راج کے ایک لڑکے کا انتقال ہو گیا جس کو وہ بہت عزیز رکھتا تھا۔ علی عادل شاہ اس نئے اتحاد کی بنیادوں کو زیادہ مضبوط اور مستحکم کرنے کے لیئے بہ نفس نفیس عازم وجیانگر ہوا کہ رسم تعزیت ادا کرے اور رام راج سے اپنی دلی ہمدردی کا اظہار کرے۔ صرف ایک سو ہمراہیوں کے ساتھ اتنا فاصلہ طے کر کے محض رسم تعزیت ادا کرنے کے لئے علی عادل شاہ کا اس طرح بیدھڑک ایک غیر ریاست میں چلا آنا جو ہمیشہ مسلمانوں کی دشمن اور خون کی پیاسی رہی ہو رام راج کو متاثر کئے بغیر نہ رہا۔ شاہ بیجاپور کا اعلیٰ پیمانہ پر استقبال کیا گیا اور اس کی آمد کی خوشی میں نہایت شاندار ضیافتیں کی گئیں۔ رام راج کی بیوی نے بھی علی عادل شاہ سے پردہ نہیں کیا بلکہ اس کو اپنا متبنیٰ کر لیا۔ غرض وجیانگر کی طرف سے تاجدار بیجاپور کی خوب خاطر و مدارات کی گئی اور ان دونوں والیان ریاست کے درمیان نہایت ہی گہرا اتحاد قائم ہو گیا لیکن علی عادل شاہ کی روانگی کے

وقت رام راج سے ایک ایسی حرکت ہوئی جس کو وہ کبھی فراموش نہیں کر سکا اور دل میں تہیہ کر لیا کہ وجیانگر کے راجہ سے اس کی بد دماغی کا کسی نہ کسی وقت ضرور بدلہ لیا جائے گا۔ فی الحال علی عادل شاہ خون کے گھونٹ پیکر خاموش رہ گیا مگر موقع کی تلاش میں تھا کہ رام راج کی اس حرکت کا خوب اچھی طرح بدلہ لے۔

رام راج کی جو حرکت علی عادل شاہ کو ناگوار گذری وہ یہ تھی کہ جب علی عادل شاہ نے بیجاپور کے ارادے سے وجیانگر کو خیرباد کہا تو رام راج نے علی عادل شاہ کو پہنچانے کے لئے خود تو کوئی زحمت گوارا نہیں کی البتہ اپنے عہدہ داران ریاست کو اس کام پر مامور کر دیا کہ وہ علی عادل شاہ کو سرحد تک چھوڑ آئیں۔ رام راج کی اس حرکت سے اس کی لاپروائی، بے اعتنائی، غرور و نخوت اور اسلامی بادشاہوں کی کم وقعتی ظاہر ہوتی ہے۔ علی عادل شاہ نے اس کو محسوس کیا مگر وقت کے وقت خاموشی کو مناسب جانکر اپنی ناخوشی کو ظاہر ہونے نہ دیا۔

بیجاپور واپس آتے ہی علی عادل شاہ نے اپنے پرانے منصوبے کی تکمیل کی طرف توجہ کی کلیانی اور شولاپور کا ہاتھ سے نکل جانا اُسے ہمیشہ خار کی طرح کھٹکتا تھا اور اُس نے دراصل رام راج سے اتنی ساری دوستی اور اتحاد محض اس وجہ سے پیدا کیا تھا کہ اگر ضرورت ہو تو وجیانگر کی فوجوں کی مدد سے ان کھوئے ہوئے علاقوں کو حاصل کیا جائے چنانچہ شاہ حسین آنجو کو حسین نظام شاہ کے پاس روانہ کیا گیا کہ وہ کلیانی اور شولاپور کی واپسی کے متعلق گفت و شنید کرے مگر حسین نظام شاہ کب ان باتوں کو سننے والا تھا۔ اُس نے ان دونوں علاقوں[1] کی واپسی سے قطعاً انکار کر دیا۔ ایک اور سفیر[2] دربار بیجاپور سے بغرض مصالحت روانہ کیا گیا مگر نظام شاہ نے ان میں سے کسی کی نہ سُنی اور اپنی ہٹ پر قائم رہا۔ آخر کار جنگ تک نوبت پہنچی۔ وجیانگر کی فوجیں بھی مدد کے لئے بیجاپوری افواج سے آملیں۔ ان متحدہ فوجوں کا جب احمد نگری علاقوں پر حملہ ہوا تو حسین نظام شاہ نے مقاومت کی تاب نہ دیکھی اور مجبوراً اس شرط پر راضی ہو گیا کہ کلیانی کا قلعہ بیجاپور کے حوالے کر دیا جائے۔

---

[1] علی عادل شاہ نے یہ خواہش ظاہر کی تھی کہ اگر دونوں قلعے واپس نہیں کئے جا سکتے ہیں تو کم از کم کلیانی کا قلعہ ہی واپس کر دیا جائے۔ (فرشتہ)۔

[2] اس سفیر کا نام سید علی تھا۔

چنانچہ اس پر عمل ہوا اور مصالحت ہوگئی مگر جیسے ہی غنیم کی فوج واپس ہوئی حسین نظام شاہ ابراہیم قطب شاہ سے مدد کا خواستگار ہوا اور اس اتحاد کو مستحکم کرنے کے لئے اپنی لڑکی بی بی جمالی کو والی گولکنڈہ سے بیاہ دیا۔ اب گولکنڈہ اور احمد نگر کی فوجوں نے پھر کلیانی کا محاصرہ کر لیا جب علی عادل شاہ کو اس کی خبر لگی تو اس نے رام راج کو اپنی مدد پر دوبارہ طلب کیا۔ رام راج تو ایسے موقعوں کو غنیمت ہی سمجھتا تھا۔ فوراً آموجود ہوا۔ ابراہیم قطب شاہ بجائے اس کے کہ ایسے وقت اپنے حلیف اور خسر کی مدد کرتا۔ اُلٹے رام راج اور علی عادل شاہ سے جا ملا۔ جیسے ہی یہ خبر نظام شاہ کو ملی تو وہ فوراً احمد نگر کی طرف چلدیا اور جنیر کے قلعے میں محصور ہو گیا۔ علی عادل شاہ نے مع اپنے حلیفوں کے خود بھی احمد نگر کا رُخ کیا اس کا محاصرہ کر لیا گیا۔ مگر چونکہ ابراہیم قطب شاہ خفیہ طور پر محصورین کی مدد کر رہا تھا قلعہ فتح نہ ہو سکا۔ اور علی عادل شاہ نے یہ خیال کر کے کہ محصورین کو پوشیدہ طور پر مدد پہنچ رہی ہے محاصرہ کا اُٹھا لینا ہی مناسب سمجھا اور شولاپور کے محاصرہ پر رام راج کو آمادہ کیا مگر کشور خاں کی رائے سے بجائے شولاپور، نلدرگ کے محاصرہ کی رائے ٹھیری۔ کیونکہ کشور خاں نے خفیہ طور پر علی عادل شاہ کو سمجھایا کہ شولاپور کا قلعہ نہایت ہی اہم اور سرحدی قلعہ ہے اگر اس وقت رام راج کی مدد سے اسے فتح کیا جائے گا تو لامحالہ رام راج جو پہلے ہی سے بہت بد دماغ اور مغرور ہو چلا ہے اُسے اپنے قبضے میں لانا چاہیگا۔ اس لئے مصلحت یہ ہے کہ اس وقت شولاپور کی طرف توجہ ہی نہ کی جائے اور اس کی بجائے نلدرگ کا محاصرہ کر لیا جائے۔ علی عادل شاہ کو کشور خاں کی یہ صائب رائے بہت پسند آئی چنانچہ اسی بناء پر اُس نے رام راج کو قلعۂ مذکور کی طرف متوجہ ہونے پر راضی کر لیا۔ اس قلعہ کو جو ایک ہندو راجہ کا بنوایا ہوا تھا مسمار کر دیا گیا اور ازسرنو اسی مقام پر ایک نیا قلعہ تیار کیا گیا جس کا نام شاہ درگ لہ رکھا گیا اور یہ قلعہ بعد میں چلکر ایک نہایت ہی مضبوط اور اہم سرحدی قلعہ ہو گیا۔ ان انتظامات سے فارغ ہوکر ہر سہ بادشاہ اپنے اپنے

لہ۔ "باستظہار رام راج درمحلیکہ قلعۂ قدیم موسوم بہ نلدرگ بنائے نمودۂ یکی از راجہ ہائے پیشیں بود مندرس و منہدم گردید وازسرنو بہ سنگ وگچ بنائے تازہ وباستحکام تمام باتمام رسانیدہ موسوم بہ شاہ درگ ساخت" بساتین صفحہ ۸۸ فرشتہ سے بھی اس بیان کی تصدیق ہوتی ہے مقالہ سوم روضہ دوم صفحہ ۳۷۔

ملک کی طرف واپس گئے۔

| وجیانگر کی بربادی | علی عادل شاہ کو، اگرچہ رام راج کی اعانت سے نظام شاہی علاقوں کو خوب تباہ

کرنے اور ایک خاندانی دشمن کو نیچا دکھانے کا موقع ملا مگر بحیثیت مجموعی وہ اپنی ان کامیابیوں سے خوش نہیں ہوا، اس کی ایک خاص وجہ تھی۔ علی عادل شاہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ رام راج کی قوت ضرورت سے زیادہ بڑھ گئی ہے اور وہ سلاطین دکن کو خاطر میں تک نہیں لاتا ہے اور پھر حسین نظام شاہ کے خلاف اس نے علی عادل شاہ کو مدد کیا دی ہے گویا اپنے نزدیک اسے بن داموں خرید لیا ہے۔ گذشتہ جنگ میں اس نے حلیفوں کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا کہ نہ صرف علی عادل شاہ بلکہ ابراہیم قطب شاہ بھی اس سے سخت ناراض ہوگیا تھا۔ احمد نگر کے حملے کے سلسلہ میں وجیانگر کی ہندو فوج نے مسلمانوں کے ساتھ نہایت برا سلوک کیا۔ ان کے مذہبی احساسات کو ٹھیس لگائی اور اسلامی تبرکات کی ایسی بے حرمتی کی کہ تمام اسلامی بادشاہوں نے اس کو بری طرح محسوس کیا اور یہ خوب سمجھنے لگے تھے کہ اگر آج احمد نگر کی باری ہے تو کل ہماری۔ غرض وجیانگر کی فوج کا یہ طرز عمل رام راج کا یہ غرور اور سلاطین کے ساتھ اس کا یہ ذلیل برتاؤ گویا خود اس کی بربادی کا پیش خیمہ تھا۔ اس کی بد دماغی یہاں تک بڑھ گئی تھی کہ ان بادشاہوں کے سفیر جب کبھی اس کے دربار میں حاضر ہوتے تو ان کو بیٹھنے کی اجازت نہیں دیتا تھا۔ ان کی ہر طرح تحقیر کیجاتی یہ تمام چیزیں ایسی نہ تھیں جن سے کہ چشم پوشی کیجاسکتی ان وجوہات کی بناء پر سلاطین دکن پہلے ہی سے جلے بیٹھے تھے اس پر طرہ یہ ہوا کہ رام راج نے نلدرگ سے واپسی کے وقت اپنے بھائی وینکٹادری کو تھوڑی سی فوج دیکر قطب شاہ اور عادل شاہ کے سرحدی علاقوں پر بھیجدیا کہ ان کی تسخیر عمل میں لائی جائے ان دونوں بادشاہوں نے اس نئی بلا کو ٹالنے کے لئے مجبوراً چند علاقے رام راج کے حوالے[1] کر دیئے۔ اس طرح علی عادل شاہ کو اس جنگ سے

---

[1] علی عادل شاہ نے اتگیر اور باگر کوٹ کے علاقے رام راج کو دیئے اور قطب شاہ کیوملی کنڈہ کنور اور پانگل سے دست بردار ہوگیا

جس میں کہ رام راج کی مدد حاصل کی گئی تھی فائدے کی بجائے اُلٹا نقصان ہو گیا۔ شولا پور جس کے لئے یہ جنگ ہوئی تھی وہ تو ہاتھ نہ آ سکا یا اس کی طرف فی الحال توجہ کرنا مناسب نہ سمجھا گیا۔ نظام شاہ کو شکستیں تو بیشک ہوئیں مگر بیجاپور کو اُن سے کچھ بھی فائدہ نہوا اور اگر کچھ ہوا تو یہی کہ اُلٹے دو علاقے ہاتھ سے نکل گئے غرض ان تمام واقعات نے علی عادل شاہ کو بھڑکایا اور وہ اس قدر غضب آلود ہوا کہ اُس نے دل میں ٹھان لی کہ اب رام راج سے اس کا بدلہ لینا چاہیئے مگر جب اُس نے اپنی حالت پر نظر کی تو دیکھا کہ تن تنہا اس کا مقابلہ کرنا تو ممکن ہی نہیں اور پھر مشیرانِ[ل] سلطنت نے یہ رائے دی کہ یکہ و تنہا رام راج سے مقابلے کا خیال کرنا دانشمندی سے بعید ہے کیونکہ اُس کی طاقت میں غیر معمولی اضافہ ہو چکا ہے اس کی ریاست نہایت وسیع اور خوش حال ہے اس کی آمدنی کے ذرائع اَن گنت ہیں اس کے ہاں ایک نہایت زبردست جرّار اور آزمودہ کار فوج ہر وقت تیار رہتی ہے غرض ہر حیثیت سے وہ ایک مقتدر راجہ ہے اگر اس کو شکست دینی منظور ہے تو سوائے اس کے چارہ نہیں کہ دوسرے سلاطین دکن سے رابطۂ اتحاد پیدا کیا جائے اور اُن کو اپنا ہم خیال کر کے رام راج کی سرکوبی کیطرف توجہ کی جائے۔ اس بناء پر ایک ایلچی کو قطب شاہ والیٔ گولکنڈہ کے پاس روانہ کیا گیا کہ وہ اس اتحاد کی بابت گفت و شنید کرے اور اس کا عندیہ لے جب قطب شاہ، عادل شاہ کے اس ارادے سے واقف ہوا تو بصد خوشی اُس کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو گیا اور یہ بھی وعدہ کیا کہ حسین نظام شاہ اور عادل شاہ کے درمیان اس انداز سے صلح کرا دی جائے گی کہ پچھلی ساری رنجشیں دور ہو جائیں چنانچہ اُس نے اپنے دربار سے ایک نہایت ہی ہوشیار اور تجربہ کار شخص کو سفیر بنا کر پہلے بیجاپور روانہ کیا کہ علی عادل شاہ کو اس کے ارادوں سے واقف کر دے اور پھر نظام شاہی دربار کو روانہ ہونے کا حکم دیا۔ یہ سفیر مصطفےٰ خاں اردستانی تھا جو ہر حیثیت سے اُس زمانے کے بہت ہی قابل، دانشمند اور باتدبیر اشخاص میں شمار

ل۔ بالخصوص کشور خاں لاری اور ابو تراب شیرازی اس معاملہ میں پیش پیش تھے۔ بیجاپوری دربار میں تدبر کے اعتبار سے یہ لوگ بہت نامور تھے اکثر اہم معاملات میں ان سے رائے لیجاتی تھی اور بہت سارے اہم کام انھیں کے سپرد کئے جاتے تھے۔

ہونے کے قابل ہے (اس کا تفصیلی ذکر کسی اور جگہ آئیگا) مصطفےٰ خاں اپنے بادشاہ کے حکم کے مطابق پہلے بیجاپور آیا اور علی عادل شاہ سے استصواب رائے کر کے حسین نظام شاہ والیٔ احمد نگر کے پاس پہنچا اور مجوزہ اتحاد کے متعلق گفت وشنید کرنے لگا۔ حسین نظام شاہ تو رام راج کے خون کا پیاسا تھا کیونکہ اُس کی بدولت اس کو اتنے نقصانات اُٹھانے پڑے تھے شکستیں کھائی تھیں اور ذلیل وخوار ہونا پڑا تھا جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ عادل شاہ اور قطب شاہ، رام راج کی بربادی کے درپے ہیں تو بخوشی ان کا ساتھ دینے کے لئے تیار ہو گیا بالآخر قطب شاہی سفیر کی کوششوں سے یہ طے پایا کہ حسین نظام شاہ اپنی بیٹی چاند بی بی کو علی عادل شاہ سے بیاہ دے اور شولاپور کا قلعہ جس کے متعلق اتنی لڑائیاں ہو چکی تھیں لڑکی کے جہیز میں دیدیا جائے اور اس طرح دونوں بادشاہوں کے درمیان جو فتنہ و فساد کی جڑ ہے اس کا خاتمہ کر دیا جائے اور ساتھ ہی یہ طے پایا کہ حسین نظام شاہ کے بیٹے مرتضیٰ کی شادی علی عادل شاہ کی بہن ہدیہ سلطانہ سے ہو جائے ان نئے رشتوں کے جڑنے کا مقصد یہ تھا کہ پرانی رنجشیں اور عداوتیں دور ہوں اور ازسرنو ایک نہایت ہی مضبوط اور مستحکم اتحاد قائم ہو جائے۔ غرض ان مقاصد کی تکمیل کے لئے حسب قرارداد یہ شادیاں ہو گئیں اور علی عادل شاہ کو نہ صرف قلعۂ شولاپور مل گیا جس کے لئے وہ اس قدر بے قرار تھا بلکہ چاند بی بی کی ذات میں وہ دُرِ نایاب بھی ہاتھ آیا کہ بیجاپور کی قسمت جاگ اُٹھی جب ان دونوں سلاطین کو شادیوں کی مہمانیوں اور میزبانیوں سے فرصت ملی تو وہ معاملاتِ رزم کی طرف متوجہ ہوئے اس عرصے میں علی برید والیٔ بیدر سے نامہ و پیام ہو چکا تھا اس نے بھی رام راج کی سرکوبی کے لئے ان سلاطین کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا چنانچہ ان چار بادشاہوں کی فوجیں عازم وجیا نگر ہوئیں۔ جنگ کے اعلان سے قبل علی عادل شاہ نے حجت کے طور پر رام راج کو کہلا بھیجا کہ مدگل[1] اور رائچور، ناگری کوب کے علاقے جو بیجاپور کی سلطنت ابد مدت سے تعلق رکھتے ہیں اور جن پر والیٔ وجیا نگر نے ناجائز دست تصرف دراز کر رکھا ہے فوراً واپس کر دیئے جائیں مگر یہ تو ظاہر ہی تھا کہ رام راج اُن کی واپسی سے قطعاً انکار کر دیگا چنانچہ اس نے نہ صرف انکار کیا بلکہ پیغام رساں ایلچیوں کو نہایت حقارت اور ذلت کے ساتھ اپنے دربار سے نکلوا دیا۔

یہاں سلاطین دکن تیار ہی بیٹھے تھے فوجوں کو فوراً کوچ کا حکم ہوا جب رام راج کو اسلامی فوجوں کی آمد کی خبر

[1] فرشتہ۔

لگی تو وہ ٹس سے مس نہوا۔ اسے یقین کامل تھا کہ اس کی زبردست فوج ان بادشاہوں کو شکست فاش دیگی! لیکن بہرحال لڑنا تو ضروری تھا اُس نے اپنی سپاہ کو آراستہ کر کے غنیم کی طرف توجہ کی سب سے پہلے اُس نے اپنے چھوٹے بھائی تیم راج کو بیس ہزار سوار، ایک لاکھ پیدل اور پانچسو ہاتھی سمیت دریائے کرشنا کی طرف روانہ کیا کہ دریا پر قبضہ کر کے دشمنوں کے عبور کا راستہ مسدود کر دیا جائے اور اس کے بعد اُسکا منجھلا بھائی ایک کثیر فوج کے ساتھ آموجود ہوا اور سب کے آخر میں خود رام راج اپنی بقیہ ساری فوج لیکر (جس کے جھنڈے کے نیچے کئی راجہ اور راجکمار تھے) نہایت تزک و احتشام کے ساتھ غنیم کی طرف متوجہ ہوا۔

یہ مشہور اور فیصلہ کُن جنگ تالی کوٹ کی جنگ کے نام سے مشہور ہے۔ تالیکوٹ دراصل ایک چھوٹا سا موضع ہے جو اُس وقت حدود عادل شاہیہ میں واقع تھا چونکہ سلاطین دکن نے اُسے اپنا مستقر بنایا تھا اور کچھ عرصے تک انھوں نے یہاں قیام بھی کیا تھا اس لئے یہ جنگ اسی مقام کے نام سے مشہور ہوئی۔ دراصل جنگ، تالیکوٹ سے بیس میل کے فاصلے پر دریائے کرشنا کے جنوبی کنارے پر ہوئی۔ غرض کہ جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو کرشنا اُن کے درمیان حائل تھی تیم راج نے نہایت سرعت اور تیزی کے ساتھ پہنچکر، رام راج کے حکم کے مطابق دریا کے تمام راستوں پر قبضہ کر رکھا تھا کہ دشمن عبور نہ کرنے پائیں۔ جب سلاطین دکن نے دیکھا کہ اس طرح اُن کا راستہ روک دیا گیا ہے تو انھوں نے ایک چال چلی۔ بظاہر انھوں نے اس مقام سے کوچ دیا جہاں پر کہ اُن کا پڑاؤ تھا اور دریا کے کنارے کنارے آگے بڑھنے لگے! وہ برابر تین روز تک بڑھتے رہے اس سے تیم راج اس دکھوکے میں اگیا کہ وہ کسی دوسرے مقام سے دریا عبور کیا چاہتے ہیں۔ لہٰذا اس نے بھی اس کا ساتھ دیا اور اس مقام کو چھوڑ چلا جس پر کہ وہ قابض تھا۔ تین دن کے بعد جب یکایک اسلامی فوجیں رات کے اندھیرے میں پھر اُسی مقام کی طرف پلٹ پڑیں جہاں سے کہ انھوں نے کوچ کیا تھا تو وجیا نگر یونکو اسکی ذرا خبر نہوئی اور جب خبر ہوئی تو اسلامی فوج بہت آگے نکل گئی تھی اور اُن سے پہلے پہنچکر دریا کے اس راستے پر قبضہ کر لیا جہاں پر تین دن پہلے رام راج کی فوجوں نے اُن کا راستہ روک رکھا تھا اس طریقے سے اسلامی فوجوں کو بآسانی دریا کے عبور کرنے کا

موقع مل گیا۔ ہندو، مسلمانوں کی اس چالاکی سے حیران ہو گئے مگر موقع کھو چکے تھے اور مسلمان نہایت عمدہ مقام پر قبضہ کر چکے تھے۔ رام راج کو جب اس کی خبر ہوئی تو وہ بھی اپنی فوج پر بہت بگڑا لیکن کیا کر سکتا تھا جب اس کی بقیہ فوج جو پیچھے رہ گئی تھی اُس سے آملی تو جنگ کی تیاریاں شروع ہو گئیں۔

متحدین کی فوج کی ترتیب اس طرح ہوئی کہ قلب میں حسین نظام شاہ، میمنہ پر عادل شاہ اور میسرہ پر قطب شاہ اور علی برید۔ اسی طرح رام راج خود قلب میں رہا اور میمنہ و میسرہ پر اپنے دونوں بھائیوں وینکٹادری اور تیم راج کو مقرر کیا۔ رام راج کی لاپروائی اور رعونت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب جنگ شروع ہوئی تو اُس نے سنگھاسن میں بیٹھکر میدان میں جانیکا ارادہ کیا اور گھوڑے پر سوار ہونے سے قطعاً انکار کیا۔ حالانکہ مقربین اور دیگر سرداران فوج نے ہر چند عرض کی کہ جنگ میں یہ سواری خطرناک ثابت ہوئی ہے مناسب یہ ہے کہ حضور گھوڑے پر سوار ہوں مگر رام راج نے اسکی مطلق پرواہ نہ کی جب انھوں نے زیادہ اصرار کیا تو اُس نے نہایت حقارت کے ساتھ کہا کہ یہ جنگ نہیں بازی طفلاں ہے اس لئے زیادہ احتیاط کی چنداں ضرورت نہیں ابھی وجیانگر کے سورما اپنا رنگ جمائیں گے اور متحدین کی فوجوں کو بھاگتے ہی بنیگی۔ بھلا وجیانگری سیلاب کے آگے یہ مور و ملخ کس شمار و قطار میں ہیں۔ غرض وہ اپنے نزدیک سمجھے ہوئے تھا کہ چند لمحوں میں جنگ کا فیصلہ ہو جائے گا اور وجیانگر کو فتح و نصرت کے جھنڈے بلند کرنیکا موقع ملیگا لیکن اُس روز کی جنگ کا حشر کچھ اور ہی ہونے والا تھا۔

جب دونوں فوجیں اچھی طرح گتھ گئیں اور لڑائی گھمسان کی ہونے لگی تو متحدین نے اپنی شہزوری اور دلاوری کے ایسے ایسے ثبوت دیئے کہ رام راج کے دانت کھٹے ہو گئے۔ رام راج نے خلاف توقع جنگ کا جو یہ حال دیکھا تو سنگھاسن سے اتر کر ایک مرصع اور زرنگار تخت پر جلوہ افروز ہوا اور اپنی فوج کے سورماؤں اور سپاہیوں کے دل بڑھانے کے لئے بے دریغ روپیہ نچھاور کرنے لگا زر و جواہرات قیمتی زیورات اور دیگر بیش بہا اشیا اپنی فوج میں تقسیم کیں۔ راجہ کی اس فیاضی سے وجیانگر کی فوج میں جانثاری کی ایک لہر دوڑ گئی اور وہ جان توڑ کوششیں کرنے لگے کہ متحدین کو مغلوب و پسپا کر دیں اور

حقیقت یہ ہے کہ رام راج کی طرف سے اس وقت پُرزور حملے ہو رہے تھے اور قریب تھا کہ متحدین کے پیر اکھڑ جائیں۔ قطب شاہ اور عادل شاہ کو فتح کی طرف سے مایوسی ہوگئی تھی مگر حسین نظام شاہ نہ صرف ثابت قدمی سے خود لڑتا رہا بلکہ اپنے حلیفوں کی بھی بڑی ہمت افزائی کی اس کی یہ دلیری اور ثابت قدمی اپنا کام کر گئی۔ قطب شاہ اور عادل شاہ جو فتح سے مایوس ہو رہے تھے از سر نو اپنی قوت کو مجتمع کر کے اس پر تُل گئے کہ جان جائے یا رہے مگر میدان کو ہاتھ سے جانے نہ دینگے۔ اسطرح میدان کارزار پھر ایکبار گرم ہوگیا

اسی اثنا میں ایک ایسا واقعہ ظہور پذیر ہوا کہ جس نے جنگ کا پانسہ ہی پلٹ دیا حسین نظام شاہ کی فوج کا ایک مست ہاتھی جنگ کی ہماہمی سے پریشان ہو کر رام راج کی فوج میں گھس پڑا۔ رام راج جنگ کی حالت دیگرگوں دیکھ کر اپنے زرنگار تخت سے اتر کر پھر سنگھاسن میں سوار ہوا ہی چاہتا تھا کہ یہ مست ہاتھی معہ فیلبان اُس طرف جا نکلا۔ وجیانگری فوج پہلے ہی سے پریشان ہو چکی تھی اور سراسیمگی کا یہ عالم تھا کہ کسی کو اپنے پرائے کی خبر نہ تھی کہ اس ہاتھی کی بدمستیوں نے انھیں اور بھی زیادہ پریشان کر دیا حتیٰ کہ وہ کہار جو راجہ کے سنگھاسن کو سنبھالے ہوئے تھے رام راج کو اپنے حال پر چھوڑ کر خود اپنی جان بچانے کے لئے میدان سے رفوچکر ہو گئے۔ جب یہ ہاتھی قریب پہنچا تو اس مرصع اور زرنگار عماری کو دیکھ کر فیلبان کے مُنہ میں پانی بھر آیا اور چاہتا تھا کہ اُس پر قبضہ کر لے۔ راجہ کے جانثاروں میں سے ایک شخص نے چلایا کہ زنہار مہاراج کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچے اگر تم اس کی سواری کے لئے گھوڑا لا دو تمہیں سرفراز کرے گا فیلبان نے جو یہ سُنا کہ رام راج یہی ہے تو فوراً بڑھ کر اُسے اپنی حراست میں لے لیا اور نہایت تیزی اور سرعت کے ساتھ اپنے آقا حسین نظام شاہ کے پاس اُسے پہنچا دیا حسین نظام شاہ اس غیر متوقع کامیابی سے بہت خوش ہوا اور فوراً اپنے مشیروں کی رائے سے رام راج کو قتل کروا دیا کہ کہیں عادل شاہ کو خبر نہ ہو جائے جو اس کی فرزندی کا دم بھرتا تھا۔ اس طرح یہ ہاتھ آیا ہوا شکار پھر کہیں چھوٹ نہ جائے۔ رام راج کا سر کاٹ کر نیزے پر لٹکایا گیا۔ وجیانگری فوج نے جو یہ حال دیکھا تو اس کے رہے سہے حواس بھی غائب ہو گئے۔ سردار کے مارے جانے کے بعد وہ کونسی فوج ہے جو جم کر لڑ سکتی ہے متحدین کے مقابلے کی اب اُن میں ہمت نہ رہی۔ ایسی وحشت اور سراسیمگی کے عالم میں وجیانگر کی یہ زبردست فوج پریشان اور منتشر ہوئی کہ قیامت کی

تصویر آنکھوں میں پھر گئی۔ ہر ایک کو اپنی جان کی پڑی تھی کوئی کسی کے حال سے آگاہ نہ تھا جس کا جس طرف منہ اٹھا وہ اسی طرف بھاگ کر جان بچاتا تھا غرض وجیانگریوں کو اس میدان میں زبردست شکست ہوئی اُن کا تھوڑی دور تک تعاقب کیا گیا اور جب خوب اچھی طرح ان کی خبر لے لی گئی تو متحدین نے اطمینان کا سانس لیا۔

اس جنگ نے وجیانگریوں کو ایسا برباد کیا اور ان کی قوت کو ایسی کاری ضرب لگائی کہ پھر وہ سنبھل نہ سکے۔ یوں تو لڑائیاں ہوتی ہیں اور فریقین میں سے کسی نہ کسی کو شکست ہونا ضروری ہے مگر یہ شکست ایسی شکست تھی کہ وجیانگر کی عظیم الشان اور باحیثیت سلطنت کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیا۔ وہ جاہ و حشم، وہ مال و دولت جو صدہا سال کی کوششوں کے بعد وجیانگر کو نصیب ہوئی تھی، چند دنوں میں نیست و نابود ہو گئی۔ جنگ تالیکوٹ نے دراصل دکن کے اسلامی بادشاہوں کے حق میں فیصلہ کر دیا۔ اس کے بعد بہت عرصے تک کوئی ہندو سلطنت اُن کے مقابلے میں کھڑی نہ ہو سکی۔ چونکہ تالیکوٹ کی جنگ دکن کی تاریخ میں غیر معمولی اہمیت رکھتی ہے اور ہندوستان کی فیصلہ کن جنگوں میں شمار ہوتی ہے اس لئے اس کا تذکرہ بہ تفصیل کیا گیا۔ نیز اس وجہ سے بھی کہ اس جنگ نے دکن کی تاریخ پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں اور وجیانگر کی بربادی نے دکن کی سیاسیات کو یکلخت بدل دیا ہے۔ وجیانگر کے برباد ہونے سے پہلے اسلامی ریاستوں کو اپنے ایک زبردست حریف کا خوف ہر وقت لگا رہتا تھا اور اس لئے وہ اپنے کو سنبھالے رہتے تھے اور وقتاً فوقتاً آپس میں متحد بھی ہو جاتے تھے مگر جب اس بڑے دشمن کا خاتمہ ہو گیا تو اُن کی آپس کی کشمکش اور بڑھ گئی اور وہ کھلے بندوں ایک دوسرے سے دست و گریباں ہونے لگے۔ اُن کے آپس کی کشمکشوں کی یہ غیر معمولی زیادتیاں بالآخر ان سلطنتوں کے زوال کا ایک اہم سبب ثابت ہوئیں۔ اس طریقے سے وجیانگر کی بربادی بالواسطہ خود ان اسلامی ریاستوں کے تدریجی زوال اور کمزوری کا باعث ہوئیں۔

جب ایکبارگی اس طاقتور دشمن اور مار آستین کو کچل دیا گیا تو سلاطین دکن کی نظریں وجیانگر کے زرخیز اور وسیع حصہ ہائے ملک پر پڑنے لگیں۔ ہر ایک کو اس کی فکر تھی کہ اس برباد شدہ ریاست کے کچھ غیر محفوظ

علاقوں کو اپنے قبضے میں کر لے۔ سب سے پہلے علی عادل شاہ نے اس معاملے میں پیشقدمی کی کیونکہ اس کو اس کا موقع مل گیا تھا حسین نظام شاہ کا انتقال تالیکوٹ کی جنگ کے تھوڑے ہی زمانہ بعد ہو گیا اور احمد نگر میں اس وقت ایک کم عمر لڑکا بادشاہی کر رہا تھا یہ لڑکا مرتضیٰ نظام شاہ ہے اس کی ماں خونزہ ہمایوں سلطان سلطنت کے کاروبار چلا رہی تھی جب احمد نگر میں یہ تبدیلی پیدا ہو گئی تو علی عادل شاہ کو اس جانب سے کوئی خطرہ نہیں رہا اور اُس نے نہایت اطمینان کے ساتھ اپنی فوجوں کو وجیانگر کے علاقوں میں بغرض فتوحات مشغول کر دیا۔ وینکٹادری نے احمد نگر سے مدد طلب کی خونزہ ہمایوں سلطان نے اس غرض سے کہ بیجاپور کی طاقت ان فتوحات سے بہت بڑھ نہ جائے فوراً توازن قوت کے مسئلہ کو پیش نظر رکھ کر وینکٹادری کی مدد کے طور پر بیجاپور پر حملہ کر دیا۔ علی عادل شاہ کو دارالخلافہ کی محافظت کی غرض سے فوراً اس طرف متوجہ ہونا پڑا۔ احمد نگر کی فوج سے کچھ لڑائیاں ہوئیں لیکن چونکہ جنگ کی اصلی غایت پوری ہو چکی تھی اس لئے نظام شاہی فوجوں نے بیجاپور سے کوچ کر دیا۔

علی عادل شاہ کی فتوحات علی عادل شاہ کا آخری زمانہ ان فتوحات سے بھرپور نظر آتا ہے جو اُس نے وجیانگر کے علاقے میں حاصل کیں۔ یوں تو اس زمانے میں احمد نگر پر بھی حملہ کیا گیا اور گووا کو بھی حاصل کرنے کی کوششیں کی گئیں، مگر یہ دونوں حملے ناکام رہے۔ اس لئے علی عادل شاہ نے قلعۂ ادھونی کی تسخیر کے لئے فوجیں بھیجیں۔ یہ ایک نہایت ہی مضبوط قلعہ تھا جس پر رام راج کے کسی سردار نے قبضہ کر لیا تھا اور خود مختارانہ حکومت کر رہا تھا۔ آنکس خاں اس قلعہ کو فتح کرنے کے لئے بیجاپور سے روانہ کیا گیا۔ اس کے ساتھ آٹھ ہزار سوار کا ایک منتخب دستہ کئی توپ خانے اور بہت سی پیدل فوج بھی روانہ کی گئی ایک طویل اور پُرخطر محاصرے کے بعد یہ مضبوط قلعہ ہاتھ آیا۔ آدھونی کے زبردست قلعہ کی فتح کی وجہ سے علی عادل شاہ کا وقار بڑھ گیا اور وہ مزید فتوحات کا خواہشمند تھا لیکن اطمینان کے ساتھ اپنی فتوحات کے سلسلے کو جاری رکھنے کے لئے یہ ضروری تھا کہ احمد نگر سے ایک معاہدہ کر لیا جائے تاکہ اُس کی طرف سے کسی قسم کا خطرہ نہ رہے۔ علی عادل شاہ کو اپنی پہلی کوشش یاد تھی کہ اُس نے اُدھر وجیانگر کی ریاست میں قدم بڑھائے اور ادھر احمد نگر کی فوج بیجاپور پر آدھمکی۔ اب وہ اس صورت حال کے اعادہ کو پسند

نہ کرتا تھا اس لئے اُس نے مرتضیٰ نظام شاہ سے سرحد پر ملاقات کی (مرتضیٰ نظام شاہ اُسوقت معاملات سلطنت اپنے ہاتھ میں لے چکا تھا) اس ملاقات میں یہ طے پایا کہ علی عادل شاہ بلاخوف وخطر وجیانگر کے علاقوں پر قابض ہو اس میں ریاست احمدنگر کو کوئی تعرض نہوگا اور مرتضیٰ نظام شاہ اگر ممکن ہو تو برار کی ریاست پر قبضہ کرنے سے بیجاپور کی ریاست اس معاملہ میں کوئی اعتراض نہ کرے گی مگر یہ شرط علی عادل شاہ کیساتھ بڑھادی گئی کہ وہ وجیانگر میں اپنی فتوحات کو اسی حد تک پھیلائے کہ مفتوحہ علاقہ کا رقبہ برار کی سلطنت سے زیادہ نہو۔ اس کا یہ مقصد تھا کہ برار اگر فتح ہو بھی جائے تو ایک مختصر اور محدود رقبہ کی ریاست ہے اور اس سے احمدنگر کچھ زیادہ فائدہ نہیں اُٹھا سکتا لیکن وجیانگر کی عظیم الشان ریاست جو تباہ ہونے کے بعد کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہوئی ہے ممکن ہے کہ علی عادل شاہ اس عہد نامے سے فائدہ اُٹھاکر اتنے علاقے حاصل کرے کہ اس کی ریاست کی وسعت میں اضافہ ہو جائے۔ اگر یہ صورت ہوتو پھر بیجاپور دوسری دکنی سلطنتوں پر بآسانی غلبہ پا سکے گا اور یہ چیز توازن قوت کے اُس اصول کے بالکل منافی ثابت ہوتی جس کی اب تک حفاظت کیجارہی تھی یہ شرط دراصل اسی توازن کے قائم رکھنے کے لیے لگائی گئی تھی۔

جب اس معاہدے کے بعد احمدنگر کی جانب سے اطمینان ہوگیا تو علی عادل شاہ کی فوجیں وجیانگر کے وسیع اور زرخیز میدانوں کی فتوحات میں مشغول ہوگئیں اور اس کوشش کا نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سے مضبوط قلعے جو کسی وقت ریاست وجیانگر کا ایک جزء تھے بیجاپوری مقبوضات میں داخل ہوگئے۔ ان فتوحات میں ادھورکل، دھارواڑ، نیکاپور، جرہ، چندرگوٹی، کرورا اور بانسلور کی فتح قابل ذکر ہے ان علاقوں پر جو راجہ و راجکمار حاکم تھے انھیں یا تو بالکل مفتوح کر لیا گیا یا اُن کو بیجاپور کا باج گذار اور مطیع و منقاد بنا کر چھوڑا گیا اس طریقے سے علی عادل شاہ کے آخری زمانے میں ان فتوحات کی بناء پر بیجاپور کی ریاست کے حدود میں بڑی توسیع عمل میں آئی اور اسی اعتبار سے اس سلطنت کی عظمت و وقار میں بڑا اضافہ ہوا۔ ان فتوحات کے سلسلے میں مصطفیٰ خاں اردستانی نے اپنی بڑی قابلیتوں کا ثبوت دیا اور ان میں اکثر مقامات اسی کی کوششوں سے فتح ہوئے تھے اس لئے علی عادل شاہ نے اسے بہیں

جاگیریں دیدی تھیں اور نئے مفتوحہ مقامات کا گورنر بنایا تھا۔ ایک عرصے تک وسعت سلطنت اور توسیع حدود کا سلسلہ جاری رہا۔ اکثر مضبوط اور مستحکم قلعے فتح ہوتے جارہے تھے اور بیجاپور کی ریاست ہر حیثیت سے مائل بہ ترقی نظر آتی تھی۔ علی عادل شاہ کا یہ آخری زمانہ جنگ تالیکوٹ کے بعد سے کم و بیش کرناٹک اور مالابار کے علاقوں کی فتح میں گذرجاتا ہے حتیٰ کہ ۹۸۷ھ مطابق ۱۵۷۹ء میں علی عادل شاہ کا انتقال ہوگیا۔

علی عادل شاہ کے انتقال کے وقت سلطنت بیجاپور کی غیر معمولی وسعت عمل میں آچکی تھی نئے نئے ملاباری علاقے اور مضبوط قلعے فتح ہو چکے تھے۔ وجیانگر کی سی زبردست اور عظیم الشان ریاست (جو اسلامی ریاستوں کی سب سے بڑی دشمن اور حریف ریاست تھی) کا خاتمہ ہوچکا تھا دکن کی تاریخ سے اس طاقت کا نام و نشان مٹ چکا تھا۔ ادھر ہندوؤں کی یہ زبردست سلطنت برباد ہوئی اور اس طرف شمال میں برار کی چھوٹی سی ریاست بھی دکن کے سیاسی نقشہ سے غائب ہو چکی تھی۔ احمد نگر کی ریاست نے اس معاہدے کے تحت (جس کا ذکر کیا گیا) برار کو اپنے قبضے میں کر لیا تھا چونکہ برار کی ریاست کا خاتمہ علی عادل شاہ کے آخری زمانے میں ہوتا ہے اور یہ بھی دکن کی تاریخ کا ایک اہم واقعہ ہے اس لئے اس کے متعلق بھی دو چار جملے لکھ دینے چاہئیں۔

برار کا خاتمہ برار کی ریاست ابتدا ہی سے بہت چھوٹے رقبے پر پھیلی ہوئی تھی اس وجہ سے وہ زیادہ قوت حاصل نہ کرسکی۔ برہان عماد شاہ کے زمانے میں جبکہ بادشاہ (برہان) بالکل کم عمر تھا تفال خاں نے (جو یہاں کا ایک مقتدر وزیر اعظم تھا) شاہی خاندان کو الگ کر کے سلطنت کو اپنے قبضے میں کر لیا تھا یہی دار وگیر اور کس مپرسی کا عالم تھا کہ برار پر احمد نگر کی للچائی ہوئی نظریں پڑنے لگیں۔ اور مرتضیٰ نظام شاہ کا پہلے ہی سے ارادہ تھا کہ تفال خاں کو الگ کر کے برار کو اپنے قبضے میں کرلے۔ اسی خواہش کی تکمیل کی غرض سے اس نے علی عادل شاہ سے وہ معاہدہ کیا جس کا اوپر ذکر کیا گیا ہے۔ اس معاہدے کی وجہ سے اسے برار پر ایک اخلاقی حق حاصل ہوگیا ادھر خود سلطنت برار تفال خاں کی غاصبانہ کارروائیوں کی وجہ سے کمزور ہو گئی تھی۔ مرتضیٰ نے ۹۸۰ھ مطابق ۱۵۷۲ء میں برار پر

حملہ کر دیا۔ تفال خاں کو شکست دی اور سلطنت برار کو احمد نگر کا ایک جزو بنا لیا۔ برہان عماد شاہ اور تفال خاں قید کر دیئے گئے اور یہیں ان دونوں کا انتقال ہو گیا۔ خیال کیا جاتا ہے کہ انکو زہر دیا گیا تھا اس طرح ۱۵۷۲ء میں برار کے عماد شاہیہ خاندان کا خاتمہ ہو گیا۔

ان واقعات کی تفصیل کے بعد دکن کی سیاسی قوتوں کا ایک سرسری معائنہ کر لینا کچھ غیر مفید نہ ہو گا۔ اس وقت دکن میں تین زبردست ریاستیں تھیں:۔

(۱) بیجا پور

(۲) احمد نگر

(۳) گولکنڈہ

ان کے علاوہ تین اور طاقتیں تھیں جن کی سیاسی اہمیت فی الحال کچھ ایسی زیادہ نہ تھی۔

(۱) بیدر

(۲) پرتگیزی

(۳) خاندیس

بیدر اس وقت رو بہ زوال تھا اور وہ دن دور نہ تھے جبکہ وہ عادل شاہی سلطنت کا جزو بن جائے[۱]۔ اب رہ گیا خاندیس سو اس کی اہمیت اس وقت سے بڑھنے لگتی ہے جب سے کہ دکنی ریاستوں کا مغلوں سے تعلق شروع ہوتا ہے۔ خاندیس کبھی کبھی دکنی ریاستوں کے معاملات میں دلچسپی لیتا تھا مگر نہایت احتیاط اور ہوشیاری کے ساتھ، کہ کہیں ان کے آئے دن کے فسادات اور جھگڑوں کی وجہ سے اسے نقصان نہ پہنچ جائے۔ پرتگیزی اپنے ساحلی مقبوضات کو برابر ترقی دے رہے تھے جس کا بدیہی ثبوت یہ ہے کہ علی عادل شاہ نے اپنے آخری زمانے میں گوا کو حاصل کرنے کی کوشش کی مگر ناکام رہا۔ اس طرح اس وقت دکن میں چھ سیاسی قوتیں تھیں مگر فی الحال چند ریاستوں سے ہم کو

---

[۱] فرشتہ ۱۰۲۹ء میں بیدر عادل شاہی مقبوضات میں داخل ہو گیا۔

براہ راست تعلق ہے وہ اول الذکر تین ریاستیں ہیں اور دراصل اس زمانے کی دکنی سیاسیات کا محور بھی یہی تھیں۔

یہ تو خالص دکنی سیاسی قوتوں کا ایک سرسری معائنہ تھا اس زمانے کی سیاسیات پر بحث کرتے ہوئے مغلوں کی بڑھتی ہوئی طاقت سے چشم پوشی نہیں کی جا سکتی۔ اس زمانے میں تخت دہلی پر اکبر اعظم جلوہ گر تھا اور اس کی قوت میں دن دونی رات چوگنی ترقی ہو رہی تھی مگر فی الحال اُسے اتنا موقع نہ تھا کہ شمال سے بے توجہی کر کے جنوب کی طرف رُخ کرتا مگر پھر بھی یہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ علی عادل شاہ کے آخری زمانے میں اکبر کی نگاہیں دکن پر پڑ رہی تھیں جس کا ثبوت یہ ہے کہ اس نے تفال خاں کے معاملے میں مرتضیٰ نظام شاہ کو ایک امتناعی حکم بھیجا تھا کہ وہ اپنی کارروائیوں کو روک دے گو اس کی ایک نہ سُنی گئی مگر اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ دکن کے معاملات مغلیہ حکومت کی توجہ کا مرکز بننا شروع ہو گئے تھے۔
اس کی مزید دلیل یہ ہے کہ دربار بیجاپور میں مغلیہ حکومت کی جانب سے علی عادل شاہ کے اسی آخری زمانے میں دو سفیر آئے ہوئے تھے۔ پہلے حکیم علی گیلانی اکبر کے نمایندے کی حیثیت سے بیجاپور آیا اور یہاں سے بہت کچھ تحفہ و تحائف کے ساتھ رخصت ہوا۔ دوسرا شخص جو بحیثیت سفیر کے یہاں آیا وہ حکیم عین الملک شیرازی ہے اور یہ شخص ابھی بیجاپور ہی میں تھا کہ علی عادل شاہ[1] قتل کر دیا گیا یہ واقعات صاف طور پر بتلا رہے ہیں کہ مغل اس وقت دکن سے بے خبر نہ تھے۔

اس طریقے سے ابراہیم عادل شاہ ثانی کی تخت نشینی کے وقت دکن کی خارجی فضا کچھ صاف نہ تھی اور اس وقت دکنی ریاستوں کے سامنے بہت کچھ اہم مسائل موجود تھے جن کی طرف فوری توجہ کی سخت ضرورت تھی مگر ان ریاستوں کی اندرونی حالتیں خود اس قدر ناگفتہ بہ ہو چکی تھیں کہ خارجی معاملات کو پس پشت ڈالنا لازمی ہو گیا تھا۔

---

[1] علی عادل شاہ کے قتل کے متعلق مختلف روایتیں ہیں جس میں خواجہ سراؤں والی روایت زیادہ مشہور اور عام ہے لیکن یہاں تفصیل کی ضرورت نہیں۔ ان تفصیلات کے لئے ملاحظہ ہو فرشتہ، تذکرۃ الملوک و بساتین السلاطین۔

ابراہیم ثانی کی تخت نشینی کے وقت ملک اندرونی حالت

پچھلی سطروں میں اس فضاء کو پیش کیا گیا جو ابراہیم کی تخت نشینی کے وقت بیجاپور کی سلطنت کو خارجی طور پر گھیری ہوئی تھی اب کچھ اندرونی ماحول کا بھی اندازہ کرلینا چاہیئے۔ بادشاہ کی کمسنی کی وجہ سے ملک میں علی عادل شاہ کے انتقال کے ساتھ ہی اختلافات پیدا ہو جاتے ہیں ۔اُمرا اور اعلیٰ عہدہ داروں کی کشمکش کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہوتا ہے حقیقت یہ ہے کہ اس نئے بادشاہ کی تخت نشینی ملک کو سخت پریشانیوں میں مبتلا کر دیتی ہے اس وجہ سے کہ اُمراء کی خود غرضیاں، ان کی نااتفاقیاں اور اُن کی باہمی رقابتیں بہت بڑھ گئی تھیں اور کسی کو اس کا احساس نہ تھا کہ ملک اور بادشاہ کے ساتھ ان پر کیا کیا ذمہ داریاں عائد ہیں ۔اگرچہ علی عادل شاہ نے مرتے وقت ایک نہایت وسیع، مضبوط اور مستحکم ریاست اپنے جانشین کے لئے چھوڑی تھی لیکن ان اُمراء کی خود غرضیوں کی وجہ سے یہ زبردست سلطنت ورطۂ تباہی میں گھر جاتی ہے۔ اُمراء نے ذاتی اغراض اور ذاتی مفاد کے لئے جو لڑائی جھگڑوں کی ابتداء کی تھی وہ اس قدر خطرناک صورت اختیار کرلی کہ قریب تھا کہ بیجاپور کی ریاست خود غرضیوں کا شکار ہو جائے مگر بعض حالات نے جن کا آئندہ تفصیلاً ذکر کیا جائیگا، بیجاپور کی سلطنت کو تباہی سے محفوظ رکھا۔ اس اندرونی خرابی کی وجہ سے بیرونی پریشانیوں میں بھی مبتلا ہونا پڑا یہ عجیب بات ہے کہ جس طرح بیرونی فضاء دکنی سلطنتوں کی مشترک تھی اسی طرح اندرونی ماحول بھی اس زمانے کی ریاستوں میں قریب قریب یکساں تھا جو حال بیجاپور کا ابراہیم کی کمسنی میں رہا تقریباً یہی حال احمد نگر کا مرتضٰی نظام شاہ کے انتقال کے بعد سے ہو گیا یہاں بھی اُمراء کا ضرورت سے زیادہ طاقتور ہو جانا اور پھر اُن کی خانہ جنگیوں کی وجہ سے ملک کو سخت نقصان پہنچا ان ریاستوں کی اندرونی خرابیوں کا خود اُن کے حق میں ایک مضر نتیجہ یہ ہوا کہ مغل اُن پر بآسانی چھا گئے ورنہ اگر یہ خرابی اس زمانے میں نہ پیدا ہوتی اور یہ ریاستیں آپس میں متحد رہتیں تو ممکن نہ تھا کہ مغل ایک انچ بھی اپنی فتوحات کے سلسلے میں دکن میں آگے بڑھ سکے۔"

یہ ایسی خرابی تھی جس کی وجہ سے دکنی ریاستوں نے بہت نقصان اُٹھایا۔ آئندہ صفحات میں

یہ چیز خود بخود واضح ہو جائے گی کہ اُمرا اور سرداروں کی ناموافقت اور عدم اتحاد نے ملک کو کس قدر شدید نقصان پہنچایا۔ ابراہیم کی کمسنی کا طویل زمانہ (تقریباً دس سال کا ہوتا ہے) بیجاپور کیلئے نہایت پُرآشوب ثابت ہوا۔ عادل شاہیہ خاندان کی اقبال مندی اور بعض بہی خواہان ریاست کی وفاداری، نمک حلالی اور حق شناسی سمجھنا چاہیئے کہ بیجاپور برباد ہوتے ہوتے رہ گیا۔ جب آخرکار "یہ طویل تولیت" کا دور ختم ہوا اور ابراہیم نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو پھر اُسی آب و تاب اور اُسی عزت و وقار کے ساتھ اُس نے بیجاپور پر حکومت کی جیسے کہ علی عادل شاہ یا اُس کے پہلے لایق اور بہتر بادشاہوں نے کی تھی اور دراصل اس وقت سے بیجاپور کی تاریخ کا ایک نیا باب شروع ہوتا ہے۔

ابراہیم کی تخت نشینی ابتدائی زندگی تعلیم و تربیت اور کیرکٹر

باب دوم

ابراہیم کی تخت نشینی علی عادل شاہ کا جب انتقال ہوا تو اس کا بھتیجا ابراہیم تخت نشین کیا گیا۔ علی عادل شاہ کے کوئی اولاد نہ تھی۔ اسی وجہ سے اُس نے اپنے بھائی طہماسپ کے بچوں کو اپنے بچوں کی طرح پالا تھا۔ اپنی زندگی ہی میں اس نے یہ ظاہر کر دیا تھا کہ اس کے بعد اس کا جانشین ابراہیم ہوگا چنانچہ ۹۸۷ھ میں ایک جشن[۱] کیا گیا اور ابراہیم ولیعہد مقرر کیا گیا اس کے دوسرے ہی سال ۹۸۸ھ میں علی عادل شاہ کا انتقال ہوگیا۔

علی عادل شاہ کے انتقال کے وقت ابراہیم کی عمر ۹ سال تھی۔ وارث تخت و تاج کی کمسنی ہمیشہ بغاوتوں کی محرک اور فسادات کا باعث ہوتی ہے اور ہر شخص ہمیشہ یہ چاہتا ہے کہ جہاں تک ہوسکے اس موقع سے فائدہ اٹھایا جائے۔ نئے نئے دعویدار سلطنت پیدا ہو جاتے ہیں اور اندیشہ رہتا ہے کہ کہیں ملک میں ایک فتنۂ عظیم نہ برپا ہوجائے۔ علی عادل شاہ کے بعد تقریباً یہی صورت حال تھی اگرچہ ابراہیم کو

۱۔ اس جشن کے متعلق فرشتہ یوں رقمطراز ہے "در ماہ شوال سنہ سبع و ثمانین و تسعمأۃ (۹۸۷) چونکہ آنحضرت را فرزند نہ بود برادر زادۂ خود شہزادہ ابراہیم بن طہماسپ را ولیعہد ساختہ با اُمراء و ارکان دولت گفت کہ بعد از من پادشاہ شما اینست"۔ اسی سال سُنت خلیل اللہ کے مطابق شہزادے کی ختنہ کی گئی اس خوشی میں ایک بڑا جشن ترتیب دیا گیا۔ اس سلسلے میں فرشتہ شہزادے کی اقبال مندی کے مطابق ایک قصہ بیان کرتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ شہزادے کا بڑی دھوم دھام سے جلوس نکالا گیا۔ آتشبازی کا بھی خوب انتظام تھا۔ سوئے اتفاق سے مجمع میں آگ لگ گئی۔ قریب ۷۰۰ سات سو نفوس نذر آتش ہوگئے مگر شہزادے کو جو اسی مجمع میں تھا کسی قسم کا نقصان نہ پہنچا اور وہ صحیح و سلامت بچکر نکل گیا۔ (فرشتہ مقالہ سوم، روضہ دوم)۔

ولیعہدی کے لئے نامزد کر دیا گیا تھا مگر پھر بھی شہزادے کا حقیقی بھائی اسمٰعیل موجود تھا جو ہر طریقے سے تخت و تاج کا اسی طرح حقدار تھا جیسے کہ خود ابراہیم۔ الا اس کے کہ ابراہیم کو پہلے ہی سے ولیعہد بنا دیئے جانیکا تفوق بھی حاصل تھا مگر "حیلہ جو را بہانہ بسیار" کے مصداق خود اس شہزادے کی موجودگی ہی بہت کافی تھی کہ فتنہ پرداز اور متمرد اشخاص اس کے حقوق کی حمایت کے حیلے سے ملک کے امن و امان میں خلل انداز ہوں۔ اس بدامنی و فتنہ و فساد کے روکنے کے لئے افضل خاں نے جو علی عادل شاہ کے آخری زمانے میں وکیل السلطنت کے عہدہ پر فائز تھا۔ بادشاہ کے انتقال کے ساتھ ہی اندر سے قلعے کے دروازے بند کرا دیئے اور کسی کو داخل ہونیکی اجازت نہ دی۔ افضل خاں چاہتا تھا کہ انتظامات ٹھیک کرنے سے پہلے علی عادل شاہ کی وفات کی خبر ملک میں نہ پھیلے مگر باوجود اس احتیاط کے تھوڑے ہی عرصے میں یہ خبر عام ہوگئی کہ بادشاہ کا انتقال ہو گیا ہے۔ اس خبر کے سنتے ہی تمام ملک میں ایک پریشانی پیدا ہوگئی اور صبح ہوتے ہوتے اکثر امراء و اعیان قلعے کے دروازے پر جمع ہوگئے و راسی تشویش میں تھے کہ دیکھئے کس کو بادشاہ بنایا جاتا ہے بالآخر ایک شخص کو اس جماعت کا سفیر بنا کر افضل خاں کے پاس روانہ کیا گیا کہ جانشینی کی نسبت جو تصفیہ کیا گیا ہے اس سے آگہی حاصل کر کے واپس آئے۔ جب افضل خاں سے استصواب رائے کیا گیا تو اس نے جواب دیا کہ جو تمام امراء اور ارکان دولت کی رائے ہو اسی پر عمل کیا جائیگا۔ اس پر امراء نے وہیں ایک مجلس مشاورت منعقد کی۔ شاہ کمال الدین فتح اللہ اور دیگر مدبران سلطنت کی یہ رائے ہوئی کہ علی عادل شاہ نے اپنی زندگی میں جو تصفیہ کیا ہے وہی بحال رکھا جائے۔ ابراہیم جو حقیقی وارث تخت و تاج ہے علی عادل شاہ کا جانشین قرار دیا جائے۔ میر مرتضیٰ خاں انجو کو افضل خاں کے پاس اس گذارش کے ساتھ روانہ کیا گیا کہ تمام اعیان و ارکان دولت نے یہ تصفیہ کیا ہے کہ جلد از جلد اس پر عمل کیا جائے۔ ساتھ ہی یہ بھی خواہش ظاہر کی گئی تھی کہ چونکہ ابراہیم کم عمر ہے اور معاملات سلطنت کے سنبھالنے کے لئے ایک متولی کی ضرورت ہے۔ افضل خاں جو پہلے سے ہی "وکیل السلطنت" کے ممتاز عہدے پر فائز ہے، بادشاہ کی کمسنی تک متولی یا نائب السلطنت کی نئی خدمت بھی انجام دے۔ افضل خاں نہایت دانا اور تجربہ کار آدمی تھا، وہ جانتا تھا کہ یہ بار گراں اپنے کندھوں پر اُٹھانا آسان نہیں۔ بادشاہ کمسن ہے، فتنہ و فساد برپا ہونیکا اندیشہ ہے اور

ان کا سدّباب کوئی آسان کام نہیں اس لئے اُس نے "متولیٔ حکومت" کا عہدہ قبول کرنے سے انکار کردیا لیکن فی الحال یہ رائے دی کہ "چار معتبر اشخاص کو قلعے کے اندر بلّا لیا جائے پھر اُن کے مشورے سے ابراہیم کو تخت نشین کردیا جائے گا" چنانچہ شاہ کمال الدین، فتح اللہ، مرتضیٰ خاں انجو، منجن خاں اور سیر کوچک کشور خاں (جو کامل خاں کا داماد تھا) قلعے میں داخل کر لئے گئے۔ آپس میں تھوڑی سی گفت و شنید کے بعد یہ طے پایا کہ نئے بادشاہ کی تخت نشینی جلد از جلد عمل میں آنی چاہیئے۔ اس کے بعد تخت نشینی کی کارروائی کو ابراہیم زبیری ان الفاظ میں بیان کرتا ہے' وہ لکھتا ہے کہ یہ لوگ "بر دروازہ حرم محترم رسیدند' ابراہیم عادل شاہ را از اندرون' بیرون آوردہ' بہ بالائے بُرج' بر مسند عزت و شوکت نشاندہ چتر سبز زرنگاری کہ لازمہ عادل شاہیہ بود' بر سرافراشتند۔ اعیان و ارکان درگاہ اول زمین بوس شدہ سلام وتہنیت بہ واختند و نذور از نظر گزرانیدند وبعد ازاں تمام خلائق از بروں سجدات شکر بجا آوردہ بازگشتند"[1]

ابراہیم کی تعلیم وتربیت وکیرکٹر | ابراہیم کی تخت نشینی سے پہلے کے حالات کا بہت کم پتہ چلتا ہے اسکے سن پیدائش اور ابتدائی تعلیم وتربیت کے متعلق تو تاریخ بالکل ساکت ہیں لیکن چونکہ جس وقت وہ تخت نشین ہوا ہے اس کی عمر تقریباً دس سال تھی[2] اور اس کا سن جلوس ۹۸۸ھ ہے۔ لہٰذا نہایت آسانی سے یہ اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ تقریباً ۹۷۸ھ میں وہ پیدا ہوا علی عادل شاہ ۹۶۵ھ مطابق ۱۵۵۷ء میں تخت نشین ہوا تھا۔ اپنی تخت نشینی کے بعد اُس نے اپنے بھائی طہماسپ کی آنکھیں نکلوادیں اور نظر بند کر دیا تھا اس سے پتہ چلتا ہے کہ ابراہیم اپنے باپ کی قید کے زمانے میں جبکہ اس کی آنکھیں بے نور ہوچکی تھیں' پیدا ہوا ہے لیکن جیسا کہ پہلے ذکر کیا جاچکا ہے علی عادل شاہ نے اولاد نہ ہونے کی وجہ سے اپنے مظلوم بھائی کے بچوں کو لیکر پال لیا تھا۔ ابراہیم چونکہ سب میں بڑا تھا اُسے اپنا ولیعہد اور جانشین بھی مقرر کردیا۔ اس غرض سے کہ وہ آئندہ بادشاہ ہونے والا ہے' اس کی تعلیم وتربیت کی طرف بھی خاص توجہ

---

[1] بساطین السلاطین۔

[2] فرشتہ جس وقت ابراہیم تخت نشین ہوا ہے وہ اپنی عمر کے نو(۹) سال ختم کرچکا تھا اور قریب قریب دس سال اسکی عمر تھی۔

گیگئی یوں تو اپنے دونوں بیٹوں کو علی عادل شاہ عزیز رکھتا تھا اور اُن کی تربیت اعلیٰ پیمانے پر ہو رہی تھی مگر بادشاہ کی توجہ خاص طور پر ابراہیم کی طرف مبذول رہتی تھی۔

ابراہیم بچپن سے ہی نہایت سنجیدہ، متین اور بُردبار واقع ہوا تھا۔ اس کی کم عمری میں اُسکی پیشانی سے آثار بزرگی و برتری ہویدا تھے۔ بساتین کے مصنف نے ابراہیم کی ان خصوصیات کا ان الفاظ میں تذکرہ کیا ہے "دراں ہنگام (بروقت تخت نشینی) مدارج عمرش از نہ سالگی تجاوز نہ کردہ بود، ہم دراں صغر سن بکمال تمکین و سنجیدگی و وحدت فہم انصاف داشت از ناصیۂ خورگی آثار بزرگی ہویدا بود"[1] اور فرشتہ[2] اس امر کی تصدیق کرتا ہے کہ اس نوعمری میں جبکہ عموماً بچوں کا دل کھیل کود میں لگا رہتا ہے، ابراہیم قطعاً ان وقت خراب کرنیوالی دلچسپیوں سے احتراز کرتا تھا۔ اس زمانے میں اس نے قرآن مجید کی تعلیم حاصل کی۔ وہ خوشنویسی کی مشق کیا کرتا تھا۔ اور اپنے زمانے کے مطابق اُس نے نہ صرف تحصیل علوم کی طرف ہی کوشش کی بلکہ فنون سپہ گری کا بہت اچھا ماہر ہو گیا۔ بالخصوص گھوڑے کی سواری، نیزہ بازی اور دیگر آلات حرب کے استعمال سے اُس نے خاصی اچھی واقفیت پیدا کر لی تھی۔ یہ دراصل اُس زمانے کے اصول تعلیم و تربیت کی خوبی تھی کہ سپاہیانہ فنون کو دائرہ تعلیم سے خارج نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اُس کی طرف زیادہ توجہ کی جاتی تھی اور ماہر فنون سپہ گری کو بڑی وقعت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ اس چیز کو ایسی ہر دلعزیزی اور ایسی عام مقبولیت حاصل تھی کہ صرف بادشاہوں اور والیان ریاست کے لئے ہی ان فنون کا حاصل کرنا ضروری اور لازمی نہیں سمجھا جاتا تھا بلکہ ہر کس و ناکس کے لئے اس قسم کی تعلیم ضروری خیال کی جاتی تھی اِسی وجہ سے اُس زمانے کا بچہ بچہ سپاہی ہوتا تھا۔ چونکہ اُس زمانے میں ہمسایہ قوتوں یا ریاستوں سے آئے دن لڑائی جھگڑے ہوا کرتے تھے اور میدان کارزار ہمیشہ گرم رہتا تھا لہذا یہ ایک قومی ضرورت ہو گئی تھی کہ ہر شخص آلات حرب کے استعمال سے

---

[1] بساتین السلاطین صفحہ ۱۹۴۔

[2] فرشتہ مقالہ سوم صفحہ ۴۔

واقف رہے تاکہ وقت پڑے تو اپنی اور اپنی قوم و ملک کی محافظت و بقا کے لئے وہ اپنے دشمنوں کا اچھی طرح مقابلہ کر سکے۔ اسی وجہ سے بلالحاظ پیشہ و طبقہ ہر شخص ان مردانہ فنون سے کچھ نہ کچھ واقفیت ضرور رکھتا تھا جب فنون سپہ گری کی مقبولیت کا یہ عالم ہو اور ملک میں جب اس کو اتنی اہمیت دی جاتی ہو تو ظاہر ہے کہ بادشاہ جو پورے ملک کا نگہبان اور محافظ سمجھا جاتا تھا بھلا اُن سے کیسے اغماض برت سکتا اُس پر تو اپنے اعلیٰ منصب کی عظمت و شوکت کے اعتبار سے ان فنون میں کامل مہارت رکھنا ضروری تھا یہی وجہ ہے کہ اُس زمانے میں شہزادوں اور وارثانِ تخت و تاج کی تعلیم و تربیت کے سلسلے میں اس کا خاص طور پر لحاظ رکھا جاتا تھا کہ اُن میں بہادری اور مردانگی کے جوہر پیدا ہوں اور وہ سپاہیانہ فنون سے کامل طور پر واقف رہیں۔ بلکہ یہاں تک کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانے کا معیار یہ تھا کہ بادشاہ کی پہلی ضرورت فنونِ سپہ گری سے واقفیت سمجھی جاتی تھی۔ اور بعد میں کتابی علوم کی تحصیل کا خیال کیا جاتا تھا۔ غرض ابراہیم کو بھی اس زمانے کے معیار کے مطابق تعلیم دی گئی اور جہاں وہ ایک طرف علمی قابلیتیں حاصل کر رہا تھا اس کے ساتھ ہی دوسری طرف وہ ایک بہادر سپاہی اور واقف رموز حرب بھی ہو رہا تھا مگر ابھی یہ تعلیم ختم نہ ہونے پائی تھی اور وہ اس کے ابتدائی منازل ہی طے کر رہا تھا کہ اسکے سرپرست اور چچا علی عادل شاہ کا انتقال ہو گیا۔ گو تخت نشینی کے بعد بھی کم عمری کا لحاظ کرتے ہوئے یہ تعلیم و تربیت کا سلسلہ چاند بی بی اور مختلف متولیانِ ریاست کے زیر نگرانی جاری رہا مگر وقتاً فوقتاً ان مختارانِ سلطنت کی باہمی کشمکش اور فسادات کی بنا پر بادشاہ کے سلسلہ تعلیم و تربیت میں بہت حرج ہوا مگر خود یہ بغاوتیں اور فسادات جو اس کی نوعمری میں اُسے گھیرے ہوئے تھے قدرتی تعلیم سے کچھ کم نہ تھے۔ ابراہیم ان سے بہت کچھ سبق لے سکتا تھا اگر یہ سچ ہے کہ نامساعد حالات انسان کو بھی اور بہترین تربیت دیتے ہیں۔

علی عادل شاہ کے قبل از وقت مرجانے سے ابراہیم کی تربیت کا بار چاند بی بی پر پڑا یہ فریس اور دانشمند عورت ہر طریقے سے اس کام کے لئے موزوں تھی اور حقیقت یہ ہے کہ اگر چاند بی بی اس وقت بیجاپور میں معاملات سلطنت کے سنبھالنے کے لئے موجود نہ ہوتی تو شاید ابراہیم کو حقیقی معنی میں

بادشاہ ہونا نصیب بھی ہوتا کیونکہ ہر وہ شخص جو مختار[۱] یا متولی مقرر کیا جاتا، بادشاہ کی کمسنی سے فائدہ اٹھاکر اور اپنی قوت و اقتدار کے نشہ میں بیخود ہوکر یہ چاہتا تھا کہ اگر ممکن ہو تو اصل خاندان کو ایک طرف کرکے خود ہی سلطنت کا مالک بن جائے۔ بیجاپور کی تاریخ میں خصوصاً ایسی مثالیں بہت ملتی ہیں کہ سلطنت کی ڈوبتی ناؤ کو عین وقت پر عورتوں نے بچالیا چنانچہ جب یوسف عادل شاہ کا انتقال ہوا اور اس کا جانشین اسمٰعیل کم عمری میں تخت نشیں ہوا تو کمال خاں[۲] نے نمکحرامی پر کمر باندھی تھی مگر بوبوجی خانم[۳] کے حسن تدبیر، شجاعت اور دلیری اور دل شاد آغا[۴] کی ہمت مردانہ نے اس کے ان تمام منصوبوں پر پانی پھیر دیا۔ اسی طریقے سے اب جبکہ ابراہیم چھوٹا تھا، متولیان ریاست یکے بعد دیگرے سلطنت پر غاصبانہ نگاہیں ڈالنے لگے تھے مگر یہ ابراہیم کی خوش قسمتی اور عادل شاہی خاندان کی اقبال مندی تھی کہ اس وقت چاندبی بی جیسی عورت موجود تھی جو ابراہیم کے حقوق کی مردانہ وار حفاظت کرتی رہی۔ اور ان سرکش اور متمرد وزیران سلطنت کی باغیانہ اور غاصبانہ کوششوں کو پھلنے پھولنے نہ دیا۔ غرض ابراہیم ایک دانائے روزگار عورت کے سایۂ عاطفت میں پرورش پاتا رہا اور تربیت حاصل کرتا رہا۔

تخت نشیں ہونے کے بعد یہ معمول تھا کہ سوائے چہارشنبہ اور جمعہ کے باقی ایام میں یہ کمسن بادشاہ دربار کرتا اور تخت شاہی پر جلوہ افروز ہوتا تھا۔ تمام اُمرائے دولت اور اعیان سلطنت سلام کے لئے حاضر ہوتے، اور بادشاہ کی موجودگی میں تمام کاروبار سلطنت انجام پاتے تھے۔ اس طریقے سے

۱۔ ابراہیم کے عہد کے متولیان ریاست کی مفسدانہ اور غاصبانہ کارروائیوں کی تفصیل آئندہ صفحات میں آئیگی۔

۲۔ کمال خاں اسمٰعیل عادل شاہ کے ابتدائی عہد میں متولی ریاست رہا مگر نمکحرامی کرکے چاہتا تھا کہ تخت خود غضب کرلے۔

۳۔ بوبوجی خانم یوسف عادل شاہ کی بیوی اور اسمٰعیل کی ماں تھی یہ عورت مرہٹہ نسل سے تعلق رکھتی تھی (فرشتہ)

۴۔ دل شاد آغا غضنفر بیگ کی بہن تھی۔ یوسف عادل شاہ غضنفر بیگ کو بہت چاہتا تھا اور اپنا بھائی کہتا تھا۔ اس اعتبار سے اُس کی بہن بھی محل میں رسوخ رکھتی تھی غضنفر بیگ ایک جاں نثار اور بہادر جنرل تھا۔

گویا اس کو امور سلطنت سے واقف کرایا جاتا اور معاملات ملکی کی انجام دہی کے اصول سے آگہی بخشی جاتی تھی تاکہ جب وہ سن بلوغ کو پہنچکر عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لے تو منصب شاہی کے تمام فرائض سے کما حقہٗ واقف اور آگاہ رہے۔اسی زمانے سے ابراہیم میں اسقدر فرض شناسی کا مادہ پیدا ہوگیا تھا کہ جب کسی نے ایک روز معمول سے زیادہ دیر ہو جانے پر بادشاہ سے کہا "امروز از نشست چنیں دیر (شدہ است) البتہ بہ ذات عالی کوفت و ماندگی رسیدہ باشد۔اکنوں باستراحت میل فرمائید۔ بزبان گوہر نشاں فرمودند کہ مہمی الحال بما حوالہ شد آسانی واستراحت راگنجائش ندارد"[له]

اس جواب سے اس کی مستعدی اور فرض شناسی کا اچھا اندازہ ہوتا ہے۔اس نو عمری کے دو ایک نہایت دلچسپ واقعات ہیں جن سے اسکی طبیعت کی متانت، سنجیدگی اور بُردباری کا اظہار ہوتا ہے۔کشور خاں کے اقتدار کا زمانہ تھا اور وہ ایسی حکومت کر رہا تھا جیسا کہ وہ خود بادشاہ ہے اتفاقاً ابراہیم کی والدہ کو کچھ جواہر کی ضرورت ہوئی کشور خاں نے ہیرے اور جواہر بھیجے تو سہی لیکن وہ ادنیٰ درجے کے تھے۔اس پر بڑی بی صاحبہ (والدۂ ابراہیم) بہت بگڑیں اور اُن کی شاہانہ طبیعت کو یہ بہت ناگوار گذرا کہ ایک متولی ریاست بادشاہِ وقت کی والدہ کے لئے جو تحفہ بھیجے وہ اس قدر معمولی اور ادنیٰ درجے کا ہو۔اس نے ذرا بھی شاہی ادب ملحوظ نہ رکھا۔اُن کے نزدیک اس کی اس حرکت سے شاہی خاندان کی تحقیر و تذلیل ہوتی تھی۔شدہ، شدہ ابراہیم کو اپنی والدہ کی رنجش کا حال معلوم ہوا اس نے جس نازک پیرایہ میں اپنی ماں کی تسلی و دلجوئی کی ہے اس کا حسب ذیل الفاظ سے بخوبی اندازہ ہوتا ہے "سلطاں بہ خدمت والدۂ خویش عرض پرداخت کہ قبلہ گاہا اگر سلطنت از ماست، ہر چہ است از ماست و اگر غیر از خواہد بود ایں راہم بما کہ خواہد گذاشت چہ الفاظ شریف آندہ میلادیہ[له]" واقعی یہ گفتگو ایک دس سالہ لڑکے کی زبانی حیرت انگیز ہے جس سے اس کی انتہائی دانشمندی کا

له۔ بساتین السلاطین۔

اظہار ہوتا ہے۔ متانت کا یہ عالم تھا کہ بہت کم گفتگو کرتا تھا اور جب اس کی کم سخنی کے متعلق ایک بار استفسار کیا گیا تو جواب دیا کہ بادشاہوں کا وقار اور اُن کی عظمت وشوکت کو قائم رکھنے کے لیئے یہ ضروری ہے کہ وہ متانت وسنجیدگی اختیار کریں[1]۔ غرض ان واقعات سے اس کی طبیعت کی خصوصیات پر بہت کچھ روشنی پڑتی ہے۔ یہ واقعات خود اپنی جگہ کچھ ایسے زیادہ اہم نہیں لیکن اُن کی اہمیت اس وجہ سے بڑھ جاتی ہے کہ ایک دس سالہ لڑکا ان متین وسنجیدہ خیالات کا حامل ہے جو شاید اُس سے کہیں زیادہ بڑی عمر والے لوگوں میں نہیں پائے جاتے۔

ابراہیم کی تعلیم وتربیت اور اس کے کیرکٹر پر بحث کرتے ہوئے دو ایک چیزوں کو خاص طور پر ملحوظ رکھنا چاہیئے۔ سب سے پہلے تو یہ کہ وہ بہت کمسنی میں تخت نشین ہوا۔ برابر دس سال تک سلطنت کے کاروبار مختلف متولیان ریاست کے زیر نگرانی چلتے رہے۔ اس دس سالہ دور میں بادشاہ کمسن ہونے کے اعتبار سے بالکل پس پشت ہو جاتا ہے۔ معاملات سلطنت میں اس کا ذرا دخل نہیں، اس کے اختیارات اور اس کے اثرات بالکل صفر۔ پوری دہ سالہ تاریخ محض بیرونی حملوں اور اندرونی کشمکشوں سے پُر نظر آتی ہے۔ متولیان ریاست کی آپس کی رقابتیں، دشمنیاں اور اُن کی خود غرضیاں ریاست بیجاپور کو ایک زبردست الجھن میں ڈالدیتی ہیں جس کا نتیجہ یہ ہے کہ تاریخوں میں اس کمسن بادشاہ سے متعلق واقعات کا پتہ بڑی مشکل سے کہیں کہیں ملتا ہے اور جو کچھ واقعات ملتے ہیں وہ متولیان ریاست کی کارگذاریاں، اُن کا عروج وزوال، اُن کی آپس کی کشمکش، اُن کی خانہ جنگیاں اور کچھ بیرونی حملے ہیں۔ بادشاہ اس کی تعلیم وتربیت، اس کا کردار، اس کے مشاغل، اس کی دلچسپیاں، اس کی سیاسی حیثیت اور مختلف متولیوں سے اس کے تعلقات پر بہت کم روشنی پڑتی ہے۔ اگر کہیں بادشاہ تھوڑا بہت منظر عام پر آتا ہے تو وہ دلاور خاں کی تولیت کا آخری زمانہ ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہم ٹھیک طور پر اندازہ نہیں

[1] بساتین السلاطین۔

کر سکیں کہ اس طویل دور میں ابراہیم کیا کرتا رہا اور اس کی تعلیم و تربیت کیسے ہوئی اور وہ اپنے گرد و پیش کے حالات سے کیسے متاثر ہو رہا تھا۔ یوں تو تھوڑے بہت حالات ملتے ہیں مگر وہ بھی جستہ جستہ۔ تفصیلاً اس موضوع پر کہیں مواد نہیں ملتا کیونکہ مورخ کی نگاہ تمام تر متولیان ریاست کی کارگذاریوں اور اُن کے حالات پر رہتی ہے اور وہ اس دور میں بادشاہ کو بالکل پس پشت کر دیتا ہے۔[1] جب صورت حال یہ ہو تو مجبوراً اس کی تعلیم و تربیت اور اس کے کردار کا اندازہ لگانے کے لئے سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ بادشاہ نے زمام حکومت اپنے ہاتھ میں لینے کے بعد خود کو جس قسم کا انسان ثابت کیا اور اپنا جو بنا بنایا کیرکٹر لیکر وہ تخت شاہی پر جلوہ فگن ہوا اسی کی مدد سے اس کی اس دس سالہ زندگی اور کردار پر روشنی ڈالی جائے کیونکہ یہ تو مسلمہ ہے کہ خواہ یہ دس سالہ دور ملک اور بادشاہ کے لئے بحیثیت مجموعی مفید ثابت ہوا ہو یا مُضر، بہرحال ابراہیم کے کیرکٹر کی تشکیل کا دور ہے۔ جو کچھ بھی ابراہیم حقیقی معنی میں بادشاہ ہونے کے بعد رہا اور جیسا کچھ بھی اس نے خود کو ثابت کیا ہے وہ اسی دس سالہ دور کے اثرات اور واقعات کا نتیجہ ہے کیونکہ اس کے صحیح مذاق کا نشو و نما اس کے کیرکٹر کا ارتقا اس کی طبیعت کے رجحانات و میلانات کی تشکیل وہ سب کچھ اُسی دور کے ممنونِ احسان ہیں اور ہونے چاہئیں۔

ان تمہیدی سطور کے بعد پھر ہم ابراہیم کے کیرکٹر کے تدریجی ارتقا کی طرف توجہ کرتے ہیں اور اس سلسلے میں اُن واقعات سے بھی مدد لیجائے گی جو اس دس سالہ دور سے باہر ہیں اور جو ابراہیم کی حقیقی بادشاہت کے کارنامے ہیں۔

کامل خاں، کشور خاں اور اخلاص خاں کے زمانہ ہائے حکومت کچھ ایسے زیادہ نہیں دو سال

---

[1] ملاحظہ ہو معصر تاریخیں شلاً تاریخ فرشتہ، تحفۃ الملوک، بادشاہ کے حالات اور اسکے اوصاف اسکے کیرکٹر اور اسکے مشاغل کے متعلق اس وقت سے تفصیل دیجانے لگتی ہے جبکہ متولیوں کا دور دورہ ختم ہو جاتا ہے اور بادشاہ بہ نفس نفیس مہمات ملکی انجام دینے لگتا ہے بچپن کے حالات بہت کم کھلتے ہیں۔

گذر جاتے ہیں۔ اس مختصر سے عرصے میں یہ تین متو لیان ریاست یکے بعد دیگرے حاوی ہوتے گئے اور اپنی اپنی ڈھائی دن کی بادشاہت منا کر عملی سیاسیات کے منظر عام سے غائب ہو گئے۔ اس کے بعد دلاور خاں کی حکومت کا زمانہ آتا ہے اس نے کامل آٹھ سال بیجاپور پر حکمرانی کی۔ اس کے دور میں بادشاہ کی تعلیم و تربیت کی طرف خاص طور پر[1] توجہ کی گئی۔ چونکہ دلاور خاں خود ایک عالم و فاضل آدمی تھا اس لئے اس کی توجہ اس طرف خاص طور پر مبذول رہی۔ اس نے نہ صرف بادشاہ کے تحصیل علم کا سامان کیا بلکہ مردانہ فنون اور کھیل کود کی طرف بھی ابراہیم کو راغب رکھا جو جسمانی حالت کو درست رکھنے کے لئے ضروری ہیں۔ اس نے اپنے دو بیٹوں کو بادشاہ کے اُستاد اور اتالیق مقرر کیا۔ ایک قرآن مجید اور دیگر عربی و فارسی کتابوں کی تعلیم دیتا تھا۔ دوسرا بادشاہ کے کھیل کود کے سامان کی فراہمی کا انتظام کرتا تھا اور چوگان بازی میں خود بادشاہ کا شریک رہتا۔ ان واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ دلاور خاں کے عہد میں بادشاہ کی دماغی اور جسمانی نشوونما کا خاص لحاظ رکھا گیا اگرچہ مزید معلومات اس سلسلے میں ہم نہیں پہنچتے لیکن یہ اندازہ لگانا غلط نہ ہوگا کہ اس دور میں بادشاہ کی تربیت کی طرف اچھی توجہ کی گئی۔ اگرچہ یہ آٹھ سالہ دور اندرونی و بیرونی پریشانیوں سے پاک صاف نہ رہا لیکن پھر بھی دلاور خاں نے اپنی اُس ذمہ داری سے چشم پوشی نہ کی جو بادشاہ کی تعلیم و تربیت سے متعلق اس پر عائد تھی۔ ان توجہات کا نتیجہ یہ ہوا کہ ابراہیم میں ایک لطیف، سنجیدہ اور اعلیٰ مذاق پیدا ہو گیا تھا جبکہ بہ نفس نفیس اس نے مہمات ملکی کی انجام دہی کی طرف توجہ کی۔

ابراہیم کو فنون لطیفہ سے خاص دلچسپی تھی اور ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لطیف فنون کے واسطے وہ ایک نہایت ہی موزوں اور نازک طبیعت قدرت کی طرف سے لیکر آیا تھا فنون لطیفہ میں بالخصوص اس کو موسیقی سے بہت لگاؤ تھا۔ مختلف تواریخ سے واضح ہے کہ

---

[1] دلاور خاں کے کارناموں کا جہاں ذکر آئیگا اس پر کچھ مزید روشنی ڈالی جائیگی۔

وہ اس فن میں اپنے زمانے کا اُستاد تھا اور اکثر باکمال لوگ اس کے آگے زانوئے ادب تہہ کرنے کو باعث فخر و مباہات سمجھتے تھے اس کو موسیقی پر اتنا زبردست عبور حاصل تھا کہ اس نے ایک کتاب جو "نورس"[1] کے نام سے موسوم ہے خاص اس فن پر تصنیف کی ہے اور اس کتاب پر مشہور شاعر ظہوری نے اپنا وہ مشہور دیباچہ لکھا ہے جو آج فارسی نثر کا ایک بہترین شاہکار تصور کیا جاتا ہے۔ بادشاہ چونکہ اس فن کا والہ و شیدا تھا اس کے دور میں موسیقی کو بڑی ترقی حاصل ہوئی اور ملک میں تین باقاعدہ موسیقی داں طبقے پیدا ہو گئے (۱) حضوری (۲) درباری (۳) شہری۔ حضوری وہ لوگ تھے جن کو خاص بادشاہ سے شرف تلمذ حاصل رہا ہو۔ درباری حضوریوں سے اکتساب کرتے تھے۔ اس دوسرے طبقے کا فرض تھا۔ (طبقۂ درباری کا) کہ عامۂ خلائق میں اس فن کو ہر دلعزیز بنائے۔ اور جو بھی اس فن کے مشتاق و قدرداں ہوں اُن کو اس لطیف فن کی تعلیم دیں (لیکن یہ واضح رہے کہ اس میں جبر کا پہلو قطعاً نہیں تھا اور نہ ہو سکتا تھا) بادشاہ نے بڑی فیاضی کے ساتھ علم موسیقی کی سرپرستی کی۔ ہر اہل کمال اور اہل فن کو سرکاری طور پر مالی امداد ملا کرتی تھی اور باقاعدہ تنخواہیں بھی مقرر تھیں۔[2]

یہ تو پہلے ہی بتلا دیا گیا ہے کہ بادشاہ اس فن کا زبردست ماہر تھا بیان کیا جاتا ہے کہ وہ فطرتاً نہایت خوش گلو اور خوش آواز تھا۔ اس خداداد آواز کے ساتھ اس کی محنت اور اس کے شوق نے اس کی موسیقی کی خوبیوں کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ غرض وہ فن موسیقی کا والہ و شیدا، اس کا ماہر اور اس کا زبردست سرپرست تھا اور خوب دل کھول کر اس نے اس فن لطیف کی سرپرستی کی۔

تو لیّت کے دور میں کہیں یہ ذکر نہیں آتا کہ بادشاہ کو اس فن کے سکھانے کا کوئی

---

[1] "نورس" ایک نایاب کتاب ہے جو ابراہیم سے منسوب کیجاتی ہے۔ "بساتین"

[2] "بساتین السلاطین"۔

خاص انتظام کیا گیا تھا لیکن چونکہ ابراہیم کے زمام حکومت ہاتھ میں لینے کے بعد اس کی راگ کی دلچسپیوں اور اس کے موسیقی کے مشاغل کا ذکر آتا ہے اس لئے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اس زمانے سے ہی وہ اس فن کا اکتساب کر رہا تھا اور کوئی تعجب نہیں کہ متولیان ریاست نے بادشاہ کو لہو و لعب میں مبتلا کر کے خود ہمیشہ حکومت پر قابض رہنے کی غرض سے ابراہیم کو ناچ، گانے کی طرف متوجہ کر دیا ہو مگر بہرحال اس کا کوئی تاریخی ثبوت موجود نہیں کہ یہ دلچسپی متولیوں کی پیدا کردہ ہے لیکن یہ بھی صاف و صریح ہے کہ اسی زمانے سے ابراہیم اس فن کا اکتساب کر رہا تھا خواہ متولیان ریاست نے اس فن کو حاصل . . . . . کرنے کی ترغیب دی ہو یا اس کو اس سے باز رکھنے کی کوشش کی ہو۔ اس لئے کہ یہ چیزیں ابتدا ہی سے حاصل کیجاتی ہیں۔ جب آوازپختہ ہو جائے تو اس میں کمال پیدا نہیں کیا جا سکتا۔ علاوہ موسیقی کے خطاطی، مصوری اور نقاشی میں بھی بادشاہ کو کامل مہارت حاصل تھی۔ اس کی خوشنویسی کے متعلق "بساتین" کے یہ الفاظ ہیں" اگرچہ درآں زمان خوشنویسان اقالیم جمع آمدہ بودند۔ ولے بادشاہ، بادشاہ قلمہا بود۔ ثلث و نسخ و نستعلیق را بہ آں درجہ حسن و متانت رسانیدہ بود کہ برخطوط خوش قلمان عصر قلم نسخ کشیدہ"۔[1]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہ کیسا خوشنویس واقع ہوا تھا۔ اس کے ان فنون لطیفہ کی قابلیتوں سے جن کا اوپر ذکر کیا گیا ہے اس کی نقاشی و مصوری کے کمال کا بھی کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ ان فنونِ لطیفہ کی (جس کا خود وہ ایک زبردست ماہر تھا) اس نے خوب ہی فیاضی کے ساتھ سرپرستی کی مگر یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اس کی فیاضیاں اور سرپرستیاں محض رنگیلے پن کی حد تک ہی تھیں بلکہ وہ دیگر علوم و فنون کا بھی بڑا سرپرست تھا چنانچہ اس کا دربار علماء و فضلاء و دیگر باکمال لوگوں کے وجود سے خالی نہ تھا۔ یہاں پر ان تمام کی تفصیلات دینا نہ تو ممکن ہے

---

[1] بساتین السلاطین۔

اور نہ ضروری (کیونکہ اس باب میں ابراہیم کی قابلیتوں اور اس کے کیرکٹر سے بحث کیگئی ہے۔ سرسری طور پر اس کی علمی سرپرستی کا ذکر کیا گیا ہے)، صرف چند قابل قدر ہستیوں کے نام گنوانے پر اکتفا کیا جاتا ہے۔ مولانا ملک قمی، ملا ظہوری، رفیع الدین شیرازی، محمد قاسم فرشتہ اور شاہنواز خاں جیسے باکمال لوگ اس کے دربار میں موجود تھے۔ انھوں نے اس بادشاہ کی سرپرستی میں اپنی علمی، ادبی، تاریخی اور فنی خدمات سے ملک کو سیراب کیا۔ ظہوری[1] جیسا کچھ بھی شاعر تھا اور شعراء میں جو کچھ بھی حیثیت اس کو حاصل ہے محتاج بیان نہیں۔ ملک قمی کا بھی شاعری میں کوئی معمولی درجہ نہیں۔ محمد قاسم فرشتہ اور رفیع الدین شیرازی اس زمانے کے زبردست مورخ ہیں اور انھوں نے جو کچھ بھی تاریخی خدمات انجام دی ہیں، وہ ہر حیثیت سے قابل قدر ہیں۔ شاہنواز خاں اس عہد کا ایک وزیر باتدبیر تھا۔ علاوہ اپنی مدبرانہ قابلیتوں کے وہ علوم وفنون کا بڑا مربی تھا چنانچہ محمد قاسم فرشتہ نے اپنی تاریخ کی تصنیف و تدوین میں اپنی اس ممنونیت کا اظہار کیا تھا جو اس کو اس شخص سے تھی۔ مزید یہ کہ اس کو تعمیر کاری سے خاص لگاؤ تھا چنانچہ ابراہیم کے عہد میں نورسپور جو بسایا گیا اور جو حویلیاں اور بڑے بڑے مکانات بنائے گئے وہ اسی شخص کی دماغی کاوشوں کا نتیجہ تھے[2]۔ ان نامور قابل اور فاضل لوگوں کی اسکے دربار میں موجودگی اس بات کو ثابت کرتی ہے کہ وہ علم کا بڑا قدرداں تھا اور اس کی فیاضی نے دور دور کے علماء و فضلاء کو اس کے دربار میں جمع کر رکھا تھا۔ یہ لوگ اپنی خاموش اور بیش بہا خدمتوں سے بیجاپور کو علمی دولت سے مالا مال کر رہے تھے۔

---

[1] ظہوری نے اپنی کلیات میں ابراہیم عادل شاہ کی تعریف کے پل باندھے ہیں۔ جگہ جگہ پر اسکے دیوان میں اس بادشاہ کی مدح سرائی کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو (کلیات ظہوری)۔

[2] شاہنواز خاں ابراہیم ثانی کا باتدبیر وزیر تھا۔ نورسپور کی تعمیر اسی کے ہاتھوں پر ہوئی تھی۔ اس نے اپنا مکان اس انداز اور اس طرز کا بنایا تھا کہ لوگ دیکھ کر عش عش کرتے تھے جس سے اسکی تعمیر کاری کی قابلیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ ملاحظہ ہو بساتین السلاطین۔

یہاں ان لایق اور فاضل ہستیوں کا ذکر اس لئے کیا گیا کہ خود اُن کی موجودگی اس کے کیرکٹر پر ایک نہایت ہی اچھی روشنی ڈالتی ہے۔ وہ یہ کہ ان لوگوں کی سرپرستی سے اس نے بیجاپور کی بالواسطہ بڑی زبردست خدمت انجام دی، اُن کی سرپرستی کرنے کے معنیٰ یہ تھے کہ ملک میں علوم و فنون کی روشنی کو عام کیا جائے اور یہ فخر کچھ کم نہیں کہ ملک میں کوئی بادشاہ علم و فن کو یوں پھلنے پھولنے کا موقع دے اس سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ علمی معاملات میں نہایت سنجیدہ اور اعلیٰ مذاق رکھتا تھا جو لوگ اس کے دربار میں تھے وہ یقیناً منتخب اور دنیائے علم و ادب کا ان کو عطر سمجھنا چاہیئے۔

متولیانِ ریاست

باب سوم
کامل خاں دکنی

کامل خاں دکنی | اس سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ جب اُمرائے دولت نے افضل خاں کو بادشاہ کی کمسنی تک متولی بنانا چاہا تو اُس نے صاف انکار کر دیا۔ کیونکہ اس کو یقین تھا کہ بادشاہ کی کم عمری کی وجہ سے ملک میں بیسیوں فتنہ و فساد اُٹھ کھڑے ہوں گے اور اُن سب کا تدارک اور سد باب کوئی آسان کام نہیں۔ ان وجوہات کی بناء پر اُس نے مناسب سمجھا کہ معاملات ہی سے کنارہ کش ہو جائے۔ جب افضل خاں نے اس طرح انکار کر دیا تو اس امر کی ضرورت ہوئی کہ کسی دوسرے معتبر اور سر برآوردہ شخص کو متولیٔ سلطنت مقرر کیا جائے لہٰذا سب کی نظریں کامل خاں کی طرف اُٹھنے لگیں۔ اسوقت کامل خاں ملک میں ایک نہایت ممتاز حیثیت رکھتا تھا۔ یہ وہی شخص ہے جس نے علی عادل شاہ کو تخت نشیں ہونے میں بڑی مدد دی تھی۔ جب شہزادہ علی اپنے باپ کے حکم سے قلعہ مرچ میں بعض شبہات[۱] کی بناء پر قید کر دیا گیا تو سکندر خاں قلعدار اور اس کے داماد کامل خاں دکنی کے (جو خفیہ طور پر شیعہ مذہب سے تعلق رکھتے تھے) حُسنِ سلوک نے شہزادے کا دل موہ لیا اور وہ ان دونوں کے اچھے برتاؤ سے بہت خوش رہا حتیٰ کہ جب ابراہیم قریب مرگ ہو گیا تو انھیں کی کوششوں سے

---

[۱] ابراہیم (اول) سنی تھا مگر علی عادل شاہ بچپن ہی سے شیعیت کی طرف مائل تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ ایک روز بادشاہ ایک مجلس میں یہ کہہ رہا تھا کہ خدا نے مجھے نیک توفیق عطا کی اور میں نے اپنے باپ دادا کا مذہب ترک کیا اور حنفی مذہب اختیار کر لیا۔" اتفاق سے شہزادہ علی بھی حاضرین میں تھا نہایت شوخی اور بیباکی سے جواب دیا کہ "اگر از طریقہ پدر و جد گذشتن روش محمود و طریق پسندیدہ است فرور شد کہ فرزندان آنحضرت چنیں کنند۔" بادشاہ برہم ہوا اور پوچھا "تو چہ مذہب داری" جواب ملا "اکنوں مذہب بادشاہ دارم بعد ازیں خدائے سبحانہ وتعالیٰ عالم است۔" فرشتہ ص ۳۴ مقالہ سوم روضہ دوم ص ۷۲ بساتین السلاطین

امراء و اعیان دولت رفتہ رفتہ علی کے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے لگے۔ ان تمام کارروائیوں اور کوششوں میں کامل خاں پیش پیش تھا جو اس وقت محض ایک تھانہ دار کی حیثیت رکھتا تھا مگر چونکہ سکندر خاں قلعدار مرج کا داماد تھا اسکے اثرات اور اسکی حیثیت کم نہ تھی، جب ان وفاداروں کی کوششوں سے علی عادل شاہ اپنے باپ ابراہیم کے انتقال پر خود بادشاہ ہو گیا تو وہ اپنے ان آڑے وقت کے ساتھیوں کو بھولا نہیں بلکہ انکے ساتھ نہایت اچھا سلوک کیا۔ اس سلسلے میں کامل خاں دکنی کو زمرۂ امراء میں داخل کر لیا گیا اور مناصب و جاگیر[1] عطا ہوئے۔

لہ۔ قلعہ کلمھ، اس کو جاگیر میں دیا گیا تھا (بساتین ص ۱۴۳) اسی سلسلے میں مصنف بساتین السلاطین نے بحوالۂ رفیع الدین شیرازی ایک واقعہ لکھا ہے جس سے ایک طرف کامل خاں کے کیرکٹر پر روشنی پڑتی ہے تو دوسری طرف علی عادل شاہ کے قتل کے متعلق جو روایتوں میں اختلاف ہے اسکا بھی اندازہ ہوتا ہے۔ وہ واقعہ حسبہٖ پیش کیا جاتا ہے:

"رفیع الدین شیرازی می گوید مشہور چنیں شد کہ قتل علی عادل شاہ بہ اشارۂ کامل خاں بود و سبب آں چنیں بود کہ چوں کامل خاں بر منصب کار ملکی قرار گرفت تجمّل و تکبّر بسیار بہم رسانید خود رائی را بیشتر کار فرمود سیدی بود از ساکنان قلعہ کلمھ کہ بہ جاگیر کامل خاں مقرر گشتہ، متعلقانش بنا بر عرض خود آں سید را مصادرہ کردہ در پا زنجیر کشیدہ در حبس داشتند شکایت ایں ظلم مکرر بہ سمع عادل شاہ رسیدہ بود۔ عادل شاہ چہار نوبت بہ کامل خاں فرمود کہ ایذائے سادات جائز نیست او را بگذارید۔ بہ سمع قبول نیاوردہ بر امر سلطانی عمل نکردہ و بہ تعلل گذرانید۔ تا عادل شاہ روزے بجائے می رفت و کامل خاں نیز ہمراہ بود۔ ناگاہ پدر پیر آں سید محبوس آنجا خود را رسانیدہ فریاد بر آورد کہ عالم پناہا کامل خاں ستم عظیم برپا کردہ فرزندم را از مدت مدید در حبس داشتہ۔ عادل شاہ بہ مجرد شنیدن نالہ پیر ضعیف از جا رفت و غضب عظیم جوش آورد یک لکد بزوری بر وے حوالہ کرد چناں کہ کامل خاں بر رفیع الدین شیرازی کہ پس پشت او بود بیفتاد۔ باز بادشاہ اگرچہ تدارکات آں بنوازشات متنوعہ نمود و منصب او بحال گذاشت اما وی کہ آں کینہ در دل چرکیں ذخیرہ داشت تا بوقت فرصت بہ اشارۂ قتل بادشاہ نمود۔" اگر یہ واقعہ صحیح ہے تو علی عادل شاہ کا حقیقی قاتل کامل خاں ٹھہرتا ہے۔ ابراہیم زبیری تو فرشتہ کے بیان کردہ قصہ (خواجہ سراؤں والا قصہ) کو غلط سمجھتا ہے اور رفیع الدین کے بیان کو تسلیم کر کے قتل کی اصل وجہ یہی بتلاتا ہے۔ یہاں پر قتل کی مختلف روایتوں پر تفصیلی بحث ممکن نہیں اور نہ ضروری محض کامل خاں کے کیرکٹر پر روشنی ڈالنے کے لئے یہ چیز بیان کی گئی۔

اس طرح وہ علی عادل شاہ کے زمانے میں برابر ترقی کرتا رہا اور اپنا رسوخ بہت بڑھا لیا حتیٰ کہ بادشاہ کے انتقال کے وقت وہ سلطنت بیجا پور کے امرائے کبار میں شمار ہونے لگا۔ اس اعتبار سے یہ طے پایا کہ کامل خاں دکنی ہی کو اب متولیٔ سلطنت مقرر کیا جائے چنانچہ فرشتہ اس کی اس غیر معمولی ترقی کے متعلق یوں رقمطراز ہے "کامل خاں دکنی کہ از امرائے کبار آں دولت خانہ بود چناں کہ گذشت در قلعہ مرج نسبت بہ شاہ غفراں پناہ علی عادل شاہ غایت اخلاص ساختہ از محرمان امور سلطنت گردیدہ بود۔ دریں وقت بر مہمات امور ملکی و مالی متولی گشتہ متعلقان معتمد خود را در حوالی و حواشی بادشاہ بہ جہت خدمت محافظت باز داشت[1]" غرض جوں ہی کامل خاں اس اہم خدمت پر فائز ہوا اپنے آپ کو زیادہ مستحکم و مقتدر بنانے کی فکر میں رہنے لگا اور اس کے لئے یہ ترکیب نکالی کہ حکومت کے تمام بڑے بڑے عہدوں اور مناصب پر اپنے متعلقین اور معتمدین کو مقرر کیا جائے چنانچہ خاص قلعہ بیجاپور کی قلعداری پر اپنے ایک خاص معتمد کو فائز کر دیا تاکہ وہ براہ راست اس کے ماتحت رہے اور بلا چون و چرا اس کے احکام کی تعمیل کرے اور اس کے ساتھ ساتھ اس نے اپنے اقتدار کی توسیع کی غرض سے جا و بیجا حرکتیں بھی شروع کر دیں۔ اس پر ہی اکتفا نہ کیا بلکہ خزانہ عامرہ پر بھی قابض ہو گیا متولی ہونے کی حیثیت سے خزانہ اس کے ماتحت تو تھا ہی مگر اس نے یہاں ایسے انتظامات کرنے شروع کر دیئے جس سے کہ لوگوں کے دلوں میں اس کے ارادوں کی نسبت شبہ پیدا ہونے لگا۔ بیش قیمت زر و جواہرات کو جو خزانے میں بھرے پڑے تھے بعض صندوقوں میں سے نکال کر دوسرے صندوقوں میں رکھوا لیا۔ جب رفیع الدین شیرازی نے (جو اس زمانے میں حوالداری خزانہ کے عہدے پر مامور تھا اور جس کی تاریخ تحفتہ الملوک اس زمانے کی بہترین ہمعصر تاریخ ہے جس سے اس مقالے کے سلسلے میں بہت کچھ استفادہ کیا گیا ہے) ان جواہرات کی فہرست تیار کرنی چاہی تو اسے اس کام سے روک دیا۔ اس سے غالباً اس کا یہی ارادہ تھا کہ ان بیش بہا اشیاء پر خود قابض و متصرف ہو جائے پھر اس کے

---

[1] فرشتہ۔ مقالۂ سوم، روضۂ دوم

مزید طرہ یہ ہوا کہ اس نے حرم شاہی کی عورتوں کی تنخواہیں بند کر دیں اور خزانہ دار کو حکم دیا کہ جتنی تنخواہ یاب عورتیں ہیں اُن کی ایک فہرست تیار کیجائے اور اس کے حضور میں پیش ہو کہ اجرائی تنخواہ کی منظوری دے۔ اپنی اس کارروائی کو یہاں تک پھیلایا کہ خود حرم میں جاکر تنخواہیں تقسیم کرتا محل کی بیس عورتوں کو محل سے نکال دیا اور اُن کے رہنے کے لئے دوسری جگہ تجویز کردی۔ گو یہ حرکتیں بظاہر معمولی تھیں مگر اُن کے اثرات اور اُن کے نتائج اس کے حق میں بہت مضر ثابت ہوئے۔ شاہی محل میں کامل خاں کے خلاف بہت کچھ احتجاج کیا گیا اور ہر ایک کو اس کی جانب سے نفرت پیدا ہوگئی۔ اور حقیقت بھی یہ ہے کہ کامل خاں کی یہ حرکتیں ایسی نہ تھیں کہ جن سے درگذر کیا جاتا یا جن سے اس کی بدنیتی اور فاسد خیالی ظاہر نہوتی ہو۔ ان انتظامات سے غالباً اس کا مقصد یہ تھا کہ سب کو براہ راست اپنے ماتحت کر کے اپنے اقتدار میں اضافہ کرے۔ اور ملک میں کوئی شخص ایسا نہو جو اسکی مخالفت کرسکے اور خود تمام سیاہ و سفید کا مالک ہو جائے۔ ابراہیم کی طفولیت کی حد تک تو اسکو بحیثیت متولی کے اختیارات کلی حاصل رہیں گے مگر اس وقت کے لئے پیش بندی ضروری تھی جبکہ ابراہیم معاملات سلطنت اپنے ہاتھ میں لینے کے قابل ہو جائے۔ مطلب یہ تھا کہ اُسے پہلے ہی سے بیدست و پا کر دیا جائے کہ وہ اس کے ہاتھ میں محض ایک کٹھ پتلی کی حیثیت سے رہے اور خود اس کا اقتدار حسب حال رہے۔ اور معاملات ملکی پر اُس وقت بھی اُسی طرح اس کا قبضہ رہے جیسا کہ بادشاہ کی کمسنی میں اس کو حاصل تھا۔ اس کے لئے ضرورت اس امر کی تھی کہ ملک اُن تمام بہی خواہان ریاست سے صاف کر دیا جائے جو اس کے مقابلے میں بادشاہ کی حمایت پر کسی وقت بھی تیار ہو سکتے ہیں۔ غرض کامل خاں کی ان کارروائیوں پر جب نظر ڈالی جاتی ہے تو سوائے اس کے اور کوئی نتیجہ اخذ نہیں کیا جا سکتا کہ حکومت کا اس کو ایسا چسکا لگا تھا کہ اُس سے جدا ہونا اُسے سخت ناگوار معلوم ہو رہا تھا اور محض اپنی اس حکومت کو برقرار رکھنے کے لئے اور اس کو مزید استحکام بخشنے کی غرض سے اُس نے یہ طرز عمل اختیار کیا تھا اگرچہ ہم کو کہیں صاف طور پر اس کا ذکر نہیں ملتا کہ اُس نے تاج و تخت ہی کے ہضم کرنے کا ارادہ کیا ہو مگر پھر بھی اس کی ان کارروائیوں سے شبہ

ہوتا ہے کہ اس کے ارادے نیک نہ تھے۔ وہ صرف اپنا راستہ صاف کر رہا تھا اور ایسے انتظامات میں مشغول تھا جن سے کہ اس کی طاقت روز افزوں ہونے کی توقع تھی اگر وہ اپنے آپ کو پورے طور پر مقتدر کر لینے میں کامیاب ہو جاتا تو عادل شاہی خاندان کو اس کی جانب سے سخت خطرہ تھا۔

اس زمانے میں مقتدر وزراء و امراء کا تخت و تاج حاصل کر لینا کوئی نئی بات نہ تھی چنانچہ اسمٰعیل عادل شاہ کی کم عمری میں کمال خاں نے اسی قسم کی کوشش کی تھی گو وہ ناکام رہا مگر اس کی مثال تو کامل خاں دکنی کے سامنے موجود تھی پھر کوئی وجہ نہیں کہ کامل خاں رفتہ رفتہ اپنے آپ کو مقتدر کر کے سلطنت کا مالک نہ بن جائے! اگر ہم یہ بھی مان لیں کہ کامل خاں کے ارادے سلطنت دبا لینے کے نہ تھے تو کم از کم یہ تو صاف ظاہر ہے کہ وہ اپنے تئیں اتنا با اقتدار بنا لینا چاہتا تھا کہ ابراہیم کے سن شعور کو پہنچنے کے بعد اُسے بآسانی اس کی حاصل کردہ قوت سے علیحدہ نہ کر سکے کامل خاں کے غالباً بلکہ یقیناً یہی اغراض تھے ورنہ ان انوکھے انتظامات اور کارروائیوں کا کوئی تو نصب العین تھا اور کچھ تو غرض و غایت تھی جس کے لئے یہ کارستانیاں ہو رہی تھیں۔ بہرحال کامل خاں کے خواہ کچھ ہی ارادے کیوں نہ ہوں مگر زیادہ عرصے تک وہ اپنے منصوبوں کو پورا کرنے میں مصروف نہ رہ سکا کیونکہ اس کے غرور، اس کی سختیوں اور امرا کے ساتھ اس کے برُے سلوک نے بہت جلد ملک میں اُسے بدنام کر دیا۔ اکثر امُراء و اعیان اس کے خلاف ہو گئے اور اس کی بڑھتی ہوئی طاقت کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھنے لگے اور محض موقع کے متلاشی تھے کہ اس کا ہمیشہ کے لئے خاتمہ کر دیں۔

یہ موقع بھی بہت جلد انھیں ہاتھ آیا۔ کامل خاں نے اپنی انتہائی ناعاقبت اندیشی سے چاندبی بی کو اپنا دشمن بنا لیا جو اس وقت ملک میں ممتاز ترین حیثیت رکھتی تھی اور غیر معمولی طور پر ہردلعزیز تھی۔ اس کے ساتھ سختی کا برتاؤ کرنے لگا اور اس کی شان میں کچھ گستاخیاں بھی کیں چنانچہ فرشتہ لکھتا ہے کہ کامل خاں "از احتشام شراب استقلال دو روزہ بیخود و مغرور گشتہ بنسبت چاندبی بی درمقام بے ادبی شدہ و آں عفیفۂ دوراں و معصومۂ زماں آتش غضب و انتقام برافروختہ درصدد تقصیع وے گردید[1]"۔ جب صورت حال یہ پیدا ہو گئی تو کامل خاں کا اور سلطنت پر زیادہ

[1] فرشتہ۔ مقالہ سوم، روضہ دوم

عرصے تک حاوی رہنا مشکل ہوگیا جوں ہی چاند بی بی نے اُمرا کو اشارہ کیا سب کے سب کامل خاں کے مخالف اور اس کی بربادی کے درپے ہو گئے۔ سب سے پہلے چاند بی بی نے حاجی کشور خاں کو اپنی مدد پر طلب کیا[1]۔ یہ شخص کمال خاں کا بیٹا تھا اور ممتاز ترین اُمرا میں شمار ہوتا تھا۔ چاند بی بی نے اُسے خفیہ طور پر کہلا بھیجا کہ "کامل خاں وکیل السلطنت نمکحرامی پر آمادہ ہے اس کی سخت گیریوں اور گستاخیوں سے میں تنگ آگئی ہوں۔ میری خواہش یہ ہے کہ اس کو اس عہدے سے الگ کر کے تجھے فائز کروں۔ لہذا اگر کچھ ہمت مردانہ رکھتا ہے تو کامل خاں کی نمکحرامیوں اور بدعنوانیوں سے ملک کو نجات دے ورنہ بہتر یہ ہے کہ زنانہ لباس پہنکر چرخہ اور پونی لیکر خانہ نشین ہوجا[2]۔"

کشور خاں کو جب یہ پیام پہنچا تو اس کو خوشی بھی ہوئی اور کچھ شرم بھی آئی اور اس نے فوراً تہیہ کرلیا کہ کامل خاں کو نائب السلطنتی کے عہدے سے برطرف کر دے، چنانچہ اس نے اپنے اردگرد چند ہمخیال لوگوں کو جمع کر لیا جو ہر معاملے میں اس کا ساتھ دینے کو تیار تھے اس خفیہ سازش کی خبر کامل خاں کو بھی پہنچ گئی مگر اس کی آنکھوں پر غفلت کے پردے پڑے ہوئے تھے اور اسکی بربادی کے دن قریب آچکے تھے کہ باوجود اطلاع ہونے کے نہ اس نے اس سازش کے تدارک کے لئے ہی کچھ انتظام کیا اور نہ ہی اپنے طرزِ عمل میں کسی قسم کی تبدیلی کی۔ اس کا غرور اس حد تک پہنچ گیا تھا کہ وہ دعویٰ کرنے لگا کہ "سازشی میرا کیا بگاڑ سینگے۔ سلطنت میری ہے اور میں سلطنت کا وارث ہوں وغیرہ[3]۔"

---

[1] بساتین السلاطین۔

[2] بساتین کے اسکے متعلق یہ الفاظ ہیں: "چاند بی بی لباس زناں وپنبہ چرخہ پیش حاجی کشور خاں پسر کمال کشور خاں بزرگ فرستاد" ص ۱۵۴

[3] چنانچہ اسکی تفصیل تاریخ میں یوں درج ہے:- باوجودیکہ اخبار بگوش کامل می رسد لہٰ لا در پے اصلاح نیامد بلکہ بازیچہ خیال کرد و با محرمان خویش گفت ببینید کہ مردم چہ ساں دنبال گرفتہ مرامی ترسانند وخیال کنند کہ من ازیں افسانہا ترساں شوم و دست از کار بردارم ایں چہ معنی دارد کناساں کہ از ارذال اقوام برائے میراث سروجاں فدامی سازند من چگونہ ازیں کار روگردم و مضائقہ نکنم کہ وارث سلطنت منم وایں سلطنت میراث من است ازیں قسم مالیخولیات بسیار می گفت" بساتین السلاطین

کامل خاں ان خرافات میں مبتلا تھا کہ کشور خاں نے اس عرصے میں اپنی تدابیر کو عملی جامہ پہنا کر چار سو مسلح سواروں کے ساتھ قلعہ پر آدھمکا۔ اس وقت کامل خاں کاروبار سلطنت میں مشغول تھا اور سبز محل میں اجلاس کر رہا تھا۔ کشور خاں نے آتے ہی پہلے قلعدار کو گرفتار کیا۔ قلعہ کے دروازے بند کر دیئے اور پھر متوفی سلطنت کی تلاش میں سبز محل کا رُخ کیا۔ اسی اثناء میں کامل خاں کو معلوم ہو گیا کہ کشور خاں اس کی گرفتاری کے لئے چار سو سواروں کے ساتھ قلعہ میں داخل ہو گیا ہے۔ اُس نے فوراً حرم سرا کا رُخ کیا کہ وہاں جاکر پناہ لے اور چاندبی بی سے مدد کی درخواست کرے مگر راستے میں کسی خواجہ سرا نے اُسے آگاہ کیا کہ یہ ساری آگ چاندبی بی کی لگائی ہوئی ہے اور وہ تیرے خون کی پیاسی ہے۔ اسکے پاس جانا موت کے مُنہ میں جانا ہے۔ یہ خبر سُنتے ہی وہ ہراساں و پریشاں قلعہ کی دیوار پھاندکر خندق میں کُود پڑا جو پانی سے لبریز تھی۔ بدقت تمام وہاں سے پیر کر کنارے پر پہنچا۔ ابھی اسکی زندگی کے چند گھنٹے باقی تھے راستے میں کسی نے اُسے پہچانا نہیں وہ چھپتا، چھپاتا شہر کے دروازہ امام تک پہنچ گیا۔ مگر بدقسمتی سے دروازہ بند تھا اب باہر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا ۱۲ گز دیوار کا پھاندنا آسان کام نہیں تھا بڑی مشکلوں سے دیوار پر چڑھ گیا اور وہاں سے اپنی دستار کمربند اور شال سے رسّی کا کام لیکر اس کو دیوار کے ایک کنگرہ سے مضبوط باندھ دیا اور اس کے ذریعے نیچے اتر پڑا۔ غرض وہ ان مشکلوں سے اپنی جان بچا کر فی الحال کشور خاں کے سپاہیوں کے نرغے سے نکل تو گیا مگر اس کی زندگی کے دن ختم ہو چکے تھے گھر پہنچ کر سات آٹھ سپاہیوں کیساتھ احمد نگر کو فرار ہو رہا تھا اور ابھی چار میل طے کرنے نہ پایا تھا کہ گرفتار ہو گیا اور وہیں اس کو قتل کر دیا گیا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے لڑتے ہوئے بہادری سے جان دی اس طرح کامل خاں کا زمانۂ حکومت اس کی سخت گیریوں اور بدعنوانیوں کی وجہ سے بہت جلد ختم ہو گیا۔ مشکل سے دو مہینے دس روز اس نے حکومت کی ہوگی کہ موت کے گھاٹ اُتار دیا گیا۔

کامل خاں کا کیرکٹر کامل خاں کے جو حالات اوپر دئیے گئے ہیں اُن کے مطالعے سے اسکے کیرکٹر کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ اس نے محض ایک تھانہ دار کی حیثیت سے ترقی کی اس کی ذاتی کوششوں اور

اور محنتوں کی مرہون منت ہے۔ علی عادل شاہ کو اُس نے اور اُس کے خسر نے بادشاہ ہونے
میں کیا مدد دی کہ اُن کی قسمت جاگ اُٹھی۔ یوں بھی کامل خاں کا خسر مرج کا قلعدار ہونے کے
اعتبار سے خاصا رسوخ رکھتا تھا اس زمانے میں قلعداری کا عہدہ نہایت اہم تصور کیا جاتا
تھا قلعدار کے ماتحت، قلعہ کی حفاظت کے لئے ہمیشہ تھوڑی بہت فوج رہتی تھی اور وہ قلعہ کی
حفاظت کا ذمہ دار تصور کیا جاتا تھا۔ کامل خاں کی خوش قسمتی تھی کہ قدرت نے اُسے ایک ایسا موقع
عطا کر دیا کہ جس سے فائدہ اُٹھا کر اُس نے ترقی کی یعنی علی عادل شاہ کا زمانۂ شہزادگی میں قید
کیا جانا اور وہاں (قلعہ مرج) میں کامل خاں کی موجودگی اس کی اور اس کے خسر کی کوششوں سے
علی عادل شاہ کا بادشاہ ہونا یہ ایسی چیزیں تھیں کہ بادشاہ کو اپنے محسن کا بڑا خیال ہو گیا چنانچہ
اسی بنا پر اُسے اس قدر جلد ترقی عطا کی گئی اور زمرۂ اُمرا میں شامل کر لیا گیا۔ جاگیریں دی گئیں،
مناصب عطا ہوئے۔ مگر معلوم ہوتا ہے کہ جوں جوں وہ ترقی کرتا گیا اسی اعتبار سے اُس میں
خشونت و رعونت پیدا ہوتی گئی وہ اپنے ماتحتین کے ساتھ نہایت سخت اور بُرا برتاؤ کرتا
تھا اور اُس کی خصوصیت یہ تھی کہ کم لوگوں کو خوش کرتا اور زیادہ سے بیر رکھتا اور ان کو اپنا
دشمن بنا لیتا تھا یہی خصوصیات دراصل اُس کے زوال کا باعث ہوئیں۔ اپنی جاگیریں بے وجہ
ایک سید زادہ کو محبوس کر دینا اور اس کے خاندان پر ظلم و ستم کرنا (جس کا ذکر اس سے پہلے
کیا گیا ہے) اُس کی بدمزاجی و ستم آرائی کی دلیل ہے اگر رفیع الدین شیرازی کے بیان کردہ
واقعہ کو صحیح تسلیم کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ سخت کینہ پرور بھی تھا اور اپنے بادشاہ،
اپنے آقا اور اپنے محسن کا قاتل ٹھہرتا ہے متولیٔ سلطنت ہو جانے کے بعد سے اسکی بدمزاجیوں
اور سخت گیریوں میں اور اضافہ ہوتا گیا۔ تمام اعیان و ارکان دولت میں وہ ہردلعزیز
نہ تھا اگرچہ اس کے حوصلے بڑے اور ارادے اونچے تھے جن کو عملی جامہ پہنانے میں وہ سخت ناکام
رہا۔ اس کی بعض کارروائیوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس میں سیاست دانی اور تدبّر کا مادہ کم تھا
معاملہ فہمی اور موقع شناسی کی خصوصیات ایسے شخص میں قطعاً ضروری ہیں جس کے ہاتھ میں

نظم و نسق سلطنت ہو۔ اور یہ خصوصیات کامل خاں میں مفقود تھیں اس کا بدیہی ثبوت یہ ہے کہ جس وقت اس کو یہ خبر لگی کہ کشور خاں اُس کے مقابلے کے لئے تیار ہو رہا ہے تو بجائے اسکے کہ اُس کی سازش اور اُس کی کوشش کا ابتدائی منازل میں خاتمہ کر دیا جاتا اس نے اپنے دشمنوں کو اتنا موقع دیدیا کہ وہ اپنے آپ کو مستحکم کر لیں۔ علاوہ ازیں کوئی ہشیار اور باتدبیر وزیر اس ابتدائی زمانے میں جبکہ اس کے پیر اچھی طرح جم نہ سکے ہوں، ایک ہر دلعزیز اور باوقار ملکہ سے بگاڑ اور دشمنی پیدا نہیں کر لیتا مگر کامل خاں کی یہ سراسر حماقت اور انتہائی ناعاقبت اندیشی تھی کہ اس نے چاند بی بی جیسی حیثیت والی ملکہ کو اپنا دشمن بنا لیا قبل اس کے کہ اس کے مقابلے کی تاب اُس میں پیدا ہو جائے۔ غرض بحیثیت مجموعی کامل خاں کے کیرکٹر کے متعلق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ حکومت کا شوقین، دولت کا لالچی، تدبر سے عاری، موقعہ شناسی اور معاملہ فہمی کے نازک اصولوں سے ناواقف تھا مگر ان کمزوریوں کے مقابلے میں اُس میں بہادری اور حوصلہ مندی کے جذبات کی کمی نہ تھی۔ گو سخت گیریوں اور ناعاقبت اندیشیوں کی وجہ سے اس کا کام بگڑ گیا مگر بہادری، حوصلہ مندی اور دیگر ایسی خصوصیات میں وہ اپنے زمانے کے کسی آدمی سے شاید ہی کم ہوگا۔ دراصل بلند حوصلوں اور ذاتی بہادری نے ہی اُسے اُس رتبہ تک پہنچایا مگر ناعاقبت اندیشی، خشونت، رعونت اور بد دماغی نے اُسکی مٹی برباد کی۔

منتولیان ریاست

باب چہارم

کشور خاں

کشور خاں کا عروج

حاجی کشور خاں کمال کشور خاں کا بیٹا تھا[۱] کمال کشور خاں نے علی عادل شاہ کے زمانے میں بڑے کارہائے نمایاں کئے تھے۔ اسی کے صلہ میں بادشاہ نے اُسے اسد خاں[۲] لاری کے منصب اور علم سے سرفراز کیا تھا۔ اور اُس کی ہر طرح حوصلہ افزائی کی تھی اس طرح سے وہ عالی مرتبت اور بلند پایہ اُمرائے سلطنت میں شمار ہونے لگا تھا مگر علی عادل شاہ کے زمانے میں ہی مرتضیٰ نظام شاہ کے مقابلے میں قلعہ دہارور میں مارا گیا۔ ابراہیم عادل شاہ ثانی کے زمانے میں اُس کے بیٹے حاجی کشور خاں کو عروج نصیب ہوا۔ کیونکہ چاند بی بی نے کامل خاں کو منصب وکیل السلطنت سے علٰحدہ کرنے کے لئے اس کو اپنی مدد پر طلب کیا تھا۔ اور وہ کامل خاں کو نکال باہر کرنے میں کامیاب بھی ہوا۔

منصب وکالت کے مختلف دعویدار

جب کامل خاں قتل ہو گیا تو منصب وکالت کے بارے میں جھگڑے پیدا ہو گئے۔ اسلئے کہ اُس وقت اس منصب کے چار پانچ دعویدار تھے۔ سب سے پہلا دعویدار تو کشور خاں ہی تھا اور بالخصوص اس وجہ سے کہ اسی کی کوششوں سے کامل خاں دکنی کا خاتمہ ہوا تھا! ور خود چاند بی بی نے اُس سے وعدہ کیا تھا کہ اگر وہ کامل خاں دکنی کو منصب پیشوائی سے (عموماً بیجاپور میں پیشوائی اور وکیل السلطنت کے عہدے مترادف سمجھے جاتے تھے یا بالفاظ دیگر ایک ہی عہدے کے یہ دو مختلف نام تھے) معزول کرنے میں کامیاب ہو جائے گا تو اُسے خود اس اعلیٰ منصب پر فائز کر دیا جائے گا۔ چنانچہ جو الفاظ چاند بی بی نے اُسے کہلا بھجوائے تھے وہ یہ تھے "کامل خاں لایق منصب جلیل القدر وکالت نیست و

---

[۱] کشور خاں ابن کمال کشور خاں" بساتین السلاطین۔

[۲] یہ وہ اسد خاں لاری ہے جس کی دکن میں ایک خاص شخصیت تھی اور ابراہیم اول کے دور کا اک بلند پایہ امیر تھا۔

این میراث پدر نیست ۔ بتو رجوع نمودم [له] برآں متصرف شو۔"

چاند بی بی کے ان وعدوں سے کشور خاں کی ہمتیں بڑھ گئیں تھیں ۔ اور اس نے اسی امید پر سرگرمی دکھائی تھی کہ وہ کامل خاں کے بعد پیشوائے سلطنت مقرر کیا جائیگا مگر جب یکبارگی کامل خاں نکال دیا گیا اور اس کا قتل عمل میں آیا تو اس عہدے کے نئے نئے دعویدار پیدا ہو گئے ۔ اور لطف یہ کہ اُن کے ان دعوں سے اغماض اور لاپروائی اس لئے برتی نہیں جاسکتی تھی کہ وہ طاقتور اور جلیل القدر امرائے دولت عادل شاہیہ سے تھے ۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں (۱) مرتضیٰ خاں انجو ۔ (۲) شاہ قاسم جو مرتضیٰ کا بھائی تھا ۔ (۳) غالب خاں سرنوبت ۔ (۴) اور معتبر خاں ان چار پانچ دعویداروں میں رات بھر خوب بحث بحثی رہی لیکن کچھ نتیجہ نہ نکلا تمام اُمرا اور اعیان دولت بھی اس مجلس شاق میں شریک تھے ۔ ان چار پانچ دعویداروں میں ایسی معاصرانہ چشمکیں رقابتیں اور دشمنیاں تھیں کہ کچھ بنائے نہیں بن پڑتا تھا ۔ اور اس کا تصفیہ نہیں ہو سکتا تھا کہ کس شخص کو کس عہدے اور کس منصب پر فائز کیا جائے ۔ غرض ان کج بحثوں میں چار پانچ روز گذر گئے مگر ہنوز روز اول کا مضمون تھا کوئی اطمینان بخش تصفیہ کی امید ہی نہ تھی حتیٰ ایں کہ ان میں آپس میں کشت و خون کی نوبت پہنچی ۔ افضل خاں جو اک نہایت ہی دانا اور ہشیار آدمی تھا اور ان تمام جھگڑوں سے خود کو علیحدہ رکھا تھا مگر گھر بیٹھے سب کی خبر رکھتا تھا جب کشور خاں نے دیکھا کہ معاملات دن بدن ابتر ہی ہوتے جا رہے ہیں اور ان کے سلجھاوے کی کوئی امید نہیں تو خفیہ طور پر اک اندھیری رات افضل خاں کے گھر پہنچا اور التماس کیا کہ "میں تربیت یافتہ و لطف پروردہ عالیجناب ہوں ۔ مجھے آپ کی شاگردی کا بھی فخر حاصل رہا ہے ۔ اور اس وقت میرا بنا بنایا کام بگڑا جا رہا ہے آپ ایسے وقت میں میری مدد فرمائیں ۔ اور کچھ استادانہ شفقت سے کام لیں کیونکہ اس وقت میرے دوست بھی دشمن ہو چلے ہیں اور میرے خون کے پیاسے ہو رہے ہیں ۔ آپکے اعزازات اور اثرات ایسے ہیں کہ آپ کی مدد سے میرا کام بن سکتا ہے ۔" جب افضل خاں نے ان تمام گزارشات کے

له ۔ فرشتہ و بساتین السلاطین ۔ الفاظ بساتین السلاطین کے ہیں ۔

باوجود بھی کوئی توجہ نہیں کی تو کشور خاں نے کہا کہ آپ اس ریاست ابد مدت کے نمکخوار قدیم ہیں اور ریاست کے لئے یہ وقت نہایت نازک ہے کئی مار ہائے آستین موجود ہیں جو سلطنت کی کشتی ہی اُلٹ دینا چاہتے ہیں اگر اس وقت بھی کنارہ کشی کی جائے تو انتہائی نمک حرامی ہوگی۔ غرض بڑی دیر سمجھانے کے بعد افضل خاں راضی ہوگیا اور کشور خاں کا ساتھ دینے کا وعدہ کیا۔ جب دوسرے دن پھر مجلس مشورت منعقد ہوئی تو غالب خاں نے (جو کشور خاں سے مل گیا تھا) مرتضیٰ خاں انجو اور اُس کے بھائی شاہ میر قاسم کو مجلس سے اُٹھا کر ایک طرف کو لے گیا جیسے کوئی راز کی بات کہنی ہو۔ دراصل یہ سازش تھی جو کشور خانیوں نے آپس میں کر لی تھی اور جس کا مقصد یہ تھا کہ مخالفوں کو دھوکہ میں لا کر کسی طرح قید کر لیں اس وقت مخالف فریق کے رہبر مرتضیٰ خاں انجو اور شاہ قاسم تھے۔ اسی غرض سے غالب خاں نے اپنی سکھائی پڑھائی تدبیر پر عمل کر کے عین مجلس میں یہ طرز عمل اختیار کیا۔ یہ دونوں خالی الذہن تھے اُس کے دھوکہ میں آگئے اُٹھ کر ساتھ ہو لئے، وہاں تو پہلے ہی سے انتظام تھا جیسے ہی ان دونوں نے اُس مقام سے قدم باہر رکھا جہاں پر کہ مجلس مشورت منعقد ہو رہی تھی وہ قید کر لئے گئے۔ دو تین دن کے بعد ان کو پابزنجیر کر کے قلعہ روانہ کر دیا گیا۔ جب ان دو زبردست دشمنوں پر قابو پا لیا گیا تو پھر میدان صاف تھا معتبر خاں اور اُس کے بیٹوں کو جلا وطن کر دیا گیا۔ یہ جو یہاں سے فرار ہوا ہے تو پھر اکبر بادشاہ کے ہاں پہنچکر ہی اُس نے پناہ لی۔ اس طریقے سے اس سازش کی بدولت کشور خاں کے مخالفوں کا قلع قمع ہوگیا۔ اور وہ نہایت اطمینان کے ساتھ پیشوائی کے عہدے کو اپنے قبضے میں کر کے معاملات ملکی کی طرف متوجہ ہوا۔ چاند بی بی نے بھی اس کی پیشوائی کو تسلیم کر لیا۔

سازش منصب وکالت کے بارے میں جو بحث طول کھینچی اُس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ان اُمرا کے خیالات میں سخت اختلاف پیدا ہوگیا تھا۔ مخالف گروہ یہ چاہتا تھا کہ سرے سے نئے انتظامات عمل میں آئیں۔ یہ ایک قسم کی سازش تھی جو کمسن بادشاہ ابراہیم کے خلاف کی جا رہی تھی۔ اس خفیہ سازش کا علم کشور خاں کو ہوگیا تھا اور اس سازش کے مدد و معاون وہی لوگ تھے جن کا اوپر ذکر کیا گیا یعنی مرتضیٰ خاں انجو شاہ قاسم معتبر خاں وغیرہ۔ ان لوگوں کی خواہش تھی کہ ابراہیم اور اُس کی والدہ کو مکہ معظمہ روانہ کر دیا جائے اور ابراہیم کو معزول کر کے اُس کی جگہ پر "میاں علی جو اسمٰعیل عادل خاں کا برادر زادہ" تھا تخت نشین کر دیں اور اُن ہوا خواہان دولت کو

جو ابراہیم کے ساتھ وابستہ ہیں یا تو اُن کو مقید کیا جائے یا قتل کر وا دیا جائے چنانچہ اُن کا ارادہ تھا کہ شاہ فتح اللہ کو[1] (جن کی اس زمانے میں ایک غیر معمولی شخصیت تھی) قلعہ میں محبوس کر دیا جائے۔ افضل خاں کو قتل کر ڈالیں۔ رفیع الدین شیرازی سے جو "حوالداری خزانہ" کے عہدے پر مامور تھا خزانہ کے حسابات طلب کریں اور اُس کا مواخذہ کریں۔ اور مرتضیٰ خاں انجو کو پیشوا مقرر کیا جائے۔ شاہ قاسم اور کشور خاں کو وزیر السلطنت مقرر کیا جائے۔ اور باقی مناصب باعتبار حیثیت دوسرے اُمرا اور ارکان میں تقسیم کر دیے جائیں۔ مگر کشور خاں کو یہ انتظام منظور نہ تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ جب یہ مستحکم ہو جائیں گے تو پھر اُسے اس طرح نکال باہر کریں گے جس طرح کامل خاں نکال دیا گیا اور پھر اُسے یہ بھی منظور نہ تھا کہ اصلی وارث تخت و تاج کیساتھ یوں نمکحرامی کی جائے جو کفران نعمت کے مماثل ہوگی۔ غرض اُن کی یہ کوششیں کامیاب ثابت نہوئیں کیونکہ افضل خاں اور کشور خاں میں بر وقت اتحاد ہوگیا اور غالب خاں نے ایسے نازک موقعہ پر کشور خاں کا ساتھ دیا کہ مخالفین کی جد و جہد بے سود و بیکار ثابت ہوئی۔ افضل خاں ان اندرونی واقعات سے قطعاً بے خبر تھا لیکن جب کشور خاں افضل خاں کی مدد سے اپنے دشمنوں پر غالب ہوگیا تو اس نے اُسے یہ سارا احوال کہہ سنایا اور بتلایا کہ ہم وفاداران سلطنت کی موجودگی میں یہ کیونکر ممکن تھا کہ یہ بدخواہ اور بدانجام اپنے ناپاک ارادوں میں کامیاب ہو جاتے۔

کشور خاں کا منصب وکالت پر فائز ہو کر معاملات ملکی کی طرف توجہ کرنا

جب اس طرح کشور خاں کے دشمنوں کا خاتمہ ہوا تو وہ بلا خوف و بلا کھٹکے منصب وکالت پر فائز ہوگیا اور اس کے بعد ہی وہ معاملات ملکی کے سنبھالنے کی طرف متوجہ ہوا۔ اس وقت کار و بار کا سنبھالنا کوئی آسان کام نہ تھا۔ بڑے بڑے اُمرا جن سے ایسے نازک وقتوں میں مدد ملتی ہے اور جن کے محض وجود سے دل کو ڈھارس رہتی ہے ایسی نمکحرامی پر کمر باندھے ہوئے تھے جس کی وجہ سے اُن کو معاملات سلطنت سے بیدخل

---

[1] تاریخ قطب شاہی کے الفاظ اس شخص کے متعلق یہ ہیں: "شاہ فتح اللہ شیرازی کہ سرآمد دانشوران روزگار بود" مصنفہ قادر خاں بیدری۔ قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ۔

کر دیا گیا تھا۔ اب کشور خاں کو نہ صرف اندرون ملک میں دشمنوں اور بدخواہوں کو قابو میں رکھنا تھا بلکہ ہمسایہ ریاستوں کی دست درازیوں کی روک تھام بھی کرنی تھی اور تن تنہا ان تمام امور ہائے سلطنت کی انجام دہی بغیر کسی حامی و مددگار کے سخت مشکل تھی۔ اس وجہ سے پھر کشور خاں نے افضل خاں کو اپنا ہمخیال بنایا اور اُسے مجبور کیا کہ ایسے وقت میں وہ معاملات ملک سے کنارہ کش نہ ہو۔ افضل خاں نے ہر چند بہانہ کیا کہ صحت ٹھیک نہیں ضعف و اضمحلال پیدا ہو چکا ہے۔ دل و دماغ اس قابل نہیں رہے کہ سلطنت کے اہم کاروبار انجام دے سکوں۔ مگر کشور خاں نے اُس کی ایک نہ سُنی۔ اور یہی کہے گیا کہ اس وقت ملک کو آپ جیسے اشخاص کی سخت ضرورت ہے۔ بالآخر اُسے بھی راضی کر لیا۔ افضل خاں نے کشور خاں کا جو یہ بڑھتا ہوا اصرار دیکھا تو اس نے مناسب یہی سمجھا کہ فی الحال اُس سے اتحاد برقرار و قائم رکھے۔ اور بے وجہ ضرورت سے زیادہ انکار کر کے اس کو دشمن نہ بنا لیا جائے۔ اور محض اسی مصلحت کی بنا پر اس نے کشور خاں کی بات مان لی اور سلطنت کی اہم اور ذمہ دار خدمات کی انجام دہی کا بیڑا اُٹھایا۔

عادل شاہی سرحد پر نظام شاہی قطب شاہی حملے۔

قاعدے کی بات ہے کہ جب اندرون ملک میں کچھ خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں تو بیرونی دشمن ایسے موقعوں کو غنیمت سمجھ کر اُس سے بیش از بیش فائدہ اٹھانا چاہتے ہیں۔ جب بیجاپور کی ہمسایہ ریاستوں کو اس کی خبر لگی کہ بادشاہ کی کمسنی کی وجہ سے ملک میں سخت بدانتظامی اور اُمرائے سلطنت میں نااتفاقی ہے تو فوراً ہر ایک نے تھوڑی تھوڑی فوج بھیجکر بیجاپور کے سرحدی علاقوں کو اپنے قبضے میں لانے کا عزم کیا۔ سب سے پہلے قطب شاہ[1] نے دست تصرف دراز کیا اس وقت

[1] ان قطب شاہی حملوں کا تاریخ فرشتہ میں ذکر نہیں چونکہ تحفۃ الملوک سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حملوں کی ابتدا قطب شاہیوں کی طرف سے ہوئی اس لیے انکی تفصیل تاریخ قطب شاہی مولفہ قادر خاں بیدری قلمی نسخہ سے لیگئی۔ فرشتہ نے کشور خاں کے عہد میں جو بیرونی حملے ہوئے اُنکے متعلق لکھا ہے کہ پہلے احمد نگر نے بیجاپور کی سرحد پر چڑھائی کی، مگر ان قطب شاہی کوششوں کا قطعاً ذکر نہیں کیا۔

گولکنڈہ میں ابراہیم قلی حکمراں تھا۔ یہ چاہتا تھا کہ پرگنہ کاکن، ناکاوسی، کلورہ، کوڑولی کے علاقے جو شہزادہ سبحان قلی کے زمانے میں ہاتھ سے نکل گئے تھے اور جن پر عادل شاہی حکومت کا قبضہ ہوگیا تھا از سر نو قطب شاہی عملداری میں داخل کر لئے جائیں! وران کی تسخیر عمل میں آئے۔ اس غرض سے اُس نے امیر زنبیل کی سپہ سالاری میں اک بڑی بھاری فوج روانہ کی جس میں عالم خاں کشور خاں اور حیدر خاں جیسے بہادر اور مرد میدان موجود تھے۔ اس وقت ان علاقوں پر بیجاپوری حکومت کی جانب سے میاں بدو و ضیاء دولت خاں کارفرما تھے۔ قطب شاہی افواج کی آمد کی خبر سنکر انھوں نے لڑائی کی تیاریاں کیں اور کچھ مقابلہ بھی کیا۔ مگر شکست کھاکر بھاگ گئے۔ اور اس علاقے پر امیر زنبیل متصرف ہوگیا۔ مفتوحہ علاقوں میں کچھ سرسری انتظامات سے فراغت پاکر وہ اور آگے کی طرف بڑھا اسی اثنا میں اُسے معلوم ہوا کہ ساغر سے ڈیڑھ سو ۱۵۰ ہاتھی بیجاپور کو لیجائے جا رہے ہیں اُس نے فوراً تاخت کی! ور یلغار کر کے وہاں پہنچا کہ ہاتھیوں کو اڑا لائے۔ عادل شاہیوں کو اس کی خبر لگ گئی کہ امیر زنبیل ہاتھیوں کی غرض سے بڑھتا چلا آ رہا ہے تو انھوں نے بھی ہشیاری کی فوراً ہاتھیوں کو لیکر قلعہ میں محصور ہوگئے۔ سید اشرف نے جو اس قلعہ کا حاکم تھا معہ دو برگی سرداروں اور تین چار ہزار سواروں کے قلعہ سے باہر نکل کر دشمنوں کا مقابلہ کیا۔ مگر اُس کو شکست ہوئی اور عادل شاہی فوج کو بہت نقصان پہنچا۔ سید اشرف دشمنوں کے ہاتھوں میں گرفتار ہوگیا۔ قطب شاہیوں نے سید اشرف کو شکست تو دے دی مگر چونکہ ساغر کا قلعہ نہایت مضبوط تھا اُس پر قابض نہ ہوسکے اس ناکامی کا امیر زنبیل نے یوں بدلہ لیا کہ شہر ساغر کو جلاکر خاک کر ڈالا۔ اس کے بعد ملکھیڑ اور اینگلیر کی طرف توجہ کی اور ان کو بھی فتح کر لیا اسطرح قطب شاہیوں کا اُن تمام علاقوں پر قبضہ ہوگیا جو شہزادہ سبحان قلی کے زمانے میں ہاتھ سے نکل گئے تھے۔ ان فتوحات کی اطلاع امیر زنبیل نے اپنے بادشاہ ابراہیم قطب شاہ کو دی۔ بادشاہ اُس کی کامیابیوں سے بہت خوش ہوا۔ اوھر امیر زنبیل تو اپنے بادشاہ کی خوشنودی کی غرض سے یہ کامیابیاں حاصل کر رہا تھا ادھر بیجاپور کی حالت ان حملوں کی وجہ سے خطرناک ہوتی جا رہی تھی جب کشور خاں نے دیکھا کہ سرحد خطرہ میں ہے اور دشمن ملک کی افراتفری سے فائدہ اُٹھاکر مقبوضات عادل شاہی پر قبضہ جما رہے ہیں تو فوراً اُس نے افضل خاں کی

سرکردگی میں ایک بڑی بھاری فوج روانہ کی کہ ان حملہ آوروں کی سرکوبی کی جائے۔ افضل خاں سب سے[1]
پہلے قطب شاہیوں کی طرف متوجہ ہوا۔ فوجیں مقابل میں آکر پڑی ہوئی تھیں۔ چند روز تک کوئی جنگ
نہیں ہوئی البتہ بعض مقامات پر اتفاقی طور پر جھڑپ ہو جاتی تھی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افضل خاں
قصداً جنگ کو ٹال رہا تھا کیونکہ اُسے امدادی فوج کا انتظار تھا۔ غرض جب تک عین الملک آنکس خاں اور
اُمرائے حبش میں سے اخلاص خاں، حمید خاں، اور دلاور خاں نہیں آگئے[2] باقاعدہ طور پر جنگ کا سلسلہ
شروع نہیں ہوا۔ جب یہ لوگ اپنی فوجوں کے ساتھ افضل خاں سے آملے تو عادل شاہی فوج لڑائی کیلئے
تیار ہو گئی! دھر سے قطب شاہیوں نے بھی پیشقدمی کرنی شروع کی۔ دونوں فوجوں کا خوب زبردست
مقابلہ ہوا۔ افضل خاں کی دانائی و ہشیاری سے میدان بیجاپوریوں کے ہاتھ رہا۔ اور قطب شاہی فوج
ایسی سراسیمگی کے عالم میں میدان چھوڑ کر بھاگی ہے کہ اُسے اپنے مال و اسباب کی تک فکر نہ رہی۔[3]
یہ سب مال و اسباب بہت سارے ہاتھی، گھوڑے، اونٹ اس لشکر ظفر پیکر کے قبضے میں آگئے۔
جب افضل خاں کو ان قطب شاہیوں سے فرصت ملی تو وہ فوراً دیگر اُمراء و عمائدین کی رائے سے

---

[1] تحفۃ الملوک۔

[2] بساتین السلاطین۔ تاریخ فرشتہ میں ان حملوں کے سلسلہ میں افضل خاں کا ذکر نہیں آتا۔

[3] اس شکست کا حال تاریخ قطب شاہی میں درج نہیں بلکہ اس زمانے میں قطب شاہیوں کی
جانب سے بیجاپور پر جو حملے ہوئے ہیں اُن کی تفصیل کچھ اور طریقے سے ہی دی گئی ہے۔ اس سے واضح
ہوتا ہے کہ امیر زنبیل اپنی اُن کامیابیوں کے بعد جن کا ذکر کیا گیا ابراہیم کے حکم سے اُس فوج سے ملحق
ہو گیا جو اس وقت خاص بیجاپور پر حملہ آور ہو رہی تھی۔ اس کے مطابق اس وقت بیجاپور کا محاصرہ
کیا جا رہا تھا۔ اور نظام شاہی فوج بھی قطب شاہیوں کی مدد کے لئے موجود تھی لیکن یہ واقعات
بہت بعد کے ہیں جو دراصل اخلاص خاں کے عہد حکومت سے تعلق رکھتے ہیں۔ صاحب تاریخ قطب شاہی
نے ان سب کو یکجا جمع کر دیا ہے۔ ملاحظہ ہو تاریخ قطب شاہی ص (۲۷۵-۲۷۶) قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ۔

نظام شاہی فوج کی طرف متوجہ ہوا[1] اس لئے کہ احمد نگر کی جانب سے پندرہ ہزار کی فوج بہزاد الملک کی سرکردگی میں بیجاپور کی طرف آ رہی تھی ! اس وقت احمد نگر میں مرتضیٰ نظام شاہ حکمران تھا۔ اس کو ایک نہایت ہی دانا اور قابل وزیر صلابت خاں مل گیا تھا جس کے تدبر اور حُسنِ انتظام نے ملک کو بہت فائدہ پہنچایا۔ جب صلابت خاں نے دیکھا کہ بیجاپور اپنی اندرونی الجھنوں میں اس قدر حیران و پریشان ہے کہ اگر اس وقت اس پر کوئی بیرونی آفت نازل ہو تو اس میں مقابلہ کی تاب نہ ہوگی۔ اور نہایت آسانی سے اکثر علاقوں کو اپنے قبضہ میں لایا جا سکتا ہے تو اس نے اپنے بادشاہ کو سمجھایا کہ اس موقعہ کو خدا کی دین سمجھنا چاہیئے اور اپنے قدیم حریف سلطنت سے اگر بدلہ لینے کا کوئی وقت ہو سکتا ہے تو وہ یہی ہے۔ اور خاص طور پر یہ بھی یاد دلایا کہ علی عادل شاہ نے احمد نگر کے خلاف علی برید کی مدد کی تھی۔[2]

---

[1] ۔ برہان مآثر سے واضح ہوتا ہے کہ نظام شاہی اور قطب شاہی حملوں کی ابتدا قریب قریب ایک وقت میں ہی ہوتی ہے۔ اور حملہ آوروں کا ارادہ یہ تھا کہ پہلے دونوں فوجیں ملحق ہو جائیں اس کے بعد جنگ کا آغاز ہو مگر عادل شاہیوں نے قبل اسکے کہ یہ دونوں فوجیں ملحق ہوتیں قطب شاہیوں کا راستہ روک لیا اور انکو شکست دی جس کا اوپر ذکر کیا گیا۔ اس کے بعد نظام شاہیوں کی طرف متوجہ ہوئے۔

[2] ۔ مرتضیٰ نے بیدر کو فتح کرنے کی غرض سے اس چھوٹی سی ریاست پر حملہ کر دیا اور قطب شاہیوں سے مدد بھی لی۔ علی برید نے علی عادل شاہ سے مدد طلب کی۔ عادل شاہ نے علی برید کو مدد تو دی مگر اس شرط پر کہ وہ دو حسین خواجہ سرا جو اس کے پاس موجود ہیں بیجاپور روانہ کر دیئے جائیں۔ ان شرائط کی تکمیل کے بعد بیجاپوری فوج بیدر کا محاصرہ اٹھانے کی غرض سے اس طرف روانہ ہوئی مگر اسی اثناء میں علی عادل شاہ کا قتل عمل میں آیا اور یہ فوج واپس ہو گئی۔ مگر جب بیجاپور کے حالات ٹھیک ہو گئے تو بیدر کی مدد کے لئے پھر بیجاپور سے فوج آئی۔ اس طرح مرتضیٰ نظام شاہ کے بیدر سے جو منصوبے تھے وہ پورے نہ ہو سکے۔ صلابت خاں نے اس وقت یہی چیز یاد دلائی۔ تاریخ قطب شاہی۔

اُس کی کمک کی وجہ سے بیدر پر احمد نگری منصوبے کامیاب ہوسکے۔ مرتضیٰ نظام شاہ بھلا کب ایسی باتوں سے چوکنے والا تھا اُس نے اپنے وزیر کو اجازت دے دی کہ ایک فوج بیجاپور روانہ کر دی جائے[1] چنانچہ بہزاد الملک نے صلابت خاں کے حکم سے پندرہ ہزار فوج کے ساتھ بیجاپور پر چڑھائی کی۔ ادھر سے بیجاپور کی ایک زبردست فوج بھی[2] اس حملے کی مدافعت کے لئے آپہنچی۔ بہزاد الملک ایک نوجوان ناتجربہ کار اور مغرور جنرل تھا اُس نے غالباً ایک چرکسی[3] غلام کی حیثیت سے ترقی کی تھی یعنی نظام شاہیوں نے شولاپور کا رُخ کیا اور راستہ میں تاخت وتاراج اور لوٹ گھسوٹ کے سلسلہ کو جاری رکھا جس کی وجہ سے عادل شاہی علاقوں میں سخت پریشانی پھیلی ہوئی تھی۔ غرض یہ صورت حال تھی کہ نظام شاہی اور عادل شاہی فوجوں کی مڈبھیڑ ہوگئی۔ مگر قبل اس کے کہ اس جنگ کے حالات بیان بیان کئے جائیں، بہزاد الملک کے کیرکٹر اور اُس کی پوزیشن پر روشنی ڈالنی ضروری ہے۔

صلابت خاں نے اپنی اُس ذاتی دشمنی کی بنا پر جو اُسے سید مرتضیٰ امیر الامرائے برار سے تھی (جو اس وقت احمد نگر کا ایک نہایت ہی زبردست جنرل تھا) بہزاد الملک کو اُس کی بجائے سپہ سالار فوج بنایا تھا، یہ ایک کم عمر نوجوان تھا اس لئے دوسرے تجربہ کار اور بوڑھے سردار اسکی سرداری کو اچھی نگاہ سے نہ دیکھتے تھے۔ جب یہ صورت حال پیدا ہوگئی تو صلابت خاں کو اس امر کا احساس

---

[1] ۔ برہان مآثر کے مصنف نے لکھا ہے کہ حملے سے پہلے مرتضیٰ نظام شاہ نے ایک سفیر گولکنڈہ روانہ کیا تاکہ اس ریاست سے اتحاد ہو جائے اور پھر دونوں کی متحدہ اور متفقہ کوششوں سے بیجاپوری علاقوں کی تسخیر عمل میں لائی جائے۔

[2] ۔ برہان مآثر سے معلوم ہوتا ہے کہ کشور خاں نے ۲۰ ہزار سوار افضل خاں کے ماتحت مدافعت کے لئے روانہ کئے اور ان دس ہزار سواروں سے ملحق ہونے کا حکم دیا جو بیدر کا محاصرہ اٹھانے کے لئے گئے ہوئے تھے۔

[3] ۔ فرشتہ۔ مگر برہان مآثر کے مصنف نے اُسے ایک ترک غلام لکھا ہے۔

ہوا کہ بہزاد الملک کی سپہ سالاری میں یہ مہم کامیاب نہ ہوسکے گی اس لئے اُس نے اپنے پہلے احکام کو منسوخ کرکے
سید مرتضیٰ کو ہی سپہ سالار بنایا اور متعاقب روانہ کیا۔ ادھر بہزاد الملک کو احکام روانہ کئے گئے کہ
سید مرتضیٰ کی آمد کا انتظار کرے[1] لیکن اُس نے ان احکام کی پروا نہ کی۔ اور بلا سوچے سمجھے جوانی کے
نشہ و غرور میں چور ہوکر چاہا کہ بغیر سید مرتضیٰ کی مدد کے ہی دشمنوں کا خاتمہ کر دیا جائے اور کامیابی کا
سہرا اپنے ہی سر رہے۔ لہذا اُس نے جنگ چھیڑنے میں نہایت تعجیل کی۔ اور اُس طرف سید مرتضیٰ بہزاد الملک
کے ابتداءً سپہ سالار بنائے جانے پر سخت بد دل ہوچکا تھا[2]۔ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ اُس کے تحت
رہ کر کام کرے۔ غرض اس آپس کی رقابت نے احمد نگری فوج کا بنا بنایا کام بگاڑ دیا۔ ایک طرف
بہزاد الملک کی عجلت دوسری طرف سید مرتضیٰ کی عمداً تعویق و تاخیر بالآخر احمد نگری افواج کی
شکست کی صورت میں ظاہر ہوئی۔

سید مرتضیٰ کی تعویق سے عادل شاہیوں کو غیر معمولی فائدہ ہوا وہ یہ کہ وہ فوج جو اس وقت
بیدر پر نامزد شدہ تھی نہایت تیزی اور سرعت کے ساتھ نظام شاہیوں کے مقابلہ کے لئے یہاں
آملی[3]۔ اس سے عادل شاہیوں کے دست و بازو اور بھی مضبوط ہوگئے۔ غرض دونوں فوجوں کا

---

[1] برہان مآثر۔ بہزاد الملک نے اس حکم کی یہاں تک تعمیل کی کہ ایک منزل پیچھے ہٹ گیا اور اس سے
زیادہ پیچھے ہٹنا خلاف شان سمجھا۔ اور عین دشمن کے مقابلے میں عیش پرستیوں اور لہو و لعب
میں مبتلا ہو گیا۔

[2] فرشتہ یہ نہیں بیان کرتا ہے کہ صلابت خاں نے بعد میں سید مرتضیٰ کو سپہ سالار بنا دیا۔ بلکہ اُسکے
بیان سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ آخر وقت تک بہزاد الملک ہی سپہ سالار رہا اور اس وجہ سے
سید مرتضیٰ سخت ناراض رہا۔ مگر برہان مآثر سے معلوم ہوتا ہے کہ سید مرتضیٰ کو بعد میں سپہ سالار بنایا گیا۔
اور بہزاد الملک کی حماقت کی وجہ سے نظام شاہیوں کو شکست ہوئی۔ (ملاحظہ ہو برہان مآثر و تاریخ فرشتہ)

[3] اس واقعہ کی حد تک برہان مآثر و فرشتہ میں کوئی اختلاف نہیں۔

مقابلہ حوالی شاہ درگ موضع دھارسن میں ہوا جو نلدرگ اور شولاپور کے درمیان واقع ہے۔ عادل شاہی فوج کو اس کا علم ہو چکا تھا کہ سید مرتضیٰ بددل ہے اور عمداً تاخیر کر رہا ہے۔ لہٰذا انھوں نے موقع کو غنیمت جان کر یکایک احمدنگری فوج پر حملہ کر دیا۔ نظام شاہی فوج کے پیر اُکھڑ گئے اور اس بری طرح شکست ہوئی کہ بہزاد الملک کو اتنی فرصت نہ ہو سکی کہ اسلحہ زیب تن کر سکے۔ اس پریشانی اور بدحواسی کے عالم میں اپنی جان بچا کر وہ میدان جنگ سے فرار ہو گیا، اور فوج تتر بتر ہو گئی۔ بہزاد الملک میدان جنگ سے جو بھاگا ہے تو اس نے پھر سید مرتضیٰ کی فوج سے ملحق ہو کر ہی اطمینان کا سانس لیا۔ عادل شاہی اُمراء کو جو یہ غیر متوقع طور پر کامیابی حاصل ہوئی تو اُن کی خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ انھوں نے شکست خوردہ لشکر کا تھوڑی دور تک تعاقب کیا۔ اور اُن کا بہت سارا مال و اسباب لوٹ لیا اور بکثرت جنگی ہاتھی، گھوڑے اور بہت کچھ سامان حرب اُن کے ہاتھ آیا۔ ان لوگوں نے اس کامیابی سے جو فرصت پائی تو بیدر کا رُخ کیا۔ بیدر میں نظام شاہی فوجیں محاصرہ کئے پڑی تھیں، علی برید تنگ ہوا جا رہا تھا۔ اس کی مدد کو تھوڑی سی فوج بیجاپور سے روانہ کی گئی تھی۔ مگر جب خود بیجاپور پر حملہ کا اندیشہ ہوا تو یہ لوگ افضل خاں اور اُمرائے حبش سے آملے تھے جس کا ابھی تذکرہ کیا گیا۔ اس لئے اب اس طرف سے مطمئن ہو کر دوبارہ بیدر کی طرف متوجہ ہوئے کہ نظام شاہیوں کا محاصرہ بیدر پر سے اُٹھا دیں۔ جیسے ہی یہ فتحیاب لشکر بیدر کی طرف پلٹا ہے نظام شاہی فوج میں کھلبلی پڑ گئی۔ اُن کو اس کی خبر ہو گئی تھی کہ بہزاد الملک کو بیجاپوریوں کے مقابلہ میں شکست فاش اُٹھانی پڑی۔ اس سے اُن کی ہمتیں پست ہو گئی تھیں۔ اور انھوں نے اس کو مناسب سمجھا کہ محاصرہ اُٹھالیں اور سید مرتضیٰ کے لشکر سے پیوستہ ہو جائیں۔ اس طرح بیجاپوری فوج کی آمد سے پہلے ہی بیدر کا محاصرہ اُٹھ گیا اور علی برید کو خلاصی نصیب ہوئی۔

اب شکست خوردہ اور منہزم لشکر نظام شاہیہ قلعہ دھارور میں پناہ گزیں ہوا۔ افضل خاں کی خواہش تھی کہ گرماگرمی میں اس بددل و پست ہمت اور تھکی ماندی فوج کا تعاقب کیا جائے۔ اس کو ایک ایسی آخری شکست دی جائے کہ اس کا بالکل خاتمہ ہی ہو۔ تاکہ بیجاپور کو احمدنگری آفت سے پوری پوری نجات ملے۔

مگر افضل خاں کی اس رائے سے دیگر افسران فوج کو اختلاف تھا، وہ چاہتے تھے کہ اس کارروائی کو یہیں ختم کر دیں اور پہلے گھر کے معاملات کی طرف متوجہ ہوں کیونکہ دارالسلطنت سے متوحش اور پریشان کن خبریں آرہی تھیں، اور ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ پھر افق بیجاپور پر کچھ کالی گھٹائیں چھا رہی ہیں جو آنیوالے طوفان کا پتہ دے رہی تھیں۔

لہٰذا یہ طے پایا کہ فی الحال شاہ درگ کے قلعہ میں پناہ گزیں ہو جائیں جہاں فوجوں کو ستانے کا موقع بھی مل جائیگا اور اُن کی نئی ترتیب و تنظیم بھی عمل میں آسکے گی۔ اس عرصے میں کچھ مزید تازہ دم فوج بھی انکی مدد کیلئے بیجاپور سے آسکتی ہے جس کے لئے درخواست کیگئی تھی اور پھر تازہ دم ہو کر از سرِ نو دشمن کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے۔ اس میں مزید فائدہ یہ تھا کہ دارالسلطنت کے متغیر حالات کا بھی کچھ اندازہ ہو سکتا ہے، اور اُسکے بعد یہ طے کرنا ممکن ہوگا کہ کیا طرزِ عمل اختیار کیا جائے۔ غرض ان مصلحتوں کی بنا پر بیجاپور کی یہ فوج قلعہ شاہ درگ میں پناہ گزیں ہو گئی۔

کشور خاں کا نیا طرزِ عمل عمائدین اور اُمراء کے ساتھ بدسلوکیاں

کشور خاں کو جب پے درپے ان کامیابیوں کی خبریں آئیں تو وہ بہت خوش ہو گیا، اور رفتہ رفتہ اُس کی خوشی غرور سے متبدل ہونے لگی۔ اب وہ پوری پوری طرح معاملاتِ ملکی پر حاوی ہو چکا تھا۔ تمام کاروبارِ سلطنت اُس کے ہاتھ میں تھے۔ بادشاہ کمسن تھا، ملک کے بڑے بڑے اُمراء اور سپہ سالار اُس کے حکم سے مشغولِ کار تھے، اور ان جنگوں میں انھیں کامیابیاں بھی ہو رہی تھیں۔ ملک میں اس وقت کوئی شخص ایسا نہ تھا جو اُس کی مخالفت پر کمر باندھ سکتا۔ اس لئے ہر طریقے سے وہ مقتدر و مستحکم ہو چکا تھا۔ قاعدے کی بات ہے جیسے جیسے انسان ترقی کرتا ہے، اور اُس کی عزت و وقار میں اضافہ ہوتا ہے، اُسی قدر اس کی ہوس بھی بڑھتی جاتی ہے۔ قدرت نے انسان کی فطرت ہی کچھ ایسی بنائی ہے کہ جس قدر اُس کی امیدیں اور آرزوئیں پوری ہوتی جاتی ہیں، اُسی قدر اُن میں اضافہ بھی ہوتا ہے۔ چنانچہ جوں جوں کشور خاں کے اقتدار میں ترقی ہوتی گئی، اُسی قدر وہ مزید طاقت حاصل کرنیکا خواہشمند ہوا۔ متولی اور مختارِ سلطنت ہو جانا ہی کوئی معمولی ترقی نہ تھی۔ یہ ایک ایسا عہدہ ہے کہ اسکے بعد ترقی کا اگر کوئی زینہ ہے تو وہ بادشاہت کا ہی ہے۔ کشور خاں پیشوائے سلطنت تو تھا ہی۔ پورے پورے اختیارات اُس کے ہاتھ میں تھے، کوئی اُس کا مخالف نہ تھا۔ اب اپنے اقتدار و استحکام میں مزید کوشش کے

دو معنی ہوسکتے ہیں، یا تو یہ کہ اس کے بعد ترقی کا جو زینہ ہے وہ حاصل ہو جائے یا اپنے مستحکم اور مضبوط طریقے سے اُس کے پیر گڑھ جائیں کہ کوئی اُسے اس منصب سے جدا نہ کرسکے خواہ وہ بادشاہ ہی کیوں نہو۔ کامل خاں نے بھی یہی کیا تھا مگر اُس کو ناکامی ہو چکی تھی۔ اب کشور خاں بھی اُس کے نقش قدم پر چل رہا تھا اور اُس کی پیروی کر رہا تھا چونکہ دونوں کا مقصد ایک تھا لہٰذا اس مشترکہ مقصد کے حصول کے لئے دونوں نے جو طرز عمل اختیار کیا اُس کا بھی ایک ہونا لازمی تھا چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ کشور خاں نے بھی بڑے بڑے عہدوں اور مناصب جلیلہ پر اپنے آدمی بھرنے شروع کئے۔ بڑی بڑی قلعداریاں اپنے ہواخواہوں میں تقسیم کر دیں۔ قدیم وفادار اور جاں نثاران ریاست آہستہ آہستہ علیٰحدہ کئے جانے لگے۔ اور اُن کی جگہ پر کشور خاں نے اپنے رشتہ داروں اور متعلقین کو فائز کرنا شروع کیا۔ غرض یہ ایسا طرز عمل تھا جس سے ہر بہی خواہ سلطنت کو تشویش ہونی لازمی تھی۔ اُس نے چاند بی بی جیسی باقتدار اور با اثر ملکہ کو بھی بے دست و پا کر دیا۔ اور یہاں تک نوبت پہنچ چکی تھی کہ بغیر کشور خاں کے حکم کے چاند بی بی کی ایک نہ چلتی تھی مختصر یہ کہ اُس نے اپنے آپ کو ہر طرح مستحکم کر لیا اور مزید استحکامی تدابیر میں مشغول تھا۔ اس پالیسی کی وجہ سے اکثر اُمرا و اعیان سلطنت اُس سے ناراض ہو رہے تھے۔ اور اُس کی ان کارروائیوں کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ متوتی کا یہی وہ طرز عمل تھا جس کی بنا پر سرداران فوج نے اپنی جنگی کارروائیوں کو ملتوی کر دیا تھا اور اس فکر میں تھے کہ دیکھئے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔

کشور خاں کا یہ غلط طرز عمل یہیں تک پہنچکر رُک جاتا تو شاید ایسی زیادہ خرابی پیدا نہوتی۔ مگر اُس نے کہیں اس سے بھی زیادہ پیر پھیلائے۔ اور خصوصیت کے ساتھ دو ایک حرکتیں اُس نے ایسی کیں جو خود اُس کی بربادی کا پیش خیمہ بن گئیں۔

جب نظام شاہی فوج پر بیجاپوریوں کی فتح کی خبر دارالسلطنت آئی تو چاند بی بی کے حکم سے تین روز تک شہر میں شادیانے بجتے رہے اور ہر قسم کی خوشی منائی گئی۔ معزز اُمرا اور ذی وقار ارکان دولت کو اور اُن سرداروں کو جنھوں نے کہ اس جنگ کو کامیاب بنانے میں کوششیں کی تھیں کشور خاں نے چاند بی بی کے حکم سے خلعت ہائے فاخرہ سے سرفراز کیا۔ مرصع تلواریں اسپ ہائے تازی معززین و لجام بھی عطا کئے گئے۔

غرض ہر طریقے سے تین روز تک تمام شہر میں خوشی کا سامان کیا گیا اور ملک کے ہر طبقہ کو خوش کرنے کی تدابیر عمل میں لائی گئیں۔ ادھر بظاہر تو یہ خوشیاں منائی جا رہی تھیں مگر اندرونی طور پر سخت اختلافات پیدا ہو رہے تھے۔ اور وہ مواد پک رہا تھا جو بالآخر کشور خاں کے زوال کا باعث ہوا۔ چاند بی بی اور متولی سلطنت کے سیاسی تعلقات اب خوشگوار نہ رہے تھے، اور اندرونی طور پر دونوں میں مخالفتیں بڑھتی ہی جا رہی تھیں۔ کشور خاں یہ چاہتا تھا کہ کسی معاملے میں بھی وہ چاند بی بی سے استصواب رائے کرنے پر مجبور نہ ہو لیکن چاند بی بی کا اثر و اقتدار اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ ہر ہر قدم پر اُسے اُس کی مرضی کے آگے سر تسلیم خم کرنا پڑتا تھا۔ یہی وہ چیز تھی جو کشور خاں کو سخت ناگوار گزرتی تھی، اور اب وہ کوشش کر رہا تھا کہ جہاں تک ہو سکے چاند بی بی کے اثر سے باہر ہو کر کاروبار حکومت چلائے۔ چنانچہ سب سے پہلی کارروائی جو چاند بی بی کی مشورت کے بغیر انجام پائی وہ چند ہاتھیوں سے متعلق تھی۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ کشور خاں نے سرداران فوج کو لکھا کہ وہ نظام شاہی ہاتھی جو حالیہ فتح کے سلسلہ میں بطور مال غنیمت ہاتھ آئے ہیں فوراً دار السلطنت روانہ کر دئیے جائیں۔ اُمراء نے ان کے روانہ کرنے میں تساہل کیا اور انھوں نے یہ محسوس کیا کہ کشور خاں کی یہ حرکت اُمراء و سرداران فوج کے لئے باعث تذلیل و تحقیر ہے۔ لہٰذا اکثر لوگ اُس کے مخالف ہو گئے اور اُسکے خلاف میں کارروائی کرنے لگے خفیہ طور پر ملکہ چاند بی بی سے یہ درخواست کی گئی کہ کشور خاں کے اطوار بگڑے ہیں وہ دن بدن زیادہ مغرور و مخدوش ہوتا جا رہا ہے۔ بہتر یہ ہے کہ کشور خاں کو اس منصب سے علیحدہ کر دیا جائے قبل اس کے کہ وہ کامل خاں دکنی کا پورا پورا رنگ اختیار کرے۔ اور اس کیلئے انھوں نے یہ تدبیر بتائی کہ مصطفیٰ خاں کو بنکاپور سے طلب کیا جائے اور کشور خاں کی جگہ اُسے متولی سلطنت بنایا جائے۔ مصطفیٰ خاں ہر حیثیت سے اس عہدہ کا مستحق بھی ہے اور موزوں بھی۔ ایک قدیم وفادار اور جاں نثار سلطنت ہے اور اُس نے بہت سارے کارہائے نمایاں بھی کئے ہیں، اس اعتبار سے اُسے وکیل السلطنت کا عہدہ دینا ملک کی فلاح و بہبودی کا سامان کرنا ہے۔ یہ رائے اپنی حد تک نہایت بہتر اور صائب تو تھی لیکن مشکل یہ آن پڑی کہ پورے اُمراء اور سرداراس رائے سے متفق نہ تھے۔ ایک جماعت ایسی بھی تھی جس کا خیال تھا کہ عین اس وقت پر جبکہ بہزاد الملک کی شکست کا بدلہ لینے کے لئے سید مرتضیٰ کی سرکردگی میں ایک زبردست احمد نگری فوج کے آنیکا

اندیشہ ہے دارالسلطنت کے اندرونی انتظامات میں کوئی غیر معمولی تغیر یا تبدیلی نقصان سے خالی نہ ہوگی۔ کیونکہ اگر فوج کو گھر کے معاملات کے درست کرنے میں مشغول ہو جانا پڑے تو باہر کے دشمن کا جو اس وقت آدھمکے کون مقابلہ کریگا۔ لہذا جب تک سرحد پر سے دشمن کو نہ نکال دیا جائے اُس وقت تک ان اہم معاملات کی طرف توجہ نہیں کی جانی چاہیئے۔ اور جب یکبارگی نظام شاہیوں کی جانب سے کامل اطمینان ہو جائے تو پھر آسانی سے دارالسلطنت پہنچکر چاند بی بی کی مشورت سے مناسب انتظام کیا جاسکتا ہے۔

غرض اس نا اتفاقی سے فی الحال یہ معاملہ معرض التوا میں پڑ گیا۔ اور ادھر کشور خاں کو بھی اس کا علم ہو گیا کہ اُس کے خلاف کیا کیا کاروائیاں ہو رہی ہیں۔ اس نے فوراً اپنے بچاؤ کے انتظام کی طرف توجہ کی۔ وہ یہ خوب سمجھتا تھا کہ اگر پہلے ہی سے اپنی سلامتی کا انتظام نہ کر لیا جائے تو یقیناً یہ تمام اُمراء جو اس سے بدظن اور بیزار ہو گئے ہیں اُسے قابو میں لاکر پھانس لیں گے۔ اور اس کی وہی درگت بنائی جائیگی جو اس نے کامل خاں کی بنائی تھی۔ "قتل الموذی قبل الایذا" کے اصول پر عمل کر کے اُس نے سوچا کہ سب سے آسان ترکیب یہ ہے کہ ان لوگوں کا ہی خاتمہ کر دیا جائے جو اُس کی نظر میں اُس کے لئے "موذی" ثابت ہو سکتے تھے۔ اس وقت اُسے سب سے زیادہ ڈر مصطفٰے خاں اردستانی سے تھا۔ اس شخص کی عظمت کا سکہ ہر دل پر بیٹھا ہوا تھا۔ اُس کے مقابلے میں کشور خاں کا کوئی ساتھ دینے کے لئے ہرگز تیار نہ ہوتا تھا۔ اس لئے اس نے خیال کیا کہ جب تک مصطفٰی خاں زندہ ہے اس کا اقتدار مکمل نہ ہوگا۔ اور بالخصوص اس وجہ سے کہ سب کی نظریں اُسی پر پڑ رہی تھیں اور اُمراء و اعیان دولت کی تمہا امیدا اُسی سے وابستہ تھی گویا اگر مصطفٰی خاں کا خاتمہ کر دیا جائے تو مخالفین کا اصلی رہبر و رہنما ہی باقی نہیں رہتا۔ اور پھر مصطفٰی خاں کے قتل سے اُس کی ایسی دہشت اور ایسا رُعب لوگوں کے دلوں پر چھا جائیگا کہ کسی کی اتنی ہمت نہ ہوگی کہ اُس کے مقابلے کا خیال بھی دل میں لا سکے۔ اس غرض سے اُس نے ٹھان لی کہ کسی نہ کسی طرح مصطفٰے خاں کو قتل کروا دیا جائے۔ یہاں پر مصطفٰی خاں کے قتل کی تفصیل سے پہلے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ کچھ اُس کے حالات دئے جائیں تا کہ اُس کی با عظمت شخصیت اور اُس کی اہمیت کا کچھ اندازہ ہو۔

مصطفٰی خاں کے حالات | مصطفٰی خاں کا اصلی نام سید کمال الدین حسین ہے۔ اردستانی خاندان سادات سے

اس کا تعلق تھا اعلیٰ تعلیم و تربیت کے حاصل کرنے کے بعد وہ تلاش معاش میں ہندوستان چلا آیا سب سے پہلے وہ گولکنڈہ میں قطب شاہ کے پاس ملازم ہو گیا۔ بادشاہ نے اس کی غیر معمولی قابلیت دیکھی تو اُسے بہت جلد ترقی دی۔ رفتہ رفتہ وہ وکیل السلطنت کے عہدے تک پہنچ گیا تھوڑے ہی عرصے میں اُسے مصطفیٰ خاں کے خطاب سے سرفراز کیا گیا مصطفیٰ خاں نے اس خوبی سے ملک و مملکت کا انتظام کیا کہ تمام ملک میں خوشحالی پیدا ہو گئی سکہ جات کا انتظام ٹھیک ہوا۔ فوج کی از سر نو ترتیب و تنظیم عمل میں آئی۔ رعایا کے آرام و آسائش کے سامان بہم پہنچائے گئے۔ غرض ہر طریقہ سے سلطنت گولکنڈہ اس کے حسنِ انتظام سے سنبھلنے اور سدھرنے لگی ابتداً تو قطب شاہ کو اپنے اس لائق وزیر پر کامل اعتماد تھا اور اس نے تمام کار و بار سلطنت اس کے ہاتھ میں رکھ چھوڑے تھے۔ مگر بعد میں قطب شاہ نے اس کو مناسب نہیں سمجھا کہ پورے پورے اختیارات ایک وزیر کے ہاتھ میں دیدئے جائیں لہذا اب وہ خود بہ نفس نفیس انتظامات مملکت میں مشغول ہونے لگا۔ اور بہت سارے اختیارات جو مصطفیٰ خاں کو دیے تھے۔ اُن میں کمی کر دی۔ مصطفیٰ خاں کو یہ بات سخت ناگوار گزری۔ اس وجہ سے کہ اُس سے یہ مترشح ہو رہا تھا کہ بادشاہ کو اب اپنے وزیر پر پہلا سا اعتماد نہیں ہے۔ وہ اُس سے بدگمان ہو گیا ہے یا کسی قسم کا اندیشہ رکھتا ہے مصطفیٰ خاں اک نہایت ہی دیانتدار اور راستباز آدمی تھا۔ جب اُس نے دیکھا کہ بادشاہ کی نظروں میں اُس کی وہ پہلی سی وقعت ہے اور نہ وہ اعتبار، تو اُس کو یہی مناسب معلوم ہوا کہ کوئی ترکیب نکال کر اس عہدے سے ہی مستعفی ہو جائے اور اپنے کو قطب شاہی عملداری سے الگ کر لے۔

اسی اثناء میں رام راج کی سرکوبی کا مسئلہ چھڑا قطب شاہ نے مصطفیٰ خاں کو سفیر بنا کر عادل شاہی اور نظام شاہی دربار کو روانہ کیا کہ وہ "اتحاد" کی بابتہ ان سلاطین سے گفت و شنید کرے۔ مصطفیٰ خاں اپنی اس سفارت پر روانہ تو ہو گیا مگر چلتے وقت بادشاہ سے اس کا وعدہ لے لیا کہ اُسے اس خدمت کے صلے میں حرمین شریفین جانیکی اجازت دیدی جائے گی۔ قطب شاہ چار و ناچار راضی ہو گیا اور مصطفیٰ خاں اپنی سفارت پر روانہ ہوا جب مصطفیٰ خاں کی کوششوں سے احمد نگر، گولکنڈہ اور بیجاپور کے درمیان اتحاد قائم ہو گیا اور متحدین کی کوششوں سے رام راج کا خاتمہ ہو گیا تو مصطفیٰ خاں نے قطب شاہ کو اس کا وعدہ یاد دلایا اور اور رخصت کی اجازت چاہی مگر قطب شاہ مصطفیٰ خاں کو اجازت دینے کے لئے تیار نہ تھا اور مختلف طریقوں سے

اُسے ٹالنا چاہا جب اُس نے یہ رنگ دیکھا بہت پریشان ہوا اور اپنی خلاصی کے لئے کشور خاں پیشوائے عادل شاہ اور مولانا عنایت اللہ پیشوائے نظام شاہ کے ذریعہ قطب شاہ پر اثرات ڈالے[۱] لیکن قطب شاہ کی مرضی یہ تھی کہ مصطفیٰ خاں کو گولکنڈہ لیجا کر اس کی خوب اچھی طرح تادیب کرے[۲] مصطفیٰ خاں اس کو خوب اچھی طرح سمجھتا تھا اور گولکنڈہ جانے میں اپنی جان کی خیر نہ دیکھتا تھا۔ لہذا اس نے کشور خاں اور عنایت اللہ پیشوایان ریاست ہائے نظام شاہ و عادل شاہ کو اپنا کر لیا تھا اور اُن کے ذریعہ قطب شاہ پر دباؤ ڈال رہا تھا کہ وہ اُس کو روانگی کی اجازت دیدے جب قطب شاہ نے دیکھا کہ کشور خاں اور عنایت اللہ کسی طرح اس کا پیچھا نہیں چھوڑتے ہیں تو بالآخر اُس کو روانگی کی اجازت دی مگر مشکل یہ تھی کہ مصطفیٰ خاں کے اہل وعیال اور اس کا مال و اسباب گولکنڈہ میں تھا اور اندیشہ تھا کہ قطب شاہ اپنی اس ناراضی اور غصہ میں کہیں ان پر مظالم نہ کر بیٹھے، پھر اس کے حضور میں درخواست پیش کی گئی کہ اُس کے اہل وعیال کو بھی بلا ضرر اس کے ساتھ روانگی کی اجازت دے دیجائے قطب شاہ ان پیشواؤں کی پے در پے کوششوں سے بالآخر اس امر پر مجبور ہو گیا کہ مصطفیٰ خاں اور اس کے اہل وعیال کو روانگی کی اجازت دیدے مصطفیٰ خاں وجیانگر سے اجازت لیکر جو نکلا ہے تو پھر گلبرگہ ہی آکر دم لیا اور بیوی بچوں کے آنے تک وہیں قیام پذیر رہا۔

مصطفیٰ خاں نے قطب شاہ کی ملازمت کے زمانے میں بہت کچھ دولت حاصل کر لی تھی اور بیان کیا جاتا ہے کہ بیس لاکھ ہون سے زیادہ قیمت کی "جنس و نفائس" علاوہ زر نقد کے اس کے پاس موجود تھے۔ اور اس کا یہ سب کثیر مال و اسباب گولکنڈہ سے گلبرگہ کو آٹھ ہزار بیلوں اور بارہ ہزار آدمیوں پر لد کر آیا تھا، اور اس کا مطبخ اتنا وسیع اور ایسا پرشکوہ تھا کہ بادشاہوں کے مطبخ بھی شاید ہی ایسے ہونگے۔

---

[۱] ۔ بساتین السلاطین صفحہ ۱۳۴۔

[۲] ۔ قطب شاہ مصطفیٰ خاں سے اس واسطے ناراض ہو گیا تھا کہ مصطفیٰ خاں نے بغیر بادشاہ کی اجازت کے مدگل اور رائچور کے فتح شدہ قلعوں کی کنجیاں عادل شاہ کے حوالے کر دیں۔ اس پر بادشاہ بہت برہم ہوا اور اسی بنا پر چاہتا تھا کہ اُسے گولکنڈہ لیجا کر اچھی طرح سزا دے۔ تاریخ قطب شاہی۔ (قلمی نسخہ) کتب خانہ آصفیہ۔

مصطفیٰ خاں کا اس قدر کثیر مال و دولت کے ساتھ یوں ہاتھ سے نکل جانا قطب شاہ کو بہت شاق گزرا۔ اور اس نے غصہ و برہمی میں اس کا گھر کھُدوا دینے کا حکم دیدیا۔

جب مصطفیٰ خاں کو اس طرح نجات مل گئی تو اس نے عادل شاہ کی ملازمت اختیار کرلی علی عادل شاہ نے بخوشی ایسے باتدبیر شخص کو زمرۂ اُمرا میں داخل کر لیا اور بائیس ہزار سوار کا افسر مقرر کر دیا۔ اس کے بعد سے مصطفیٰ خاں برابر ترقی کرتا رہا اور دن بدن علی عادل شاہ کا اعتماد اس پر بڑھتا جاتا تھا اور اپنے حُسنِ خدمت سے اپنے آقا کو اس نے ایسا گرویدہ کرلیا کہ ترقی کی سب راہیں اس کے لئے کُھل گئیں۔ یوں بھی وہ لایق شخص تھا جس طرح مجلس مشورت میں وہ ایک بہترین وزیر باتدبیر کا کام دے سکتا تھا، اسی طرح میدان رزم میں اپنے زمانے کا ایک کامیاب سپہ سالار بھی تھا چنانچہ قلعہ بنکاپور کی فتح جو علی عادل شاہ کے عہد کا اک زرین کارنامہ ہے اسی کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ غرض یہ کہ ہر حیثیت سے مصطفیٰ خاں ترقی کے قابل تھا۔ اور اُسے ترقی ملی۔ رفتہ رفتہ کشور خاں کے قتل کے بعد علی عادل شاہ کے عہد میں وکیل السلطنت یا عہدۂ پیشوائی پر وہ فائز ہو چکا تھا۔ اس زمانے میں اس کا اثر و رسوخ اس قدر بڑھ گیا تھا کہ علی عادل شاہ نے اُسے اپنی مُہرِ خاص دے رکھی تھی جس کو کبھی وہ اپنے سے جدا نہ کرتا تھا، مگر مصطفیٰ خاں پر اس کو اتنا غیر معمولی اعتبار تھا کہ وہ بلا کھٹکے شاہی مُہر اس کے حوالے کر دی اور اس کو اجازت تھی کہ بغیر استمزاج شاہی کے بھی اس مُہر کو استعمال کرے۔ یوں تو وزارت کے عہدے پر اکثر لوگ مامور ہوا کئے ہیں مگر جو غیر معمولی اثر و رسوخ مصطفیٰ خاں نے حاصل کر لیا تھا شاید ہی وہ کسی کو نصیب ہوا ہو۔ عادل شاہ کی ملازمت میں اس نے اس سے بھی کہیں زیادہ دولت حاصل کرلی جو قطب شاہی ملازمت کے دوران میں اسے حاصل ہوئی تھی۔ اس کی دولت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ تقریباً اس کے ایک سو اسی [۱۸۰] (یکصد و ہشتاد) جہاز دریائے گجرات سے لیکر دریائے بنگالہ تک تجارت کرتے تھے۔ مال و دولت کے اعتبار سے وہ اپنے ہمعصر بادشاہوں کا مقابلہ کر سکتا تھا۔ غیر ممالک کے بادشاہوں سے اس کے تعلقات نہایت خوشگوار تھے، اور یہ ہمیشہ ان کے پاس بیش قیمت تحائف بھیجا کرتا تھا، ور ادھر سے خلعت ہائے فاخرہ اور دیگر نفائس عطا کئے جاتے تھے۔ بالخصوص سلطان سلیمان روم شاہ طہماسپ ایران اور اکبر بادشاہ ہند سے اس کی اسی طرح خط و کتابت ہوا کرتی تھی جیسے ہمعصر اور

ہم رتبہ لوگوں کے درمیان ہوتی ہے۔

جنگ تالیکوٹ کے بعد جو سلسلۂ فتوحات علاقہ کرناٹک میں عادل شاہی افواج کا شروع ہوا وہ زیادہ تر مصطفیٰ خاں کی سپہ سالاری میں تکمیل پایا۔ اور اس زمانے میں اس نے بہت سارے قلعوں اور مختلف علاقوں کو جو اب تک دشمنوں کے قبضے میں تھے فتح کر لیا۔ اور اس فتح شدہ کرناٹک کے وسیع حصہ ہائے ملک کو قلمرو عادل شاہیہ میں داخل کر دیا۔ اور پھر فتوحات کے بعد اس علاقے کا ایسا عمدہ انتظام کیا کہ کسی باغی یا متمرد راجہ کو اتنی ہمت نہ ہوتی تھی کہ اس کے خلاف سر اُٹھائے۔ چونکہ علی عادل شاہ نے اس تمام فتح شدہ ملک کو مع علاقہ بنکاپور مصطفیٰ خاں کی جاگیر میں دے رکھا تھا[1] اسلئے اُس نے یہاں کا انتظام عمدہ طریقے پر کیا۔ اور اس وسیع علاقے سے اُسے اتنا کثیر خراج وصول ہوتا تھا کہ اُس کی اپنی یہ ایک چھوٹی سی ریاست تھی جو نیا علاقہ فتح کرتا تھا اُس کو وہاں کے راجہ پر اسی صورت میں بحال رکھتا کہ وہ سالانہ پیشکش بخوشی ادا کرے۔ اس طریقے سے کئی جاگیرداروں، زمینداروں اور چھوٹے چھوٹے راجاؤں کے گروہ کے گروہ اُس کی ماتحتی میں تھے۔ غرض یہ سب اُس کی کاروانی اور صائب تدبیری تھی، جس نے اُسے ترقی کے اس زینہ پر پہنچایا۔ حالانکہ جب اُس نے ابتداءً ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا ہے تو بالکل بے یار و مددگار اور بے خانماں تھا۔ مگر رفتہ رفتہ وہ اب اُس درجہ پر پہنچ چکا تھا کہ بادشاہوں کا بھی مقابلہ کر سکتا تھا۔ حقیقت میں مصطفیٰ خاں کی طاقت و قوت اور اُس کا اثر اتنا زبردست تھا کہ بجائے ایک کشور خاں کے دس کشور خاں بھی اُس کے مخالف ہو جاتے تو اُس کا کچھ نہ بگاڑ سکتے کیونکہ وہ اپنی جاگیر ہی سے بے حد مستحکم اور طاقتور ہو چکا تھا اور بڑی زبردست قوت حاصل کر لی تھی۔ مگر بدقسمتی یہ ہوئی کہ اُس کو اس کا علم نہ ہو سکا کہ وہ شطرنج کی کس چال کا شکار ہونے والا ہے، اور محض دھوکہ میں آکر مارا گیا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی لکھ دینا ضروری ہوگا کہ باوجود اتنی طاقت اور ایسی کثیر دولت کے کبھی اپنے بادشاہ یا ملک کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی۔ نمک حرامی اُس کی سرشت میں ہی نہ تھی، ورنہ

[1] ۔ بساتین السلاطین۔

ایک ایسے ذرائع اور اثرات والے شخص کے لئے یہ کچھ مشکل نہ تھا کہ ذاتی فائدے کے لئے ابراہیم کی کمسنی میں جبکہ دارالسلطنت میں اُمراء کے درمیان ایسے اختلافات پیدا ہو چلے تھے، ملک میں اک شورش یا ہنگامہ بر پا کردے۔ وہ ہمیشہ ملک کی فلاح و بہبود کا ہی خواہاں رہا کرتا تھا! ور اس مقصد کے حاصل کرنے کیلئے اس نے اپنی جان سے تک دریغ نہ کیا۔ غرض مصطفیٰ خاں مختلف خوبیوں کا حامل تھا۔ اور حقیقت میں مصطفیٰ خاں کو برسرکار آنیکا موقعہ ملتا تو وہ ملک کا ایسا ٹھیک انتظام کرتا کہ وہ سارے جھگڑے اور نا اتفاقیاں جو اس دوران میں مختلف متولیان ریاست کے درمیان پیدا ہو چلی تھیں وجود میں نہ آسکتیں۔ اور ملک اس کی دیرینہ کاری اور تجربہ کاری سے بہت کچھ فائدہ حاصل کرتا۔

جہاں مصطفیٰ خاں کی ان تمام خوبیوں کا ذکر کیا گیا ہے اُس کی چند کمزوریوں کا ذکر کر دینا بھی لازمی ہے۔ کمزوریاں بشریت کا جُزو لاینفک ہیں۔ کیونکہ انسان صرف خوبیوں کا ہی حامل نہیں ہوسکتا۔ ایسی ہستی جو خطاء وقصور سے بالکل مُعرّا ہو وہ انسانی ہستی نہیں کہلائی جائے گی بلکہ اس کو مافوق الانسان ہستی کہنا مناسب ہوگا۔ غرض اُس کی کمزوریوں اور خامیوں کا جائزہ لینے کے بعد زیادہ سے زیادہ یہی کہا جاسکتا ہے کہ مصطفیٰ خاں اک انسان تھا کوئی فرشتہ نہ تھا اس کی ان کمزوریوں میں زیادہ تر قابل ذکر اُس کی تندخوئی اور سخت گیری ہے۔ اپنے ماتحتین کے ساتھ نہایت سختی کا برتاؤ کرتا تھا! ور اُن کے معمولی سے معمولی قصور سے درگزر نہ کرتا تھا۔ گو فراغ حوصلہ تھا اور سلوک کے معاملے میں پیچھے نہ ہٹتا تھا، مگر اُس کی سختی اور تندخوئی نے اُسے بہت بدنام کر رکھا تھا۔ بیان کیا جاتا ہے کہ اُس کا اک حکیم مثقال مومیائی کہیں رکھ کر بھول گیا، چند روز کے بعد معلوم ہوا کہ فراشوں اور نوکروں نے اُس مومیائی کو پاکر آپس میں تقسیم کر لیا ہے اور چٹ کر گئے ہیں۔ اس کی تحقیق کی گئی تو بائیس آدمیوں پر جُرم ثابت ہوا مصطفیٰ خاں بہت برہم ہوا اور حکم دیا کہ ان سبھوں کو خوب اچھی طرح سزا دی جائے۔ اُن کو اتنی زدوکوب کی گئی کہ وہ تاب نہ لاکر مر گئے۔ اُس کے ماتحتین کو اُس کا اتنا خوف تھا کہ کوئی کام اُس کے خلاف مرضی نہ کرسکتے تھے۔ بساتین کے مصنف کا بیان ہے کہ تقریباً ساٹھ سال وہ دکن میں مقیم رہا اور اس طویل عرصے میں اُس کے مطبخ کا ایک چینی کا برتن ٹوٹنے یا ضائع ہونے نہ پایا! اور اگر سوئے اتفاق سے کوئی برتن ضائع بھی ہوجاتا تو جس کسی کے ہاتھ یہ نقصان ہوتا وہ اپنے پاس سے اُس کی قیمت ادا کر دیتا تھا یا ویسا ہی

برتن مول دیتا۔ اُس کی تند خوئی اور سخت گیری سے بڑھ کر اُس کا غرور و تکبر تھا۔ اپنے اس تکبر و غرور کی بنا پر ہی اُسے قطب شاہی عملداری سے نکلنا پڑا۔ قطب شاہ کی ناراضی کے وجوہات میں سے اک وجہ یہ بھی تھی کہ وہ بہت زیادہ مغرور و متکبر ہو گیا تھا۔ غرض اُس کی سیرت کی یہ دو کمزوریاں اُس کے دامن شہرت و کمال پر ایک بدنما دھبہ ہیں مصطفیٰ خاں کو اصلی خد و خال میں پیش کرنے اور اُس کی پچھلی خدمات و انتظامات کے اعادہ اور اعتراف کے بعد اُس کے قتل کے واقعہ کی طرف توجہ کی جاتی ہے۔ اُس کی پچھلی تاریخ سے واقف ہونے اور اُسکی سیرت کی خوبیوں کا اندازہ کرنے کے بعد اُس کے قتل کی اہمیت اور اُس کے اثرات کو اچھی طرح سمجھا جا سکتا ہے۔ اور اسی غرض سے یہ تفصیلی حالات دئیے گئے ہیں۔

مصطفیٰ خاں کا قتل جب کشور خاں کی کارروائیوں سے ہر شخص بدظن و خائف ہونے لگا تو کشور خاں کو بھی اپنی جان کی پڑی۔ کسی نہ کسی طرح اُس کے کانوں تک یہ بات پہنچ گئی تھی کہ اُمراء اور اعیان سلطنت میں سے اکثر کی رائے ہے کہ کشور خاں کو معزول کر کے مصطفیٰ خاں کو اُس کی جگہ پیشوا اور متولی بنایا جائے۔ اور اس قسم کی اک درخواست بھی ملکۂ چاند سلطانہ کے پاس گزرانی گئی ہے۔ کشور خاں نے جب یہ گن سن سنی تو اُس نے اپنے بچاؤ کی یہ تدبیر نکالی کہ مصطفیٰ خاں کو ہی قتل کر دیا جائے تاکہ معزولی کا کھٹکا ہی باقی نہ رہے۔ اس غرض سے اُس نے مصطفیٰ خاں کے خلاف اک زبردست سازش کی اور اس میں کامیاب رہا۔ اُس کی تفصیل یہ ہے:-

کشور خاں نے محمد امین نامی شخص کو جو ایک غریب زادہ تھا، نور الدین محمد کے پاس ایک فرمان کے ساتھ روانہ کیا جس پر شاہی مہر لگی ہوئی تھی۔ مہر تو متولی سلطنت ہونے کے اعتبار سے ہمیشہ کشور خاں کے پاس رہتی تھی لہٰذا اُس نے بآسانی ایک فرمان مصطفیٰ خاں کے قتل کی بابت لکھا، اور ملکہ چاند بی بی کی اطلاع کے بغیر اُس پر شاہی مُہر لگا دی، اور اس فرمان کو شخص مذکور یعنی نور الدین کے پاس روانہ کیا۔ نور الدین اتفاق سے ایسی سرشت کا آدمی تھا کہ نمک حرامی اُس پر ختم معلوم ہوتی ہے۔ یہ شخص مشہد کا رہنے والا تھا اور سید بھی تھا۔ مصطفیٰ خاں نے اس کی بڑی مدد کی تھی حوالی بنکاپور میں اُسے جاگیر دے رکھی تھی۔ غرض مصطفیٰ خاں کے اس شخص پر بہت احسانات تھے۔ وہ اپنی ساری ترقی کے لئے

اگر کسی کا ممنون تھا تو وہ مصطفیٰ خاں تھا۔ مگر دنیا کے تاریخ کے آگے اس بدنفس شخص نے اپنے محسن کے تمام احسانات بھلا دیئے، اور مصطفیٰ خاں کے قتل کے معاملہ میں وہ کشور خاں کا ہمخیال ہوگیا محض اس امید پر کہ اس کام کے صلے میں اُسے بہت سی جاگیرات وغیرہ ملجائیں گی۔ جب اُس نے دیکھا کہ مصطفیٰ خاں کی تمام جاگیرات اُس پر بحال کیئے جانیکا وعدہ کیا گیا ہے تو اُس کے مُنہ میں پانی بھر آیا، اور اُس نے نمکحرامی پر کمر باندھ لی بغرض وہ محمد امین کو ہر طرح مدد دینے کے لیۓ تیار ہوگیا۔ فوراً وہاں کے زمینداروں اور نائکوں کو ملانے لگا۔ طرح طرح کے جھوٹے افسانے مصطفیٰ خاں کے خلاف گھڑ کر اُن کو برانگیختہ کیا، اور ساتھ ہی یہ بھی جتلایا کہ اگر پہلے سے ہی تم لوگ اُس کا خاتمہ نہ کردیں تو وہ تم سب کو تہ تیغ کر دیگا۔ غرض اسی قسم کا جھوٹ سچ بک کر اُس نے اہل قلعہ اور اطراف واکناف کے نائکوں کو اُس کا سخت مخالف بنا دیا اور اپنا راستہ ہموار کر لیا۔ ساتھ ہی اُن سے انعامات کے وعدے کئے گئے۔ اس طریقے سے جب اُس کا راستہ صاف ہوگیا تو محمد امین کو اُس نے قلعہ کے اندر بھیجدیا جہاں مصطفیٰ خاں رہتا تھا۔ محمد امین سر شام قلعہ پہنچا اور مصطفیٰ خاں کو پیام دیا کہ وہ اُس کے نام اک شاہی فرمان لایا ہے مصطفیٰ خاں نے یہ سُنکر اُس کا خیر مقدم کیا اور خوب آؤ بھگت کی۔ شب بسری کے لئے مناسب انتظام کر دیا۔ محمد امین نے مصطفیٰ خاں سے کہہ دیا تھا کہ اب رات زیادہ ہوگئی ہے اس لئے صبح ہی کو وہ فرمان اُس کے حوالہ کر دیا جائیگا۔ مصطفیٰ خاں بالکل خالی الذہن تھا، اس لئے اُس کو کچھ شُبہ نہ گزرا۔

جب رات کو سب سو رہے تو محمد امین کو موقع ملا کہ قلعہ کے چند اور نائکوں کو ہموار کرے۔ اُن کو ہزار مکر و حیلہ مصطفیٰ خاں کے قتل پر راضی کر لیا۔ علی الصباح مصطفیٰ خاں نماز فجر کی ادائی میں مشغول تھا کہ یہ موذی چُپکے سے وہاں جا نکلا۔ اور اسی بے خبری کے عالم میں مصطفیٰ خاں پر حملہ کر کے اُس کا وہیں کام تمام کر دیا۔ مصطفیٰ خاں نے تڑپ تڑپ کر جان دی، اس طرح وہ ان مفسدین کی مکاریوں اور حیلہ بازیوں کا شکار ہوا[1]۔

مصطفیٰ خاں کے قتل کی نسبت فرشتہ نے جو قصہ بیان کیا ہے اُسے اوپر قلمبند کیا گیا۔ مگر بساتین کے مصنف نے اس واقعہ کو بالکل دوسرے طور پر بیان کیا ہے۔ بظاہر اس اختلاف کی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی

[1] فرشتہ۔

کیونکہ عموماً بساتین کا مصنف فرشتہ کے بیانات کی تصدیق و توثیق کرتا ہے چونکہ یہ ایک اہم اختلاف ہے۔ مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس واقعہ کو بھی درج کر دیا جائے کشور خاں نے مصطفیٰ خاں کے قتل کے لئے اپنے ہی پانچ چھ امیروں کو ایک فوج دے کر ضلع ملیبار روانہ کیا کہ وہ مصطفیٰ خاں کے استیصال کی فکر کریں اور اُسے قتل کر ڈالیں۔

جب مصطفیٰ خاں کو اس کی خبر ہوئی تو وہ بھی مقابلہ کی تیاریاں کرنے لگا۔ دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ مصطفیٰ خاں کو شکست ہوئی اور وہ فرار ہو گیا۔ اتفاق سے ایک قلعہ کے پاس پہنچا جس پر کوئی ہندو زمیندار قابض و متصرف تھا۔ مصطفیٰ خاں اس قلعہ میں پناہ لینا چاہتا تھا چنانچہ اُس نے اس ہندو زمیندار سے درخواست کی کہ کچھ مدد کرے۔ یہ زمیندار مصطفیٰ خاں کی مدد کے لئے تیار تو تھا مگر چونکہ کشور خاں کی فوج بہت قریب تھی اس لئے قلعہ کا دروازہ کھولنا مناسب نہیں سمجھا کہ کہیں مصطفیٰ خاں کے ساتھ وہ فوج بھی اندر گھس آئے۔ لہٰذا قلعہ کی فصیل سے ایک رسی چھوڑی گئی جس کی مدد سے مصطفیٰ خاں کو اُوپر لینا منظور تھا۔ مصطفیٰ خاں رسی کی مدد سے آدھی دیوار تک چڑھ گیا تھا کہ کشور خاں کے فوجی آ پہنچے اور انھوں نے تیزی کے ساتھ آگے بڑھ کر مصطفیٰ خاں کو اُس کا ایک پاؤں پکڑ کر کھینچ لیا۔ مصطفیٰ خاں نہایت بُری طرح نیچے آ رہا۔ اُس کو گرفتار کر لیا گیا۔ فی الحال اُسے قلعہ بنکاپور میں محبوس کر دیا گیا۔ تھوڑے عرصے کے بعد کشور خاں کے اشارے سے مصطفیٰ خاں کا اسی قلعہ میں خاتمہ کر دیا گیا۔ اس طرح اس نیک نفس، شریف اور خوش سیرت انسان کا نہایت بیدردی کے ساتھ اُن ظالموں کے ہاتھوں قتل عمل میں آیا۔[۱]

علاوہ اُسکی سیرت کی خوبیوں کے وہ ایسے پایہ کا امیر تھا کہ اُس کے قتل سے پوری ریاست میں ایک بے چینی اور ناراضی کی لہر دوڑ گئی۔ وہ عمارت سلطنت کا سب سے زبردست، سب سے قدیم اور سب سے زیادہ اہم ستون تھا۔ ایسے ستون کا منہدم کرنا گویا عمارت کے انہدام کی ابتدا کرنا تھا۔ بس طرح مصطفیٰ خاں کا قتل محض اک شخصی واقعہ ہی نہیں رہا، بلکہ انتہا درجہ کی اُس کو سیاسی اہمیت حاصل ہو گئی اور خصوصاً جو شخص

---

[۱] بساتین السلاطین۔

مصطفیٰ خاں کے قتل کا باعث ہوا تھا وہ محض مصطفیٰ خاں کا دشمن نہیں بلکہ پورے ملک اور پوری ریاست کا دشمن سمجھا گیا کیونکہ کوئی حقیقی بہی خواہ سلطنت وفاداران ریاست کا دشمن نہیں ہو سکتا بہی خواہان ریاست اور ہوا خواہان دولت عادل شاہیہ کی بربادی کا در پے ہونا صاف اس امر کی دلیل تھی کہ سلطنت بیجاپور کی بربادی کا بیڑا اُٹھایا جا رہا ہے۔ غرض مصطفیٰ خاں کے قتل کی خبر جب مشہور ہوئی تو تمام ملک میں ایک سنسنی سی پیدا ہو گئی۔ کیا امیر اور کیا غریب سب یہ محسوس کرنے لگے کہ کشور خاں کے طور ٹھیک نہیں اور اس کے انداز بتا رہے ہیں کہ وہ ریاست کا دشمن ہے۔ قاعدے کی بات ہے کہ جب بُرے سے بُرے آدمی پر بھی بُرا وقت آتا ہے تو دنیا اُس کی بُرائیاں بھول جاتی ہے۔ اور عوام کی ہمدردیاں اُس سے وابستہ ہو جاتی ہیں۔ قتل کیا جانا تو بہت بڑی بات ہے۔ موت اور خصوصاً حسرتناک موت انسان کو بھی پس مردن بڑی حد تک ہر دلعزیز کر دیتی ہے۔ اور لوگ ایسے شخص کو مظلوم شہید اور بزرگ سمجھنے لگتے ہیں۔ تاریخ میں اس کی بیسیوں مثالیں ہیں۔ اک نہایت دلچسپ مثال تاریخ انگلستان میں ملتی ہے۔ چارلس اول جب تک زندہ رہا اک ملعون اور غیر ہر دلعزیز بادشاہ تھا جب یکبارگی اُسے ناانصافی کے ساتھ قتل کر دیا گیا تو پورے ملک میں اک کہرام سا مچ گیا اور تمام قوم کے جذبات اُس کی موافقت میں ایسے اُبھرے کہ وہ اُسے شہید اور بزرگ تصور کرنے لگی چنانچہ جب وہ قتل ہوا ہے تو اُس کے خون میں اکثر لوگوں نے بطور اظہار سعادت اپنی دستیاں اور کپڑے رنگ لئے غرض یہ دنیا کا قاعدہ ہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بُرا آدمی بھی اگر بیدردی سے قتل کیا جائے تو اکثر لوگوں کی ہمدردی اُس کے ساتھ وابستہ ہو جاتی ہے۔ مصطفیٰ خاں اسکے برخلاف اپنے زمانے کا بہترین آدمی تھا۔ اور باوجود اپنی دو چار کمزوریوں کے وہ ملک میں بہت عزت اور وقعت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا تھا۔ اور ملک کا قدیمی خیر خواہ اور محسن تصور کیا جاتا تھا۔ بلا خوف تردید کہا جا سکتا ہے کہ محمود گاواں کو بیدر میں اور چنگیز خاں کو احمد نگر میں جو ہر دلعزیزی حاصل تھی اگر اُس سے زیادہ نہیں تو تقریباً اتنی ہی اُسے اپنی ریاست میں حاصل تھی۔ خاندان شاہی کو اُس پر بڑا اعتماد تھا۔ اور اسے ایک ایسا شخص تصور کرتے تھے جس سے اڑے وقت ہر طرح کی مدد طلب کی جا سکتی ہے۔ اس طریقے سے مصطفیٰ خاں سیاسی طور پر، ذاتی طور پر اور شخصی خوبیوں کی بنا پر ملک میں اک باوقار شخص تھا۔ اور پھر وہ سادات سے بھی تھا عموماً سادات کو عزت کی نگاہوں سے دیکھا

جاتا ہے اور ان کی تعظیم و توقیر کی جاتی ہے۔ اُن کا خون بہانا اک فعل شنیعہ خیال کیا جاتا ہے۔ یہ پرانے احساساتِ خیالات ازمنہ وسطیٰ کی زندگی میں اک زندہ اہمیت رکھتے تھے۔ اس طریقے سے عوام کی نظروں میں جن کی نظر سے اس قتل کی سیاسی اہمیت پوشیدہ تھی یہ فعل اس نقطۂ نظر سے بہت زیادہ قابل نفرت اور لایق ملامت تھا۔ سید کا خون بہانے والے کو وہ یزید اور یزید زادہ سمجھتے تھے اور جو مقتول سید سے ذاتی طور پر واقف تھے وہ اُس کی خوبیوں کو یاد کر کے روتے تھے۔ ایسے نیک نفس آدمی کا قتل اُن کے نزدیک صرف اُسی سے ہو سکتا تھا جو شیطان بصورت انسان ہو، یا جس میں ابلیسیت سرایت کر گئی ہو۔

اُمرا، اور اعیان دولت سب سے زیادہ اس حرکت سے خائف ہوئے۔ کیونکہ جو شخص مصطفیٰ خاں جیسے شخص کے خون سے اپنے ہاتھوں کو رنگنے سے نہ چوکا ہو جو وفاداروں اور بہی خواہوں کا اس طرح دشمن ہو گیا ہو اُس سے اور کیا توقع کی جا سکتی ہے، سوائے اس کے کہ آہستہ آہستہ وہ باقیماندہ اُمرا، و اعیان پر بھی ہاتھ صاف کرنا شروع کرے، جو اُس کا ساتھ دینے کے لئے تیار نہوں۔

غرض ملک کا کوئی طبقہ ایسا نہ تھا جو اس فعل سے سخت ناراض نہوا ہو۔ شاہی خاندان سے لیکر طبقۂ عوام تک، ہر شخص اس ماتم میں شریک ہوا، اور اس قتل کا بانی پورے ملک کا ملعون و معتوب ہوا۔ حقیقت میں کشور خاں نے یہ حرکت ایسی کی تھی جو اصول تدبر سے بہت بعید تھی۔

اس سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اُس میں سیاست دانی اور زمانہ فہمی کی قابلیت قطعاً نہیں تھی جسطرح محمود گاواں کے قتل پر تمام اُمرا اور عوام محمد شاہ سے بیزار اور ناراض ہو گئے اور جس طرح محمود گاواں کا قتل اس کے قاتل یعنی بادشاہ اور اُس کے خاندان کی حکومت کے لئے مہلک ثابت ہوا اسی طرح مصطفیٰ خاں کے قتل سے تمام ملک کشور خاں سے ناراض ہو گیا۔ اور اُس کا یہ فعل خود اس کی بربادی کا موجب ہوا۔

چاند بی بی کا محبوس کیا جانا اس کا پہلے ہی ذکر کر دیا گیا ہے کہ مصطفیٰ خاں کے قتل کا فرمان چاند بی بی کے استمزاج کے بغیر نکالا گیا تھا، اس لئے اندرونی کارروائی سے چاند بی بی قطعاً بے خبر تھیں، جب یہ خبر عام ہوئی کہ مصطفیٰ خاں اس بیدردی کے ساتھ ہلاک کر دیا گیا ہے تو چاند بی بی کو حیرت بھی ہوئی اور غصہ بھی آیا۔ اُس نے کشور خاں کو اس کے اس طرز عمل پر بہت بُرا بھلا کہا اور سختی سے پیش آئی۔ اس کا اثر

تو چاند بی بی کے حق میں بہت مضر ہوا۔ کیونکہ کشور خاں نے اب چاند بی بی کے خلاف کارروائی شروع کر دی۔

کشور خاں کے دل میں یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ چاند بی بی ایک تو مصطفیٰ خان کے قتل کی وجہ سے اُس سے سخت ناراض ہو گئی ہے اور اُس کو سخت سُست کلمات سُنا چکی ہے اور دوسری طرف اُمرار بھی برہم تھے۔ اب ایسے وقت میں کام ادھورا چھوڑنا دشمن کو نیم جان کر کے ہاتھ کھینچ لینا ہے۔ سوئے ہوئے فتنوں کو جگا کر انھیں پوری طرح فنا نہ کرنا انتہا درجہ کی حماقت ہے۔ یا تو اس کارروائی کی طرف قدم اُٹھایا ہی نہ جاتا یا اب تو پہلے زینہ پر قدم رکھدیا گیا ہے تو اُس کو مکمل کر کے چھوڑنے ہی میں خیریت ہے۔ ورنہ مصطفیٰ خاں کے قتل سے ہی پورا ملک اتنا بگڑا بیٹھا ہے کہ اگر ذراسی غفلت کی جائے اور اُمرار کو چاند بی بی سے ایک اتحاد کرنے کی مہلت دی جائے تو پھر جان کی خیر نہیں اس لئے اب جو مصطفیٰ خاں کو قتل کر دیا گیا تو ساتھ ہی چاند بی بی کو بھی مقید کر کے دشمن کو بے دست و پا کر دینا چاہئے تاکہ بادشاہ بالکل اختیار میں آجائے اور اُمرار کو چاند بی بی کی طرف سے کسی قسم کی ہمت نہ رہے۔ اس انتظام کے بعد بھی جو اُمرار سر اُٹھائیں گے اُن سے سمجھ لیا جائے گا۔ کشور خاں کے غالباً یہی خیالات تھے۔ اسی بنا پر اُس نے تہیہ کر لیا کہ فی الحال چاند بی بی کو قید کر دیا جائے۔ علاوہ ازیں وہ چاند بی بی کی طبیعت سے بھی خوب واقف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ چاند بی بی اک مردانہ ہمت رکھنے والی عورت ہے۔ اُس کو حکومت کرنے کا چسکہ لگ گیا ہے۔ وہ حکومت میں کسی کو اپنا شریک نہیں رکھنا چاہتی۔ بہت ممکن ہے کہ اُس کی یہ مرضی ہو کہ ابراہیم کے پردے میں خود حکومت کرے اور متولیانِ ریاست محض اُس کے احکام کی تعمیل کے لئے اس خدمت پر فائز رہیں۔ یہ اندیشہ اس وجہ سے اور بھی بڑھ گیا کہ اس وقت احمد نگر میں یہی صورت حال تھی۔ خونزہ ہمایوں سلطان اپنے بیٹے مرتضیٰ نظام شاہ کی کمسنی سے فائدہ اُٹھا کر خود حکومت کر رہی تھی۔ اور اُس کا یہ مقصد تھا کہ نام تو مرتضیٰ کا رہے لیکن حقیقی حکومت کرنیوالی وہی ہو۔ کشور خاں ڈر رہا تھا کہ کہیں چاند بی بی اسی سرشت کی عورت نہ ہو۔ اگر صورت حال ایسی پیدا ہو جائے تو حکومت کے دو دعویدار ہو جاتے ہیں۔ ایک تو خود کشور خاں جس کے ہاتھ میں اس وقت اقتدار تھا، دوسرے چاند بی بی۔ جہاں قوت و طاقت کے دو دعویدار ہوں اختلاف کا پیدا ہونا لازمی ہے۔ اسی بنا پر ہم دیکھتے ہیں کہ کچھ تو واقعات کے رنگ ڈھنگ کی بنا اور کچھ غلط فہمیوں کی وجہ سے چاند بی بی اور کشور خاں کے درمیان مخالفت پیدا ہو جاتی ہے۔

ان اختلافات اور ان اندیشوں کی بنا پر کشور خاں نے یہ ٹھان لیا کہ قبل اس کے کہ چاند بی بی دوسرے اُمرا سے ملکر اُسے نکالنے کی تدبیر کرے (جیسے کہ اُس نے کامل خاں کو خود اُس کے ہاتھوں نکلوایا تھا) اُس کا زور توڑ دینا چاہیئے۔ اور اُس زور کے توڑنے کی نہایت آسان ترکیب یہی تھی کہ کچھ عرصے کے لئے اُسے حکومت سے بے دخل کر کے نظر بند یا محبوس کر دیا جائے۔ اس طرح اُس کا رہا سہا دشمن جو اُس کے لئے مار آستین ہے وہ بھی بیدست و پا ہوجاتا ہے اور جب وہ یکبارگی چاند بی بی پر قابو پالے تو ملک اور ملک والوں کی کیا مجال کہ اُس کا مقابلہ کر سکیں۔ مگر یہاں کشور خاں نے پھر غلطی کی جس طرح اُس کا خیال تھا کہ مصطفیٰ خاں کے قتل سے اُس کے نام کی دہشت لوگوں کے دلوں پر ایسی بیٹھ جائے گی کہ کسی کو اُس کے مقابلے کی تاب نہ رہے گی اسی طرح اب وہ سمجھتا تھا کہ چاند بی بی کو قید کرنے سے وہ اپنی تدبیر کی کڑیوں کی تکمیل کر رہا ہے۔ حالانکہ یہ حرکت ایسی تھی جو اہل ملک کے صبر کے پیالہ کو لبریز کر دینے والی ثابت ہوئی۔ کشور خاں گو اپنے نزدیک سمجھ رہا تھا کہ اس کارروائی سے وہ اپنے آپ کو مستحکم کر رہا ہے لیکن حقیقت میں اُس کے اقتدار کی جڑیں اندر سے کھوکھلی ہوتی جارہی تھیں اور خود یہ حرکتیں اُس کے زوال کا باعث ہونیوالی تھیں۔

غرض مصطفیٰ خاں کے قتل کے بعد کشور خاں کا دوسرا اہم کام چاند بی بی کا قید کرنا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ اپنی اس غلط پالیسی میں (جس کو وہ اپنی استحکامی پالیسی سمجھا ہوا تھا) اتنی دور نکل چکا تھا کہ اُس کو بدلنا یا اُس میں تبدیلی کرنا قطعاً ناممکن تھا۔ صرف ناممکن ہی نہیں بلکہ یہ چیز خود اُس کے لئے مہلک ثابت ہوئی۔ اگر کشور خاں یہ سمجھتا بھی کہ اُسکی اختیار کردہ پالیسی کو قائم رکھنے اور آگے بڑھانے سے خود اس کا نقصان ہوگا تو ساتھ ہی وہ یہ بھی محسوس کر لیتا کہ اُس کا اس پالیسی کو اس زینہ پر ترک کر دینا بھی باعث ہلاکت ہوگا۔ کیونکہ مصطفیٰ خاں کے قتل اور اُس کی عام پالیسی سے ملک اس قدر ناراض ہے کہ یہی اسباب اُس کی بربادی کے لئے بہت کافی ثابت ہوں گے۔ اگر چاند بی بی کو اپنے حال پر چھوڑ دیا جاتا تو اس سے کشور خاں کے حق میں کچھ اچھے نتائج برآمد نہ ہوتے۔ اور وہ اپنی گزشتہ کارروائیوں کی سزا بھگتے بغیر نہ رہتا۔ بلکہ اُلٹے اُس کی بربادی بہت جلد عمل میں آتی۔ اُمرا اور چاند بی بی متحد ہو جاتے اور اُس کی ان سب غلط کارروائیوں کا مواخذہ کرتے۔ اسلئے اس لئے اُس کے نزدیک یہ بھی بیوقوفی تھی کہ یہاں تک پہنچکر اب عین وقت پر دشمنوں کو موقع دیدیا جائے کہ

اُس کے خلاف جو چاہیں کریں۔ اِس خیال کی حد تک کشور خاں کا اندازہ ٹھیک تھا چاند بی بی کو اگر کشور خاں قید نہ کرتا تو خود چاند بی بی اُس کو اِس طرح نکلوا دیتی جیسے کہ کامل خاں کو اُس نے نکلوایا تھا۔ اُمرا تو محض اُس کے اشارے کے منتظر ہی تھے۔ اگر ذرا اشارہ پاتے تو وہ کشور خاں پر بھوکے شیروں کی مانند ٹوٹ پڑتے۔ لہٰذا کشور خاں نے چاند بی بی کو جو قید کیا وہ ایک طریقے سے اپنی حفاظت کے لئے تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ فی الحال دشمن کو قابو میں تو کر لیا جائے اس کے بعد جو کچھ اُلٹ پڑے اُس کا تصفیہ کر لیا جائے گا۔ غرض چاند بی بی کا قید کیا جانا کشور خاں کی اختیار کردہ پالیسی کے لازمی نتائج میں سے تھا۔ وہ اگر اُس کو ٹالنا بھی چاہتا تو اُس وقت تک نہ ٹال سکتا جب تک کہ اُس کی مرضی یہ نہ ہو کہ خود اپنے ہاتھوں وہ اپنے مخالفین کے پنجہ میں پھنس جائے۔

اب چاند بی بی کے قید کرنے کے لئے کسی بہانہ کی ضرورت تھی۔ مثل مشہور ہے کہ "حیلہ جو را بہانہ بسیار" اس نے چاند بی بی کے سر یہ اتہام لگایا کہ وہ اپنے بھائی نظام شاہ سے خفیہ مراسلت کرتی ہے اور بیجا پور کے حالات سے اُسے آگاہ رکھتی ہے۔ اُس کا مقصد یہ ہے کہ بیجا پوری سلطنت نظام شاہیوں کے زیر اثر آجائے۔ غرض اس طرح جھوٹی باتیں مشہور کر کے اس امر کی کوشش کی گئی کہ چاند سلطانہ کو غدار اور ملک فروش ثابت کیا جائے۔ یہ محض عوام کے جذبات کو بھڑکانے کی ترکیب تھی اور غایت یہ تھی کہ ملک چاند سلطانہ کا مخالف بن جائے، اور اُس کے قید کئے جانے کو اک حق بجانب فعل تصور کرے۔ مگر ملک کشور خاں سے خوب واقف ہو گیا تھا۔ وہ اُس کی ان دھوکہ بازیوں کے سننے کے لئے تیار نہ تھا جب کشور خاں نے چاند بی بی پر یہ اتہام لگایا اور ساتھ ہی حکم دیا کہ اُس کو قید کر کے قلعۂ ستارہ بھیجد یا جائے تو پورے ملک میں اک کہرام سا مچ گیا کیونکہ یہ حرکت بالکل ایسی تھی کہ جس کی مثال عادل شاہی خاندان کی تاریخ میں ملنی مشکل تھی۔ کمال خاں نے یقیناً بغاوت کی ٹھانی تھی۔ اسمٰعیل (عادل شاہ) اور اُس کی والدہ بوبوجی خانم کو عملی طور پر تھوڑے عرصے کے لئے ایک حد تک نظر بند کر رکھا تھا۔ مگر اُس کی غداری محض اُس کے خیال تک رہی مکمل عملی جامہ پہننے نہ پائی تھی کہ اُس کا خاتمہ ہو گیا۔ اسی طرح کامل خاں نے چاند بی بی کی شان میں گستاخی اور بے ادبی کی تھی مگر اب تک کسی کی ہمت نہ ہوئی تھی کہ خاندان شاہی کے کسی بچہ کی بھی یوں عزت ریزی کرے اور اُس کے ساتھ ایسا ذلیل سلوک کرے۔ حرم شاہی کے لونڈیوں کی بھی عزت کی جاتی تھی۔ یہ تو ملکہ ہوئی، اور ملکہ بھی ایسی باعظمت و باوقار

کہ اُس کی سطوت وشوکت کا سکہ نہ صرف اہل دکن کے دلوں پر بیٹھا ہوا تھا بلکہ اُس کی شہرت کے آوازے شمالی ہند میں اکبر کے دربار تک پہنچ چکے تھے۔ علاوہ بریں اُس کی ہردلعزیزی کا یہ عالم تھا کہ وفادار اور جاں نثاران سلطنت جہاں اُس کا پسینہ ٹپکے لہو بہانے کے لئے تیار تھے۔ اُس کی یہ ہردلعزیزی کچھ بےمعنی بھی نہ تھی۔ اُس نے اپنی پوری زندگی کو اپنے ملک اور اپنی سلطنت کی خدمت کے لئے وقف کر رکھا تھا۔ اُسکے ان گنت احسانات ملک اور اہل ملک پر تھے۔ اُسی کے سایۂ عاطفت میں اس ریاست کا اک ہونہار بادشاہ پرورش پا رہا تھا۔ غرض یہ وہ عورت تھی جس کی شجاعت، فراست، تدبیر اور دانائی نے پورے ملک کے دل کو موہ لیا تھا اور جو حقیقت میں ریاست بیجاپور کی اک بڑی محسن تھی۔ کشور خاں نے اپنی انتہائی بیوقوفی کا ثبوت دیا کہ اک ایسی باعظمت اور ہردلعزیز ملکہ کی گرفتاری اور حبس کا حکم دیا۔ یہ دوسری کلھاڑی تھی غالباً پہلے سے تیز تر جو اُس نے اپنے پیر پر ماری۔

جب محل کے خواجہ سراؤں کو حکم ملا کہ چاند سلطانہ کو محل میں گرفتار کر کے ستارہ روانہ کیا جائے تو بھلا خواجہ سراؤں اور ادنیٰ ملازموں کی کیا ہمت کہ ایسی ملکہ کو گرفتار کر سکتے۔

جب کشور خاں نے دیکھا کہ کام یوں آسانی سے نکلتا نظر نہیں آتا تو اُس نے اپنے خاص ملازمین روانہ کئے کہ محل سے چاند سلطانہ کو نکال کر باہر لائیں۔ یہ ظالم ملکہ کو کشاں کشاں بصد ذلّت ورسوائی حرم شاہی کے دروازے تک لائے۔ اور یہاں سے وہ کشور خاں کے حکم سے ستارہ روانہ کر دی گئی۔[1] اور پھر اس پر طرّہ یہ ہوا۔ اُس نے حرم سرا کی کنیزوں اور لونڈیوں کو بھی نکال دیا۔ اور یہ عورتیں ملکہ چاند بی بی کی پالکی کے ساتھ برہنہ سر و برہنہ پا بہ حال تباہ

---

[1] فرشتہ اس واقعہ کی بابت یوں رقمطراز ہے کہ "در حق چاند سلطانہ تہمتی وافترائی اندیشیدہ گفت ہمیشہ اخبار این طرف را بہ برادر خود نظام شاہ نوشتہ بر تسخیر ممالک عدالت پناہ تحریص و ترغیب می نماید صواب آنست کہ او را چندگاہ در قلعہ ستارہ نگاہ داریم و بعد از فراغ از مہم مرتضیٰ نظام شاہ باز بہ شہر و آوریم۔ وچوں چاند سلطانہ در بیروں آمد ان از حرم سرا متکابل وزرید کشور خاں خواجہ سرایان و عورات خانۂ خود را بدروں فرستادہ کشاں کشاں آں مہد علیہ را بیروں آوردند و در پالکی نشانیدہ روانہ قلعہ ستارہ گردانیدند۔"
تاریخ فرشتہ ص ۱۸۔

گریہ وزاری کرتی اور کشور خاں کو برا بھلا کہتی جاتی تھیں۔ دن کے وقت شہر کے گلی کوچوں میں نازنینان حرم کو اس طرح نکال باہر کرنا اور انھیں محبوس کرنے کے لئے ستارہ روانہ کرنا یہ ایک ایسی حرکت تھی جس سے شہر والوں کے دل ہل گئے۔ ان عورتوں کی بیکسی اور بے بسی کا یہ ایک ایسا عبرتناک منظر تھا کہ دیکھنے والوں کی آنکھوں میں خون اتر آیا ہوگا۔ سنگدل سے سنگدل شخص بھی ان عورتوں کی گریہ وزاری کے ساتھ اپنی آنکھوں کو تر کئے بغیر نہیں رہ سکتا تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ عورتیں نہیں رو رہی تھیں بلکہ ان کے ساتھ پورا ملک رو رہا تھا۔ مگر چونکہ طاقت اُن کے ہاتھ میں نہ تھی لہٰذا خون کے گھونٹ پی کر خاموش تھے اور محض موقع کے متلاشی تھے کہ ان ستمرانیوں کا بدلہ لیا جائے۔ صاحب بساتین نے سچ کہا ہے کہ "آں روز در شہر مصیبتی بود کہ از مصیبت روز علی عادل شاہ بدتر"[1] پورا ملک اک ماتم کدہ بنا ہوا تھا۔ اس ظلم کا نتیجہ یہ ہوا کہ کشور خاں ملک میں سخت بدنام ہوگیا اور لوگ اُس سے نفرت کرنے لگے۔ مصطفیٰ خاں کا قتل اور چاند بی بی کا قید کیا جانا ہی کسی ایک شخص کو جو ان افعال کا باعث ہوا ہو غیر ہر دلعزیز بنانے کے لئے بہت کافی تھا۔ مگر کشور خاں نے ان بیہودگیوں کو یہیں ختم نہیں کیا بلکہ اپنی بعد کی بعض حرکات سے اپنے کو اور بھی زیادہ قابل نفرت ثابت کر دیا۔

چاند بی بی کے نکالے جانے کے بعد اُس نے یہ حکم صادر کیا کہ محل میں جتنی عورتیں ہیں (جو علی عادل شاہ کے زمانے میں بغرض عیاشی جمع کی گئی تھیں) اُن کے عقد ثانی کر دئے جائیں۔ حرم شاہی کی بعض کنیزوں اور خدمتگاروں کو اپنے متعلقین کے سپرد کر دیا۔ فی الواقع اگر دیکھا جائے تو یہ فعل اُس کا اتنا بُرا نہ تھا بلکہ ایک حد تک جائز اور شرعی۔ انصاف کا خون کئے بغیر یہ ناممکن ہے کہ کشور خاں کے اس فعل پہ کسی قسم کا اعتراض کیا جائے یا اُس کی اس حرکت پر اُسے مجرم قرار دیا جا سکے خواہ اخلاقی اور اصولی نقطۂ نظر سے کشور خاں کی یہ حرکت کتنی ہی حق بجانب کیوں نہ ہو لیکن اُس کے لئے یہ بھی مُضر ثابت ہوئی۔ فی نفسہٖ بعض افعال نہایت اچھے ہوتے ہیں لیکن سیاسی اعتبار سے اُن کے نتائج مُضر مترتب ہوتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی یہی ہوا۔ کشور خاں کی اس حرکت کو اہل ملک نے اس پر محمول کیا کہ خاندان شاہی کو وہ ذلیل کرنا چاہتا ہے۔ عوام الناس کے نزدیک یہ ایک

---

[1] بساتین السلاطین بستان پنجم۔

ایسا فعل تھا کہ جس کی نظیر ملنی مشکل تھی۔ انھوں نے اپنے بادشاہ کے خاندان کی اس میں تحقیر دیکھی کہ شاہی حرم کی عورتیں معمولی عورتوں کی طرح یوں غیروں کے حوالے کر دئے جائیں۔ یوں بھی کشور خاں بدنام ہو چکا تھا اس کا یہ فعل اس کی بدنامی کے لئے سونے پر سہاگہ ہو گیا انھی واقعات کے ضمن میں کشور خاں سے وہ حرکت بھی سرزد ہوئی جس کا باب دوم میں تفصیلاً تذکرہ کیا گیا جواہرات والا قصہ بھی اپنے اثرات پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکا اور اس واقعہ سے بھی لوگوں کو خیال پیدا ہو گیا کہ کشور خاں کو ادب شاہی کچھ ملحوظ نہیں رہا ہے۔ غرض یہ چھوٹی چھوٹی حرکتیں جو بجائے خود کوئی اہمیت نہیں رکھتیں اُن واقعات کے ساتھ ملکر جن سے ملک سخت ناراض ہو چکا تھا کشور خاں کی بدنامی اور اس کی بربادی کا باعث ہوئیں۔ اس کا اندازہ لگانے کے لئے کہ ملک کو کشور خاں سے اس وقت کس درجہ نفرت تھی یہ بیان کر دینا کافی ہوگا کہ جب شہر میں کشور خاں بادشاہ کے ہمراہ نکلتا تو عورتیں اُس کو سر بازار کوستی، گالیاں دیتیں اور لعنت و ملامت کرتی تھیں، اور یہ علانیہ کہتی تھیں کہ یہ وہی موذی ظالم اور یزید ہے جس نے کہ شاہی خاندان پر ایسے مظالم توڑے۔ چاند بی بی جیسی خیر خواہ سلطنت عورت کو جھوٹا الزام لگا کر قید کیا اور مصطفیٰ خاں جیسے بزرگ اور نیک نفس سید کو قتل کیا اور اب ملک کی بربادی کا درپے ہے۔ غرض کشور خاں کے ظالمانہ طرز عمل کی بنا پر ملک کا ہر شخص اُس کا مخالف ہو گیا تھا۔

فوج کو قابو میں لانے کی تدابیر

ملک میں غیر ہر دلعزیزی کا تو یہ عالم تھا لیکن کشور خاں اپنی دانست میں یہ سمجھے ہوئے تھا کہ وہ اپنی استحکامی کارروائیوں میں مصروف ہے اور انھیں بڑی کامیابی کے ساتھ تکمیل کو پہنچا رہا ہے کیونکہ جن جن لوگوں کی جانب سے اُسے خطرہ تھا اُن سے میدان صاف ہو گیا تھا۔ اب پورا اقتدار اُس کے ہاتھ میں تھا۔ کوئی ہستی ایسی نہ تھی جس کی طرف سے کسی قسم کا اندیشہ ہو۔ مصطفیٰ خاں اور چاند بی بی دو بڑے دشمن تھے۔ اُن میں ایک کو تو گوشۂ لحد میں سلا دیا گیا، دوسرے کو جیل خانہ کی

لہ۔ ملاحظہ ہو باب دوم مقالۂ ہذا۔ کشور خاں کا والدۂ ابراہیم کے پاس معمولی جواہرت کا بھیجنا اور اُن کی خفگی۔

ہوا کھلائی گئی۔ اب رہ گئے اُمرا اور وہ سرداران فوج جو اس وقت شاہ درگ میں اپنی فوجیں لئے ہوئے پڑے تھے اور دارالسلطنت کے ان واقعات کا خاموشی کے ساتھ مطالعہ کر رہے تھے۔ یہ لوگ محض اس فکر میں تھے کہ دیکھئے اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے اور کشور خاں کی یہ نیرنگیاں بالآخر کیا رنگ لاتی ہیں۔

اب اس وقت ضرورت اس امر کی تھی کہ اُن اُمرا کو راضی کر لیا جائے۔ کیوں کہ جب فوج قبضہ میں آجائے گی تو پھر کشور خاں کا ہی راج ملک میں رہے گا۔ بادشاہ تو کمسن ہے جن اُمرا سے مخالفت کا اندیشہ ہے انھیں قتل کر دیا جا سکتا ہے اور جو ساتھ دینے پر آمادہ ہوں اُن کی مزید تالیف قلوب کی جائیگی اور اُن کے ساتھ نہایت اچھا سلوک کیا جا سکتا ہے، پھر تو کشور خاں من مانے حکومت کر سکتا ہے اور اپنا راج منا سکتا ہے۔ کونسی ایسی چیز رہ جاتی ہے جس کے لئے وہ بے چین و بیقرار رہے۔ کشور خاں کی یہ پالیسی تھی، چونکہ اب اُسے محض فوج کی جانب سے کھٹکا تھا وہ اُس کی طرف متوجہ ہوا۔ وہ یہ ضرور جانتا تھا کہ یہ اُمرا اور سردار پہلے سے ہی بگڑے بیٹھے ہیں۔ اور انھی میں سے بعضوں نے چاند سلطانہ کو یہ صلاح دی تھی کہ مصطفیٰ خاں کو طلب کر کے کشور خاں کی جگہ اُسے فائز کر دیا جائے۔ اب انھیں لوگوں سے سابقہ تھا جو اُس کے خون کے پیاسے تھے۔ فوج کو قابو میں لانے کی جو تدابیر اُس نے اختیار کیں وہ یقیناً شاطرانہ نقطۂ نظر سے دانشمندانہ تھیں۔ مگر کشور خاں کی یہ بدنصیبی تھی کہ اُس کا تیر نشانہ پر نہ لگا۔

اس کا تو پہلے ذکر کر دیا گیا ہے کہ کشور خاں کے اقتدار کے ابتدائی زمانے میں بیجاپور کی سرحد پر نظام شاہی اور قطب شاہی حملے ہو رہے تھے۔ ان کی روک تھام کے لئے ایک فوج روانہ کی گئی جس میں افضل خاں، عین الملک، آنکس خاں، اخلاص خاں، حمید خاں اور رولا ور خاں جیسے پایہ کے اُمرا موجود تھے۔ ان لوگوں نے غنیم کا مقابلہ کیا اور شکست بھی دی۔ اور شاہ درگ کے قلعہ میں ستانے کی غرض سے فوجیں لئے پڑے تھے۔ اور ساتھ ہی پایۂ تخت میں کشور خاں نے جو اودھم مچا رکھی تھی اُس کا بھی بہ غور مطالعہ کر رہے تھے اور اس پس و پیش میں تھے کہ کیا کیا جائے۔ آیا پہلے بیجاپور کی طرف متوجہ ہو کر کشور خاں کے اختیارات سلب کر لئے جائیں اور اُسے معزول کر دیا جائے یا پہلے پورے طور پر غنیم کو آخری شکست دیکر پایۂ تخت کی طرف توجہ کریں۔ اگر اُن کو سید مرتضیٰ سر لشکر برار کے حملے کا اندیشہ نہ ہوتا تو غالباً پہلے وہ بیجاپور کی طرف توجہ کرتے۔ مگر بار ہا اُن کو خبریں پہنچ چکی تھیں کہ ایک زبردست فوج کے ساتھ بہزاد الملک کی شکست کا بدلہ لینے کے لئے سید مرتضیٰ بیجاپور کی طرف قدم اُٹھانے والا ہے۔ اسی فوج کی آمد کے

انتظار میں وہ شاہ درگ میں ٹھیرے ہوئے تھے۔ اسی عرصہ میں دارالسلطنت بیجاپور میں وہ تغیرات اور تبدیلیاں ہو رہی تھیں جن کا پچھلے صفحوں میں ذکر کیا گیا۔ ان متوحش خبروں کو سُنکر یہ اُمرا اور بھی پریشان اور سراسیمہ ہو رہے تھے۔ اُنکی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا طرزِ عمل اختیار کیا جائے۔ یہ بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ عین اُس وقت پر جبکہ غنیم کے اک زبردست حملے کا اندیشہ ہو سرحد کو غیر محفوظ چھوڑ کر پایہ تخت کے حالات درست کرنے کی غرض سے چل کھڑے ہوں۔ اگر وہ ایسا کرتے تو اُن کو کشور خاں سے باقاعدہ مقابلہ کرنا پڑتا اور یہ بھی یقینی ہے کہ بغیر تلوار آزمائی کئے کشور خاں کبھی ہار نہ مانتا۔ اس طرح اک خانہ جنگی کی صورت پیدا ہو جاتی۔ اگر اس خانہ جنگی کے وقت نظام شاہی فوج بیجاپور میں آدھمکے تو اندرونی فساد اور بیرونی حملے سے ریاست کی جو گت بنتی اُس کا اندازہ کرنا کچھ مشکل نہیں۔ اور پھر یہ بھی اندیشہ تھا کہ اگر ایسی صورت حال پیدا ہو جائے تو کشور خاں چاروں طرف سے مایوس ہو کر ممکن ہے خود سید مرتضیٰ سے مل جائے۔ اگر کشور خاں حملہ آور دشمن سے مل گیا تو کیا کیا آفتیں ملک پر نازل ہوں، مثل مشہور ہے "گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے"۔ اس طرح یہ دونوں دشمن مل کر بیجاپوری افواج کا چند گھنٹوں میں اگر خاتمہ کر دیں تو کوئی تعجب کا مقام نہیں۔ غرض ان اندیشوں کی بنا پر اُمرا اور سرداران فوج نے مناسب نہ سمجھا کہ شاہ درگ سے باہر قدم رکھیں۔ حالانکہ متوحش سے متوحش خبریں پایہ تخت سے چلی آ رہی تھیں۔ مصطفیٰ خاں کے قتل کی خبر انھوں نے سُنی، چاند بی بی کے قید کئے جانے کا حال معلوم کیا، کنیزان حرم کے ساتھ جو سلوک کیا گیا اُس کی بھی کیفیت انھیں مل گئی۔ غرض دارالخلافہ کی رتی رتی کی خبر سے وہ آگاہ تھے لیکن پھر بھی کچھ کرتے دھرتے بن نہ پڑتی تھی۔ کوئی ایسا موقع ہاتھ نہ آتا تھا کہ جس سے فائدہ اُٹھا کر اس بگڑی ہوئی صورت حال کو اپنے قابو میں کریں۔ بالآخر اُن کو یہ موقع مل گیا کیونکہ کشور خاں کو چاند بی بی سے فراغت حاصل ہو گئی تو اُس نے فوج کی طرف اپنی توجہ منعطف کی۔ اُس کی تدبیر یہ تھی کہ کسی طرح فوج کو اپنے قابو میں کر لے۔ اور آسانی سے قابو پانا ممکن نہ تھا اس لئے اُس نے اک شاطرانہ چال اختیار کی کہ اُن سرداران فوج کو گرفتار کر لے جو اس وقت اُس کے مخالف ہو چکے تھے۔

کشور خاں کی شاطرانہ چال کشور خاں نے اپنے اک ہوا خواہ امیر کو جس کا نام میاں بدھو دکنی تھا سپہ سالار فوج بنا کر شاہ درگ روانہ کیا، افسر فوج کو بدلنے کا مقصد یہ تھا کہ جو سردار اور اُمرا اُس کے خلاف ہو گئے ہیں یا بغاوت پر

آمادہ ہیں نئے سپہ سالار کی ماتحتی میں اپنا رنگ اور اپنا طرز بدل ڈالیں جب سرلشکر یا سپہ سالار ایسے شخص کو مقرر کر دیا جائے کہ جس کی وفاداری پر اُسے کامل اطمینان ہو تو پھر دوسرے سرداروں کی اتنی ہمت نہ ہو گی کہ اپنے افسر کے احکام کے خلاف اُس سے مخالفت کرنے کے لئے تیار ہو جائیں۔ لیکن وہ یہ نہیں جانتا تھا کہ جو سرداران فوج اُس کے مخالف ہو گئے ہیں، بھلا اُس کے مقرر کردہ سرلشکر کو تسلیم ہی کیوں کرنے لگے۔ اس کا نتیجہ اگر کچھ ہو سکتا تھا تو یہی کہ فوج اُس کی اور مخالف ہو جائے۔ چنانچہ جب میاں بدو اک بڑی فوج کے ساتھ اس سرحدی فوج کو قابو میں لانے کے لئے چل کھڑا ہوا تو ادھر وہ سرداران لشکر بھی ہشیار ہو گئے جو شاہ درگ میں تھے۔ بظاہر میاں بدو کی روانگی اس غرض سے تھی کہ سرحدی فوج کو مدد پہنچائی جائے لیکن اُس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ مختلف طریقوں سے وہاں کے سرداروں کو ہمنوا اور ہمخیال بنا لیا جائے۔ اور انھیں کشور خاں کی حکومت سے راضی کرلے جو اُمراء اور سردار بالکل مخالفت پر کمربستہ نظر آئیں انھیں کسی نہ کسی حیلے قید کر لیا جائے۔ میاں بدو کو کشور خاں کی طرف سے یہ سخت تاکید تھی کہ حبشی اُمراء[1] کو قابو میں لانے کے لئے کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا جائے، کیونکہ اس وقت ان کی جانب سے اُس کو سخت خطرہ تھا، اور وہ آمادۂ فساد معلوم ہوتے تھے۔ ان کا اس وقت فوج پر اثر و رسوخ بھی بہت بڑھ گیا تھا۔

غرض جب میاں بدو اپنی فوج اور اپنی سرلشکری کے فرمان کے ساتھ شاہ درگ پہنچا تو سرداروں نے اُس کا بڑے تپاک سے استقبال کیا۔ بہت ممکن ہے اُس وقت تک ان سرداروں کو میاں بدو کے روانہ کئے جانے کی اصلی غرض و غایت سے واقفیت نہ ہو، اور وہ یہی سمجھتے ہوں کہ یہ فوج امداد کے لئے یہاں آئی ہے۔ اب رہا میاں بدو کا سرلشکر مقرر کیا جانا سو مرکزی حکومت کو اختیار کامل ہے کہ جس کو چاہے سپہ سالار اور سرلشکر مقرر کر دے عموماً جنگ کے زمانے میں ایسے انتظامات غیر معمولی نہیں سمجھے جاتے، یا اگر ان سرداران لشکر کو میاں بدو کی جانب سے کچھ شبہ بھی ہوتا تو یہ بات دانائی اور عقلمندی سے دور تھی کہ بجائے اس کے استقبال کے اُس کی مخالفت پر وہیں کمربستہ ہو جائیں خصوصاً ایسی صورت میں جبکہ غنیم کچھ دور نہ ہو۔ ان وجوہات کی بنا پر میاں بدو کی

---

[1] اخلاص خاں، حمید خاں، دلاور خاں جو بعد میں "اتحاد ثلاثہ" قائم کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

فی الحال کچھ مخالفت نہ کی گئی بلکہ اُس کی خوب آو بھگت کی گئی۔

میاں بدو نے شاہ درگ پہنچ کر اپنی اصلی کارروائی شروع کر دی۔ اور مختلف سرداروں کو کشور خاں کے موافق بنانے لگا جو اُس کے مخالف ہو گئے تھے۔ بڑی حد تک اُس کو ان کوششوں میں کامیابی بھی ہوئی۔ عین الملک اور آنکس خاں بالکل اُس کے ہمخیال ہو گئے۔ اور اس کی مدد پر بھی آمادہ تھے۔ اُمرائے حبش اب باقی رہ گئے تھے۔ ان کو اپنا موافق کرنا یا قابو میں لا لینا کوئی آسان کام نہ تھا۔ میاں بدو کو توقع نہ تھی کہ اُس کا ساتھ دینے پر وہ تیار ہو جائیں گے۔ اسی اثنا میں کشور خاں نے ایک شاہی فرمان میاں بدو کے نام روانہ کیا کہ حبشی اُمرا کو کسی نہ کسی بہانہ گرفتار کر کے شاہ درگ میں محبوس کر دیا جائے۔ کیونکہ یہ لوگ شاہی فرامین کی تعمیل سے انکار کر رہے ہیں اور احکام کے مطابق نظام شاہی فوج پر حملہ کرنے میں تساہل کر رہے ہیں۔ جب یہ مزید احکام میاں بدو کے پاس پہنچے تو وہ اور سرگرمیوں کے ساتھ اپنی کارروائی میں مشغول ہو گیا اور اسی فکر میں تھا کہ کسی طرح ان حبشیوں کو گرفتار کرے۔ خبر کے پھیلتے دیر نہیں لگتی۔ اُمرائے حبش کو بھی اس کا علم ہو گیا کہ میاں بدو انھیں قید کر کے کشور خاں کے حوالے کرنا چاہتا ہے۔ اس نیت سے آگاہ ہوتے ہی حبشی اُمرا نے ایک ایسی چال چلی کہ جس سے شکاری خود شکار ہو گیا۔ اور اُلٹے میاں بدو اُن کے قبضہ میں آ گیا۔

اُمرائے حبش کی تدابیر اور میاں بدو کا قید ہونا۔ اخلاص خاں حبشی نے یہ بات مشہور کروا دی کہ بیجاپور سے اُسے خبر آئی ہے کہ اُسے اک لڑکا پیدا ہوا ہے۔ اس خوشی میں اُس نے اک جشن ترتیب دیا جس میں تمام افسران فوج کو دعوت دی گئی تھی۔

میاں بدو کو بطور خاص مدعو کیا گیا تھا۔ اس نے نہایت سادہ لوحی اور سادگی کے ساتھ اخلاص خاں کی دعوت قبول کر لی اور حبشیوں کے دھوکے میں آ گیا اور شریک مجلس ہوا۔ یہ محفل عیش کاہے کو تھی اچھی خاصی سازش تھی۔ پہلے سے ہی پورے انتظامات کر دئیے گئے تھے۔ اور کسی کو کانوں کان خبر نہ تھی۔ صرف چند ساتھیوں اور مقربوں کے ساتھ جب میاں بدو اخلاص خاں کے ڈیرے میں پہنچے تو اُس نے نہایت آسانی سے اُن کو اور اُن کے ساتھیوں کو وہیں گرفتار کر لیا۔ اور پھر اُن کو شاہ درگ میں قید کر دیا۔ جب اصل مُہرہ اس طرح اُن کے قبضے میں آ گیا تو پھر شطرنج کی پوری پوری بازی اُن کے ہاتھ تھی۔ میاں بدو سے فراغت حاصل کر کے حبشی اُمرا نے اُن سرداروں کیطرف توجہ کی جو کشور خاں کے عزیز یا موافق تھے۔ چنانچہ کشور خاں کے بیٹے کمال خاں سرنوبت اور مغل خاں

برادر کشور خاں کو جو سرخیلی کے عہدہ پر مامور تھا قید کر دیا گیا۔ اس کے بعد اخلاص خاں مع اپنے ساتھیوں اور فوج کے بیجاپور کی طرف روانہ ہوا۔

میاں بدو کے قید ہو جانے اور مغل خاں اور کمال خاں کی گرفتاری کے معنی یہ تھے کہ کشور خاں کے عروج کا زمانہ ختم ہو گیا۔ اور اُس کا اقتدار اُس کے ہاتھ سے نکل گیا۔ اب اس اقتدار کا محور و مرکز وہ شخص ہو گیا جس کے ہاتھ میں فوج تھی۔ اسی وقت سے حبشیوں کا عروج شروع ہوتا ہے۔ چونکہ اخلاص خاں اس وقت ان حبشی اُمراء میں زیادہ سربرآوردہ اور ذی اقتدار تھا اسی لئے وہ کشور خاں کو بالآخر معزول کر کے حکومت کے سب سے بڑے عہدہ پر قابض ہو جانے میں کامیاب ہوا۔ غرض اخلاص خاں نے اب یہاں سے کوچ کر دیا اور منزل بہ منزل نہایت سرعت کے ساتھ عازم بیجاپور ہوا۔ جب یہ فوج کوچ کر کے بیجاپور کی طرف چلی تو وہ اُمراء جو میاں بدو کی سازشوں سے کشور خاں کے موافق ہو گئے تھے جن میں عین الملک اور آنکس خاں قابل ذکر ہیں چپکے سے اصلی فوجوں سے علٰحدہ ہو کر اپنی اپنی جاگیروں کو چلدئے۔

ادھر تو یہ کارروائی ہوئی اور اُس طرف کشور خاں کو ان حالات کا علم ہو گیا۔ اُسے معلوم ہو گیا کہ اُس نے فوج کو قابو میں لانے کی جو تدبیر کی تھی وہ ناکام ثابت ہوئی۔ اور وہ اُمراء جن کی طرف سے اُسے ابتداء سے ہی خوف تھا بالآخر اُس کے مقابلے میں کامیاب نکلے ہیں اور اب اک بڑی فوج کے ساتھ اُسے معزول کرنے کے لئے بیجاپور آ رہے ہیں۔ یہ خبر بھی اُس کے لئے کچھ کم متوحش نہ تھی کہ اُس کا بیٹا اور بھائی دشمنوں کے پنجہ میں پھنس گئے ہیں اور اُن کی جان کی کچھ خیر نہیں۔ ان حالات سے پریشان ہو کر وہ مقابلے کی تیاریاں کرنے لگا۔ لیکن یہ جانتا تھا کہ ایسے حالات میں جبکہ پورا شہر بلکہ کہنا چاہیئے کہ پورا ملک اُس کے خلاف ہو رہا ہے بھلا اخلاص خاں اور حبشی اُمراء کا وہ کیا مقابلہ کر سکے گا جب اور کچھ بن نہ پڑی تو اُس نے اپنے مقربین اور ہواخواہوں کی ایک مشورتی مجلس طلب کی۔ اور یہ رائے لی کہ ایسی صورت میں کیا کارروائی کرنی چاہیئے اور کیا طرز عمل اختیار کیا جائے کہ اس بلائے ناگہانی سے نجات ملے۔ اُس کے مشیروں میں سے بعض لوگوں نے رائے دی کہ یہ تمام کارروائی جو شاہ درگ میں اُس کے خلاف کی گئی ہے افضل خاں کی مرضی کے بغیر نہیں کی گئی۔ اور یقیناً افضل خاں کا بھی اس میں بہت کچھ ہاتھ ہے۔

چونکہ وہ میاں بدو کے روانہ کئے جانے سے پہلے فوج کا سپہ سالار تھا اس لیے فوج پر اس کے بہت کچھ اثرات ہیں۔ ساتھ ہی یہ بات بھی صاف و صریح ہے کہ کوئی فوج یا فوج کے سردار اپنے افسر اعلیٰ کی مرضی کے بغیر کوئی کارروائی انجام نہیں دے سکتے، لہٰذا یہ اندازہ کرنا دشوار نہیں کہ اس تمام کارروائی میں افضل خاں کس حد تک شریک ہے ایسی صورت میں کوئی ایسی تدبیر کرنی چاہیئے کہ افضل خاں بخوشی یا مجبوری کشور خاں کا ساتھ دینے پر راضی ہو جائے اس سے کمال خاں اور مغل خاں کی رہائی کی بھی صورت پیدا ہو سکتی ہے اور اس پوری کارروائی کو بھی کالعدم کیا جا سکتا ہے۔ اب افضل خاں پر اثرات ڈالنے کی صرف ایک شکل تھی۔ وہ یہ کہ افضل خاں کے چچازاد بھائی میر رفیع الدین شیرازی کو جو اس وقت بیجاپور میں خزانہ داری کے عہدہ پر مامور تھا قید کر لیا جائے اور اس کو سخت سزائیں دی جائیں تاکہ افضل خاں اپنے بھائی کی مصیبت دیکھ کر اس کو دشمنوں کے پنجے سے نکالنے کے لیے کمال خاں اور مغل خاں کو رہا کرنے پر راضی ہو جائے لیکن دوسروں نے سمجھایا کہ یہ وقت سخت گیریوں اور سزاؤں کا نہیں ہے۔ یوں بھی سب لوگ بھڑک بیٹھے ہیں، یکایک بے گناہ و بے قصور رفیع الدین جیسے متدین شخص کو گرفتار کرنا گویا آگ پر تیل چھڑکنا ہے۔ اور اس حرکت سے معاملات سلجھنے کی بجائے اور الجھن پیدا ہو جائے گی۔ افضل خاں اپنے بھائی کے مقید ہونے کی خبر سنکر اور بھی غضب آلود ہو جائے گا اور پہلے سے زیادہ سختی پر اتر آئیگا لہٰذا مناسب یہ ہے کہ رفیع الدین شیرازی کو نرمی کے ساتھ اپنا بنا لیا جائے اور اس سے مدد طلب کی جائے کہ ایسے برے وقت وہ کام آئے۔ کشور خاں نے اس رائے کو صائب جانکر رفیع الدین شیرازی کو طلب کیا، اور اپنے تمام معاملات سے اُسے آگاہ کیا۔ اس کے بعد نہایت منت وزاری کے ساتھ اس سے مدد طلب کی اور درخواست کی کہ افضل خاں سے سفارش کر کے کمال خاں اور مغل خاں کی رہائی کی کوئی صورت پیدا کرے۔ کشور خاں کی اس بیکسی پر رفیع الدین کو رحم آیا اور اس نے وعدہ کیا کہ اس معاملہ میں وہ حتی المقدور کوشش کرے گا۔

لیکن ظاہر ہے کہ کشور خاں کی یہ ساری کوششیں بالکل بے معنی، بے سود اور بیکار تھیں۔ اگر بفرض محال رفیع الدین شیرازی کے کہنے سے ایک افضل خاں کشور خاں کے ساتھ نرم سلوک اور اچھا برتاؤ کرنے پر راضی بھی ہو جاتا تو دوسرے امراء اور بالخصوص حبشی امیر بھلا کس طرح کشور خاں کے موافق ہو جاتے۔ اور پورا ملک یکایک کشور خاں کے ان مظالم کو اس طرح آن کی آن میں بھلا دیتا جو اس نے زمانۂ اقتدار میں

ملک پر ڈھائے تھے کشور خاں یہ محسوس کرتا تھا لیکن پھر بھی کوشش کیے جارہا تھا کیونکہ یہ انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ مایوس کن سے مایوس کن حالت میں بھی انسان کو کوئی نہ کوئی اُمید ضرور بندھی رہتی ہے۔ یہ اسی دھوکہ باز اُمید کی کارفرمائیاں تھیں جس نے کشور خاں کو رفیع الدین سے مدد طلب کرنے پر مجبور کیا۔ اس کو ایک ڈوبتے آدمی کی آخری کوشش سمجھنا چاہیئے کہ جس کو تنکے کا سہارا بھی غنیمت معلوم ہوتا ہے۔ غرض کشور خاں اپنے اور اپنے عزیزوں کے بچاؤ کے لیے برابر ہاتھ پاؤں مار رہا تھا۔ ادھر کشور خاں کی یہ کوششیں جاری تھیں اور اُس طرف اخلاص خاں کی سرکردگی میں سرحد سے وہ فوج چلی آرہی تھی جو کچھ عرصہ پہلے شاہ درگ سے چلی تھی۔

جوں جوں یہ فوج قریب ہوتی جاتی تھی کشور خاں کی وحشت میں اضافہ ہو رہا تھا۔ اُس کے ہاتھ پاؤں پھول رہے تھے۔ اُس کو کچھ کرتے دھرتے بن نہ پڑتی تھی۔ جب کشور خاں کو اس کا علم ہوا کہ یہ فوج بالکل قریب آگئی ہے تو اُس کی سراسیمگی میں اضافہ ہوگیا۔ بظاہر وہ مقابلہ کی تیاریاں کررہا تھا مگر اندر سے اُس کا دل بیٹھا جارہا تھا۔ وہ یہ خوب سمجھتا تھا کہ یہ کوششیں بالکل بے سود اور بیکار ہیں۔ اس لیے وہ اندرونی طور پر اپنے فرار ہونے کی تدابیر بھی سوچ رہا تھا۔

کشور خاں کی فراری اور اُسکا قتل اسی عرصہ میں کشور خاں نے بادشاہ کی ایک بہت بڑی دعوت کی۔ بیش بہا و گراں قیمت تحائف اُس کی خدمت میں پیش کیئے۔ اس جشن عظیم میں اکثر اکابرین سلطنت کو بھی جمع کیا گیا تھا۔ اس سے کشور خاں کی غایت یہ تھی کہ عوام اور ملک کے جذبات جو اُس کے خلاف اس قدر اُبھرے ہوئے ہیں ٹھنڈے پڑ جائیں اور لوگوں پر یہ ظاہر ہو جائے کہ اب بھی وہ اپنے بادشاہ کا ایسا ہی فرمانبردار، تابع حکم اور اطاعت گزار نوکر ہے جیسا کہ پہلے تھا۔ مگر اب وہ وقت گزر چکا تھا جبکہ ان تدابیر سے پھر وہ اعتماد اور اعتبار حاصل کرلیا جاسکتا جس کو وہ کھو چکا تھا۔ غرض یہ تدبیر بھی اُس کی بے سود ثابت ہوئی۔ اسی اثناء میں یہ خبر پھیلی کہ حبشیوں کا لشکر بیجاپور سے صرف ایک منزل کے فاصلہ پر رہ گیا ہے۔ کشور خاں یہ خبر سُنتے ہی بادشاہ کو شکار کے بہانے شہر کے باہر لے گیا۔ جب یہ شکاریوں کی جماعت کلاغ باغ پہنچی تو وہاں کشور خاں نے چندے توقف کیا اور کچھ سوچنے کے بعد بادشاہ سے اُس نے عرض کی کہ آفتاب کی تمازت بڑھتی جاتی ہے۔ ممکن ہے کہ والاحضرت کو اس حدت کی وجہ سے کچھ نقصان پہنچے یا صحت پر اثر پڑے۔ اس لیے مناسب یہ ہے کہ شاہی سواری شہر واپس چلی جائے اور فی الحال شکار موقوف رکھا جائے۔ بادشاہ کو تو گرمی کے حیلے سے شہر واپس کردیا اور خود یہ کہہ کر ٹل گیا کہ شاہ پور کے باغات کی سیر کے بعد فدوی حاضر خدمت ہوتا ہے۔ ادھر بادشاہ داخل شہر ہوا اُس طرف کشور خاں چار سو سواروں کی معیت میں بیجاپور کو

ہمیشہ کے لیے خیرباد کہا اور فرار ہو گیا۔ چلتے چلتے کشور خاں نے بہت کچھ مال و دولت بھی اپنے ساتھ لے لیا۔ بے شمار ہیرے جواہرات اور مختلف قیمتی اشیاء اس نے اپنے ہاتھ کر لیے اور صرف ایک تسبیح ایسی لی جو مروارید کی تھی جس کی قیمت کم از کم دو لاکھ ہُن بتائی جاتی ہے۔ یہ تسبیح دراصل کامل خاں دکنی سابق متوفی سلطنت کی ملک تھی لیکن جب کامل خاں کشور خاں کے ہاتھوں تباہ و تاراج ہوا تو اس کی ساری پونجی اس کے ہاتھ لگی۔ اسی طرح مصطفیٰ خاں اردستانی کے مارے جانے کے بعد اس کی بے شمار ملک و جائداد اور قیمتی جواہرات کشور خاں کے ہاتھ لگے۔ اب جبکہ وہ فرار ہوا ہے اس نے یہ سارا مال اور ساری دولت اپنے ساتھ لے لی۔ صرف دو تین صندوق اس کے ساتھ ایسے تھے جو محض قیمتی جواہرات سے پُر تھے۔ اس سے اس دولت کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے جو چلتے وقت اس کے پاس تھی۔

کشور خاں کی فراری کے واقعات کے مطالعہ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ پہلے سے ہی اپنے فرار ہونے کا پورا انتظام کر چکا تھا۔

جب وہ بادشاہ کو لیکر شکار کے بہانہ سے نکلا تو اسی وقت بلکہ اس سے پہلے سے ہی اس کا اصلی مقصد یہ تھا کہ موقع ملتے ہی فرار ہو جائے۔ کیونکہ اس نے ہیرے اور جواہرات کے صندوق اپنے ساتھ پہلے سے ہی رکھ لیے تھے جن کی شکار میں کچھ ضرورت نہ تھی۔ اور چار سو سواروں کو بھی پہلے سے ہی مقرر کر رکھا تھا لیکن سوال یہ ہے کہ بادشاہ کو وہ تھوڑی دور تک اپنے ہمراہ کیوں لے گیا؟ غالباً پہلے اس کا خیال تھا کہ جب تک ہو سکے بادشاہ کو اپنے قبضہ میں رکھا جائے اگر بادشاہ قبضہ میں رہے اور کوئی اچانک اور نئی آفت سر پر بھی آئے یا دشمن موقع پا کر اس پر فتح بھی پالیں تو اس کا کچھ بگاڑ نہ سکیں گے۔ بادشاہ کو قبضے میں رکھ کر وہ منھ بولے شرائط پر صلح کر سکتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ تدبیر (اگر کوئی ایسی تدبیر اس کے ذہن میں تھی) بالکل بے معنی اور بے سود تھی۔ اور معلوم ہوتا ہے کہ خود کشور خاں نے بھی اس کو بعد میں محسوس کر لیا اور اس بنا پر اس نے بادشاہ کو روانہ کر دیا۔

یا دوسری قرین قیاس وجہ کشور خاں کی اس حرکت کی یہی معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنے فرار ہونے کے فعل کو بالکل پوشیدہ رکھنا چاہتا تھا تاکہ اس کی فراری اک امر یقینی ہو جائے اور کوئی شخص مخل نہ ہو سکے۔ اہل شہر کو دھوکے میں رکھنے کے لیے اس نے یہ تدبیر نکالی تھی اور شکار کا بہانہ بنایا تھا اگر وہ تنہا شکار کے بہانہ سے نکلتا تو اندیشہ تھا کہ لوگ اس کے اصلی مقصد کو تاڑ کر اس کے فرار ہونے میں رکاوٹ پیدا کرتے۔ اس لیے اس نے اپنے ساتھ

بادشاہ کو بھی لے لیا جس سے یہ ظاہر کرنا مقصود تھا کہ فی الواقع کشور خاں بادشاہ کے ساتھ شکار کو جا رہا ہے جب وہ یکبارگی اُن حدود سے باہر ہو گیا جہاں تک اُسے پکڑے جانے کا اندیشہ تھا تو فوراً بادشاہ کو واپس ہونے کی رائے دے کر خود فرار ہو گیا۔

کشور خاں نے بیجاپور سے فرار ہو کر سیدھے احمد نگر کا رُخ کیا لیکن احمد نگر کی فضا اُس نے اپنے موافق نہ دیکھی' اس لیے اُلٹے پاؤں گولکنڈہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ درحقیقت بھی یہ ہے کہ وہ احمد نگر میں کسی حال پناہ گزین نہ ہو سکتا تھا۔ کیا احمد نگر والوں کو یہ معلوم نہ تھا کہ اُن کی ہر دلعزیز شہزادی چاند سلطانہ کے ساتھ اُس نے کیا سلوک کیا اور اُس کو کس طرح بیدردی کے ساتھ محل سے نکلوا کر قید کرا دیا تھا۔ چاند سلطانہ مرتضیٰ نظام شاہ کی بہن ہی تو تھی۔ مرتضیٰ نظام شاہ بھلا کس طرح گوارا کرتا کہ ایک ایسا شخص اُس کے ملک میں پناہ گزیں ہو جس نے اُسکی حقیقی بہن پر ایسے مظالم توڑے ہوں۔ غرض وہ احمد نگر میں ٹھہرنا مناسب نہ جانکر سیدھے گولکنڈہ کی طرف چلدیا۔[۱]

وہ گولکنڈہ پہنچ تو گیا مگر ہنوز اُسے بادشاہ یا حکومت کی جانب سے کوئی امان نہ ملی تھی کہ اُس کی آمد کی خبر شہر میں مشہور ہو گئی۔ وہاں پر کسی اردستانی نے جو غالباً مصطفیٰ خاں اردستانی کا کوئی عزیز یا ہوا خواہ تھا اُس سے مصطفیٰ خاں کے خون کا بدلہ اپنے خنجر آبدار سے لیا۔ اس طرح کشور خاں کا خاتمہ غریب الوطنی کے عالم میں نہایت بے بسی و بیکسی کی حالت میں ہوا۔

---

[۱] لیکن برہان مآثر نے لکھا ہے کہ کشور خاں بیجاپور سے فرار ہو کر احمد نگر آیا اور اُسے یہاں پناہ ملی۔ نہ صرف پناہ ملی بلکہ وہ مرتضیٰ نظام شاہ کا اک مقرب مشیر ہو گیا اور اُس کی بہت عزت افزائی کی گئی۔ اس کے بعد اک فوج کا افسر بنا کر اُسے بیجاپور پر حملہ کرنے کے لیے بھی بھیجا گیا (جس کا ذکر آیندہ باب میں آئیگا) لیکن یہ بیان قرین قیاس نہیں معلوم ہوتا۔ فرشتہ اور بساتین اور تحفۃ الملوک کے بیانات ٹھیک معلوم ہوتے ہیں جن کی تفصیل اوپر دی گئی یعنی وہ احمد نگر میں پناہ گزیں نہیں ہوا بلکہ گولکنڈہ چلا گیا۔ ملاحظہ ہو برہان مآثر۔ تاریخ فرشتہ۔ بساتین السلاطین۔ تحفۃ الملوک۔

کشور خانی دور پر ایک اجمالی نظر اور کشور خاں کا کیرکٹر

کشور خاں کی حکومت اُسی وقت سے ختم ہو جاتی ہے جبکہ وہ بیجاپور سے فرار ہوا۔ تقریباً چار مہینے بارہ روز تک بیجاپور پر اس شخص کی حکومت رہی۔ اس قلیل مدت میں اُس نے ملک میں وہ اودھم مچائی کہ الامان والحفیظ۔ کامل خاں کا طرز عمل جب ناقابل برداشت ہو گیا تھا تو حکومت نے کشور خاں کو اس اُمید پر طلب کیا کہ شاید وفاداری اور نمک حلالی سے ملک کی بگڑی ہوئی حالت کو درست کرے گا۔ مگر جب یکبارگی اس کے ہاتھ میں قوت آگئی تو اُس نے کامل خاں سے بھی زیادہ پیر پھیلانا شروع کیا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ابتدائی انتظامات اُس نے ایسے کیے جن سے یہی مترشح ہوتا تھا کہ وہ حقیقت میں ملک کی فلاح و بہبود کو مدنظر رکھ کر کام کر رہا ہے۔ اور خصوصاً کامل خاں کے نکالے جانے کے بعد اُمرائے سلطنت میں پیشوائی کی نسبت جو جھگڑا پیدا ہوا اور جو اختلاف خیال اور چہ میگوئیاں ہوئیں اور جن سے سلطنت کی ناؤ کے ہی اُلٹ جانے کا اندیشہ اسوقت کشور خاں نے نہایت وفاداری کے ساتھ اپنے بادشاہ کی خدمت کی۔ اُن لوگوں کو نکال باہر کیا جو ابراہیم کو معزول کرنے کے درپے تھے۔ غرض کامل خاں کی طرح اس نے بھی ابتدائے ملک کے لیے مفید کام کیے اور اس سے یہ توقع رکھی جاسکتی تھی کہ آیندہ اس کا وجود بیجاپور کے لیے مفید ثابت ہوگا۔ مگر دولت و حکومت کا نشہ بہت تیز ہوتا ہے انسان کی عظمت کا سچا اندازہ اُسی وقت ہوتا ہے جبکہ وہ ترقی کے اعلیٰ زینوں پر پہنچ جائے اور پھر بھی اپنے ہوش و حواس کو قایم رکھے۔ بیخود و سرشار نہ ہو جائے کسی نے بالکل سچ کہا ہے کہ ع چوں بدولت برسی مست نہ گردی مردی۔ اور اس معیار کے مدنظر کشور خاں نے اپنی کم ظرفی کا ثبوت دیا۔ اقتدار کے ہاتھ میں آنے اور حکومت کی لذت سے واقف ہونے کے بعد اُس کے لیے یہ امر بالکل ناگوار ہو گیا کہ اس اقتدار اور حکومت میں اُس کا کوئی شریک بھی ہو۔ چاند بی بی کا معاملات ملکی سے علیحدہ کیا جانا اور اُس کو قید کر دینا اسی غرض سے تھا کہ وہ من مانے حکومت کرے اور کوئی اُس کے اختیارات و اقتدارات میں کسی قسم کی کمی نہ کرنے پائے۔ چاند بی بی کی موجودگی اُسے اک خار کی طرح کھٹک رہی تھی کیونکہ جب تک وہ معاملات سلطنت میں حصہ لیتی رہی اُس کا اثر کشور خاں کی ساری اہمیت کو زائل کیے دے رہا تھا۔ اور بالعموم ایسا ہوتا تھا کہ آخری فیصلہ کشور خاں کا نہیں بلکہ چاند بی بی کا ہوتا۔ جب یہ صورت حال ہو تو تصادم لازمی تھا۔ جب یکبارگی یہ تصادم ہو گیا تو کشور خاں اس امر پر مجبور ہو گیا کہ سخت سے سخت طرز عمل اختیار کرے کیونکہ ادھوری سختی مکمل نرمی سے کہیں زیادہ نقصان رساں ثابت ہوتی ہے۔ غرض کشور خاں کو

جب چاند بی بی سے خطرہ پیدا ہو گیا تو پہلے اُن لوگوں پر ہاتھ ڈالا جن کے ذریعہ سے وہ اپنے اقتدار کو منوا سکتی تھی۔ ان میں سے مصطفیٰ خاں سب سے زیادہ اہم تھا۔ مصطفیٰ خاں کا قتل اور چاند بی بی کا قید کیا جانا دراصل ایک ہی پالیسی کی تکمیل کے دو مختلف زینے ہیں۔ اگر اس کو مان بھی لیا جائے کہ کشور خاں کی یہ پالیسی حفاظت خود اختیاری پر مبنی تھی تو پھر بھی اس کی یہ دو کارروائیاں اُس کے دامن شہرت پر دو زبردست داغ ہیں کہ جن کو مٹایا نہیں جا سکتا۔ اگر یہ کہا جائے کہ مصطفیٰ خاں کا قتل اور چاند بی بی کا قید کیا جانا ملک کی ایک سیاسی ضرورت تھی اور اُن کے بغیر کوئی چارۂ کار ہی نہ تھا تو قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کہاں تک یہ طرز عمل ملک کے لیے مفید ثابت ہو سکتا تھا۔ اگر واقعی اس سے مفید نتائج برآمد ہو سکتے تھے اور بالآخر ملک اس سے فائدہ اٹھا سکتا تھا تو یقیناً کشور خاں کو ان حرکتوں کے لیے نہ صرف معاف کیا جا سکتا ہے بلکہ اُس کی تعریف بھی کی جا سکتی ہے۔ ہماری ہمدردی اُس کے ساتھ وابستہ ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے اس نیک اور بہتر طرز عمل کو پورا کرنے بھی نہ پایا تھا کہ دست اجل نے اُسے جھپٹ لیا۔ مگر جب حقیقت بیں نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے تو پتہ چلتا ہے کہ ایسی باعظمت اور ملک کی جاں نثار شخصیتوں کے ساتھ ایسا سلوک کسی طرح ملک کے لیے مفید نہ تھا بلکہ نہایت درجہ نقصان رساں۔ اگر بہی خواہان۔ ریاست کا قید کیا جانا اور قتل کیا جانا ملکی اور سیاسی ضرورت ہے تو پھر ملک اور قوم کی ترقی معلوم۔ جب یہ واضح ہو جائے کہ کسی طرح اس طرز عمل سے ملک فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا تو پھر اُس کی ایک وجہ ہو سکتی ہے وہ یہ کہ اپنے اقتدار کی حفاظت کی شکل پیدا کی جائے۔ اس طرح اُس کا یہ طرز عمل غرض آلود اور ذاتی منفعت پر مبنی معلوم ہوتا ہے جو شخص محض ذاتی منفعت کی خاطر ایسے حرکات کرے جس سے ملک میں ہیجان پیدا ہو وہ یقیناً اس قابل نہیں کہ تاریخ میں اُس کا نام روشن ہو۔ بلکہ وہ ہر زمانے میں ایک مطعون حیثیت رکھے گا۔ اگر کشور خاں کی نیت نیک تھی تو جب وہ ملک کو اپنے خلاف دیکھنے لگا تھا اور جب وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ رائے عامہ اُس کے خلاف ہے، اُمرا اور سرداران فوج اُس سے بیزار ہیں اور وہ انصاف و وفاداری کا خون کیے بغیر عمدگی سے حکومت نہیں کر سکتا ہے تو اُسے چاہیے تھا کہ اُسی وقت اپنے عہدۂ فخیم سے مستعفی ہو جاتا۔ لیکن چونکہ اُس نے ایسا نہیں کیا اس لیے اُس کی ساری کارروائیاں حرص و آز کا نتیجہ معلوم ہوتی ہیں۔ اور اُس کی سیاسیات کا مرکزی نقطہ یہی معلوم ہوتا ہے کہ اُس کا اقتدار قائم رہے خواہ اُس کے قائم رکھنے میں ملک اور قوم کا کتنا ہی زبردست نقصان کیوں نہ ہو۔ جس شخص کا یہ نقطۂ نظر ہو وہ کسی طرح تعریف کا مستحق نہیں اور کسی حال اُس کو اُس کے ان افعال پر معاف نہیں کیا جا سکتا۔ اگر کشور خاں میں متذکرۂ بالا کمزوریاں نہ ہوتیں تو ملک کو اُس سے بہت کچھ فائدہ پہنچتا کیونکہ کیا باعتبار بہادری اور کیا باعتبار حسن انتظام وہ

اپنے زمانے کا بہترین آدمی تھا جس وقت ملک کے انتظامات اُس کے ہاتھ میں آئے ہیں ملک بیرونی حملوں اور اندرونی پریشانیوں سے سخت اُلجھن میں تھا لیکن کشور خاں نے بیرونی حملوں کی مدافعت کا نہایت خوبی سے انتظام کیا اور ایک جرار فوج بہادر اور کارداں سپہ سالاروں کے ماتحت ان حملوں کی روک تھام کے لیے روانہ کی اور اُس کی یہ کوششیں نہایت کامیاب رہیں کہ دشمنوں کو اُس کے دور کی حد تک زیادہ دست درازیوں کا موقع نہیں ملا۔

خوبیٔ انتظام کے لیے کشور خاں کو جتنا سراہا جائے بجا ہے مگر بعد کی کارروائیوں سے اُمرا اُس سے بالکل بدظن ہو گئے اور بالآخر وہی لوگ اُس کی تباہی اور بربادی کا باعث ہوئے۔

متولیانِ ریاست

باب پنجم

اخلاص خاں

اخلاص خاں کا منصب وکالت پر فائز ہونا۔

جب کشور خاں کی فراری کی خبر اخلاص خاں اور دیگر حبشیوں کو ہوئی تو وہ نہایت خاطر جمعی کے ساتھ شہر بیجاپور میں داخل ہوئے اور بادشاہ کے حضور میں بغرض سلام حاضر ہوئے اور اُن میں سے ہر ایک خلعت فاخرہ اور مناصب عالیہ سے سرفراز کیا گیا۔ اخلاص خاں قدرتی طور پر منصب وکالت پر فائز ہو گیا۔ اس نے بادشاہ سے عرض کیا کہ کشور خاں کے زمانے میں اُس کے عزیز، متعلقین اور اُس کے خاص لوگ جو بڑے بڑے عہدوں پر فائز کئے گئے تھے انھیں اب دائرۂ ملازمت سے خارج کر دینا چاہیئے تاکہ نظم و نسق حکومت کی بُرائی دور ہو جائے۔ بادشاہ نے باوجود اپنی کم عمری کے یہ جواب دیا کہ جو کچھ کرنا ہو رفیع الدین شیرازی کی رائے سے کیا جائے (اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بادشاہ کو اپنے اس مقرب پر کتنا زبردست اعتماد تھا) اور ہمیشہ مصلحت وقت کو پیش نظر رکھا جائے۔
اُسی روز اک فرمان شاہی کے ذریعے چاند بی بی کو قلعہ ستارہ سے بصد شان و شوکت دوبارہ بیجاپور کو بُلا لیا گیا۔
جب چاند بی بی بیجاپور آئیں تو حسب سابق اخلاص خاں نے بادشاہ کی محافظت اور تربیت کا کام اُس کے سپرد کر دیا۔
اس طرح ان ضروری انتظامات سے فارغ ہو کر اخلاص خاں نے تمام مُلکی انتظام کی طرف توجہ کی۔

شاہی مُہر

عموماً جو ریجنٹ یا وکیل السلطنت ہوتا اُس کے پاس شاہی مُہر رہا کرتی تھی اس لحاظ سے کہ وہ ریاست کا سب سے بڑا عہدہ دار اور بادشاہ کا نائب ہوتا ہے۔ یہی شاہی مُہر دراصل اُس کے اقتدار کی جان ہوا کرتی تھی۔ جب کشور خاں بیجاپور سے بھاگا ہے تو اُس نے اپنے ساتھ وہ شاہی مُہر بھی رکھ لی تھی جو کہ اُس کے اقتدار کے زمانے میں اسے بادشاہ کی جانب سے سپرد کی گئی تھی۔ اب بغیر شاہی مُہر کے کاروبار سلطنت انجام پانے دشوار تھے۔ اخلاص خاں کو اس کی بڑی تشویش تھی کہ کیا کیا جائے۔ رفیع الدین شیرازی سے رائے لی گئی۔ رفیع الدین نے ایک دوسری مُہر پیش کی جو علی عادل شاہ کے ہمیشہ زیب انگشت رہا کرتی تھی۔ اور جس سے کبھی کبھی بادشاہ کاروبار سلطنت کی انجام دہی کے سلسلے میں کام لیتا تھا۔ یہ مُہر نہایت قیمتی تھی جو عقیق یمنی سے بنائی

گئی تھی اس پر "اسد اللہ الغالب ابن ابی طالب" کندہ تھا علی عادل شاہ کے قتل کے وقت یہ اُس کے ہاتھ میں تھی اس کے بعد سے یہ بحفاظت تمام خزانہ عامرہ میں رکھدی گئی تھی۔ اب جبکہ اصلی مُہر غائب تھی تو کام چلانے کی غرض سے رفیع الدین نے اس کو پیش کر دیا اور اس مُہر سے اُس وقت تک کام لیا گیا جب تک کہ اصلی مُہر کشور خاں کے گولکنڈہ میں مارے جانے کے بعد بیجاپور نہ آگئی (جب کشور خاں مارا گیا تو اُس کا ایک خاص غلام اس مُہر کو لیکر بیجاپور چلا آیا)۔

اخلاص خاں کی کشور خاں کے اہل وعیال کے ساتھ بدسلوکیاں

ان انتظامات کے بعد اخلاص خاں روزانہ حضور شاہی میں آتا اور معاملات ریاست کو انجام دیتا تھا پُرانے عہدہ داروں کو جو کشور خاں کے مامورہ تھے عہدوں اور خدمات سے ہٹا دیا گیا اور اُن کی جگہ پر اپنے معتمدین کو فائز کرنے لگا حبشی غلاموں اپنے ہواخواہوں اور اپنے ساتھیوں میں تمام مناصب عالیہ تقسیم کر دیئے۔ اور اپنے آپ کو روز بروز طاقتور کرنے لگا بقول بساتین السلاطین کے چونکہ یہ شخص فطرتاً مردِ غیور، تند مزاج و بدخو و بدنفس بود شروع در آزار متعلقان کشور خاں نمود" اُس نے اب دستِ ستم ایسا دراز کیا کہ جس کو بھی ذرا کچھ تعلق کشور خاں سے رہا ہو وہ گویا اُس کی ستم آرائیوں کے لیے وقف ہو گیا تھا چنانچہ یاقوت نامی کشور خاں کا ایک حبشی غلام تھا جس کو اُس نے بہت کچھ ترقی دی تھی اور بادشاہ کے حضور میں تک اُسے پہنچا دیا تھا اخلاص خاں کے حکم سے اس کو قتل کر دیا گیا اور وہ بھی اس بُرے طریقے سے کہ اُس کو پارہ پارہ کیا گیا اور ہر ایک پارے کو شہر کے مختلف دروازوں پر لٹکانے کا حکم دیا گیا۔ یاقوت کا قصور محض یہ تھا کہ وہ کشور خاں کا غلام تھا اگر اس کی طرف سے اخلاص خاں کو کچھ خوف یا اندیشہ تھا تو اُسے اُس کے عہدے سے معزول کر دینا یا زیادہ سے زیادہ اُسے نظر بند کر دینا بہت کافی تھا۔ مگر اس طرح اُسے بیدردی سے قتل کرنا اور جانوروں کیطرح اسے ذبح کر کے پارہ پارہ کرنا اخلاص خاں کی خونخواری اور اُس کی بربریت پر دال ہے۔ اُس کا دست ظلم و ستم یہیں تک دراز ہو کر نہیں رہ گیا۔ غلام کا قتل کیا جانا تو ایک معمولی بات تھی اس سے بڑھ کر اس نے یہ کیا کہ کشور خاں کی عورتوں، بچوں اور عزیزوں پر ظلم و ستم توڑنے شروع کیئے اور ظلم بھی ایسا کہ جس کے سُننے سے انسان کے رونگٹے کھڑے ہو جائیں کشور خاں نے بھی بُرائیاں کی تھیں، مگر اس نے اپنے عہد حکومت میں جو کچھ کیا اسے محض سیاسی نقطۂ نظر سے بُرا کہا جا سکتا ہے اور اُس بُرائی کی اُس نے سزا بھی پائی، کہ بالآخر بیجاپور چھوڑ کر بھاگنے پر مجبور ہوا اگر کسی طرح اُس نے بادشاہ اور مملکت کا قصور کیا تھا تو اُس کی اس نے کافی سزا بھی بھگت لی تھی۔ ایک سیاسی مجرم کو اُس کے جُرم کی پاداش میں یقیناً سزا دی جا سکتی ہے اور دیجانی چاہیئے، مگر اُس کے سیاسی جرائم کی بنا پر اُس کے بیگناہ معصوم بچوں اور عورتوں کو سزا دینا اور اُن پر مظالم ڈھانا

انصاف سے بعید ہے۔ کوئی دنیا کا قانون ایسا نہیں جو ایک ایسے قابل نفریں فعل کی اجازت دے۔ اب اخلاص نے جو طرز عمل اختیار کیا وہ نرالا تھا۔ اُس کے ان ظالمانہ افعال سے کشور خاں کے ساتھ ذاتی مخاصمت کی بُو آتی ہے۔ اور اُس کی ان بیدردیوں کا خلاصہ یہ ہے کہ اُس نے تہیہ کر لیا کہ کشور خاں کے اہل و عیال کو یا تو قتل کر ڈالے یا اُن کو انتہائی عزت ریزی کے ساتھ کناسوں اور چرم دوزوں کے حوالے کر دے۔ بھلا ان گھر کی بیٹھنے والی شریف بیبیوں نے اس کا کیا بگاڑا تھا۔ مگر وہ کشور خاں پر اتنا جلا بیٹھا تھا کہ غصے میں اُسے کچھ سوجھ نہ رہا تھا اور مصمم ارادہ کر چکا تھا کہ کشور خاں کے خاندان کی اس طرح عزت ریزی کی جائے! اپنے اس ارادے کو عملی جامہ پہنانے کی غرض سے اُس نے یہ احکامات بھی صادر کر دیئے تھے کہ کناسوں اور چرم دوزوں کو حاضر کیا جائے اور کشور خاں کے اہل و عیال بھی اُس کے حضور میں پیش ہوں۔

رفیع الدین کی کوششیں اس وقت اخلاص خاں کی قوت اور اُس کا اقتدار اس قدر بڑھا ہوا تھا کہ کسی کی مجال نہ تھی کہ اُس کے مقابل میں چوں و چرا بھی کر سکے۔

اخلاص خاں کے ہاتھ میں اس وقت قوت و اقتدار نہ تھا بلکہ ایک ظالم و خونخوار کے ہاتھ میں ایک ننگی تلوار تھی آدمی کم ظرف معلوم ہوتا ہے کہ اقتدار کے ہاتھ میں آتے ہی اُس کا دماغ پھر گیا اور اچھے بُرے کی تمیز مطلق نہ رہی۔ دولت و حشمت، طاقت و قوت کا نشہ اُسے ایسا چڑھا کہ وہ بالکل بدمست ہو گیا اور اسی بدمستی کے عالم میں وہ مظالم پر اُتر آیا۔ کسی کی ہمت نہ ہوتی تھی کہ اس بھوکے شیر اور اُس کے بیگناہ شکار کے درمیان حائل ہو۔ یوں تو کہنے کو اس وقت بھی بڑے بڑے اُمرا اور ذی مرتبت سردار موجود تھے مگر کسی میں اتنی اخلاقی جرأت نہ تھی کہ اخلاص خاں کو اس مذموم فعل سے باز رکھتا۔ یہ یقیناً رفیع الدین شیرازی کی عدیم المثال شخصیت اور اُس کے غیر معمولی اثرات پر دال ہے کہ اُس نے اپنی جان جوکھوں میں ڈال کر اس امر کی حتی الامکان کوشش کی کہ کشور خاں کے اہل و عیال کو اس ظلم ناروا سے محفوظ رکھے۔ اور پھر کچھ اس وجہ سے نہیں کہ کشور خاں اور رفیع الدین شیرازی میں کوئی بہت گاڑھی دوستی تھی، بلکہ اس کے برخلاف سیاسی نقطہ نظر سے دونوں اپنے زمانے میں ایک دوسرے کے مدمقابل اور حریف رہے جس وقت اخلاص خاں کے سامنے یہ مسئلہ پیش تھا اور باقی تمام اُمرا مُہر بہ لب تھے، رفیع الدین نے ان بیکس اور بے یار و مددگار عورتوں اور بچوں کی حمایت میں اپنا منہ کھولا اور اُسے سمجھانے کی کوشش کی کہ اگر کسی طرح گنہگار و قصوروار تھا تو وہ کشور خاں۔ اسکے اہل و عیال تو بالکل بے گناہ ہیں۔ اور شریفوں کو اس طرح ذلیل و رسوا کرنا ناروا و نازیبا ہے۔ اس کے جواب میں اخلاص خاں نے

کہا کہ کشور خاں حرام خوار اور نمک حرام تھا اور اس کے ساتھ اس سے بھی بدتر سلوک کرنا چاہیئے۔ غرض اپنی کج بحثی سے اسی پر اڑا رہا کہ کشور خاں کے اہل و عیال کی بے حرمتی کی جائے۔ رفیع الدین شیرازی نے بعضیرا سمجھایا منایا اور غیرت دلائی، طعن و تشنیع کیئے مگر وہ بھلا کیا ماننے والا تھا۔ برابر اپنی ہٹ پر قایم رہا اور خفیہ طور پر احکام دیئے کہ دوسرے دن علی الصباح کشور خاں کے اہل و عیال کو حاضر کیا جائے اور کناسوں اور چماروں کو بھی۔ تاکہ اُن کو ان رذیلوں کے حوالے کر دیا جائے اور کوئی مزاحمت بھی نہ کر سکے۔

مگر رفیع الدین شیرازی تو اس کی جستجو ہی میں تھا، اُس کو خبر لگ گئی کہ اخلاص خاں نے ایسے احکام دیئے ہیں۔ یہ سننا ہی تھا کہ دوسرے دن خود اخلاص خاں سے بھی پہلے دربار میں آ کر جم گیا۔ اس طرح اخلاص خاں کی خفیہ کارروائی میں کھنڈت ڈال دی۔ اخلاص خاں یہ دیکھ کر بہت بگڑا، جیبیں بجبیں ہوا لیکن کہہ کیا سکتا تھا خاموش رہا۔ پھر رفیع الدین نے اپنی انتہائی کوششیں صرف کی کہ کسی صورت اخلاص خاں کو اپنا ہمخیال بنا لیا جائے۔ بالآخر اپنی ان کوششوں میں کامیاب ہو گیا۔ اس کی نوبت نہ آسکی کہ اس ذلت کے ساتھ ان پردہ نشین عورتوں کی رسوائی کی جائے اور معصوم بچوں کو چماروں اور کناسوں کے حوالے کیا جائے۔ عزت و توقیر کے ساتھ یہ عورتیں اپنے گھر روانہ کر دی گئیں۔ البتہ چند کنیزوں اور لونڈیوں کو بڑی بی صاحبہ کی (والدہ ابراہیم عادل شاہ) خدمت کے لیے بھیجدیا گیا۔ اس طرح محض رفیع الدین شیرازی کی کوششوں سے کشور خاں کا خاندان تباہی و بربادی اور رسوائی سے محفوظ رہا۔ ورنہ اس خونخوار کے ہاتھ میں پھنسنے کے بعد ان کی کوئی خیر نہ تھی۔

جس طرح رفیع الدین شیرازی نے ان بیکس عورتوں اور بچوں کی حمایت کی تھی اسی طرح اُسی کی کوششوں سے یہ طے پایا کہ بنجن خاں (جو کشور خاں کا بیٹا تھا) اندھا نہ کیا جائے اور اخلاص خاں کے احکام منسوخ کرا دیئے گئے جو اُس کے اندھے کیئے جانے کی بابت جاری کیے گئے تھے۔

یہ واقعہ اگر ایک طرف اخلاص خاں کی بدطینتی، خونخواری، وحشیانہ پن اور بربریت کی دلیل ہے تو دوسری طرف رفیع الدین شیرازی کی اعلیٰ شخصیت کو ظاہر کرتا ہے کہ ایسے پُر آشوب زمانے میں بھی جبکہ خود غرضی، احسان فراموشی اور دوست کشی ایک معمولی اور ادنیٰ چیز ہو، ایسے اعلیٰ اور نیک طبیعت والے لوگ بھی موجود تھے! اور ساتھ ہی اسی سلسلے میں یہ بھی ظاہر کر دینا چاہیئے کہ دراصل ان ظالمانہ فعال سے اخلاص خاں اپنی قوت و اقتدار کی جڑوں پہ خود اپنے ہاتھوں

کاری ضرب لگا رہا تھا۔

امین خاں کا خط اسی زمانے میں امین خاں کے پاس سے ایک خط بنام کشور خاں آیا جس میں یہ درج تھا کہ "میں نے بنکاپور کی کارروائی تو ختم کردی ہے، اس کے بعد بلگاؤں اور پنالہ کی طرف توجہ کی جائے گی"۔ یہ امین خاں وہی شخص ہے جس کا اصلی نام عبدالمومن مغل زادہ تھا۔ اور جسے کشور خاں نے امین خاں کا خطاب دیا تھا اور جاگیریں عطا کی تھیں اور اس طرح سرفراز کرنے کے بعد حکم دیا تھا کہ وہ مصطفیٰ خاں کے قتل کے لیے بنکاپور روانہ ہو (اس کا تفصیلی ذکر کشور خاں کے عہد حکومت کے سلسلے میں کردیا گیا ہے) امین خاں اپنی کارروائیوں میں اتنا مشغول اور ایسا منہمک رہا کہ اُسے بیجاپور کی حالت کی اصلا خبر نہ تھی۔ اُس کو یہ معلوم ہی نہیں کہ بیجاپور کے زمین و آسمان ہی بدل گئے ہیں۔ اسی خیال سے کہ ابتک وہاں کشور خاں ہی برسرِ اقتدار ہے، اُس نے یہ خط اُس کے نام روانہ کیا تھا مگر وہ پہنچا اخلاص خاں کو۔ خط کے پڑھنے سے تو کچھ بھی اخلاص خاں کی سمجھ میں نہ آیا کیونکہ یہ ساری کارروائی راز کی تھی امین خاں اور کشور خاں کے سوائے اس کا کسی کو علم نہ تھا۔ رفیع الدین شیرازی نے بالآخر قیاساً اخلاص خاں کو یہ سمجھایا کہ بنکاپور کی کارروائی سے مراد غالباً مصطفیٰ خاں کا قتل ہے اُس کے بعد بلگاؤں جانے کا بظاہر مقصد یہ معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ابوالحسن پسر شاہ طاہر اور اُن کے بھائی رفیع الدین حسین کو قتل کرے جو اُس وقت بلگاؤں یا مصطفیٰ آباد میں مقیم تھے اُس کے بعد پنالہ پہنچ کر مرتضیٰ خاں اور اُس کے بھائی شاہ قاسم کو ختم کردے۔ یہ لوگ جیسا کہ یاد ہوگا کشور خاں کے اقتدار کے زمانے میں جلاوطن کردیئے گئے تھے اور انھوں نے یہاں آکر پناہ لی تھی۔ چونکہ کشور خاں کی پالیسی یہ تھی کہ اپنے استحکام کے لیے اپنے فریق مخالف کے تمام سرگروہوں کو قتل کر ڈالے اس لیے اُس نے امین خاں کو روانہ کیا تھا کہ وہ اُس کے دشمنوں کا یکے بعد دیگرے خاتمہ کردے مگر دشمنوں کے ختم ہونے سے پہلے ہی وہ ختم ہوچکا تھا۔ اور ادھر امین خاں نے مصطفیٰ خاں کے قتل کے بعد یہ خط کشور خاں کو بغرض اطلاع روانہ کیا تھا کہ ایک زبردست حریف کا تو خاتمہ ہوچکا ہے اور اب بقیہ بھی قریب میں ہی ختم کردیئے جائیں گے۔ اخلاص خاں جب ان حالات سے آگاہ ہوا تو اُسے فکر ہوئی کہ کسی طرح ان بے گناہ امیروں کو امین خاں کے چنگل سے بچانا چاہیئے۔ ابھی وہ ان انتظامات میں مشغول ہی تھا کہ متعاقب ایک اور خبر آئی جس سے معلوم ہوا کہ امین خاں خداوند خاں کے ہاتھوں بلگاؤں اور پنالہ کی راہ میں قتل کردیا گیا۔ خداوند خاں بیجاپوری فوج کا ایک سردار تھا۔ اُسے جب معلوم ہوا کہ امین خاں نے دھوکے سے مصطفیٰ خاں کو قتل کردیا ہے تو اُس نے وہیں اس موذی احسان فراموش،

بدبخت کا خاتمہ کر دیا۔ اس کے بعد اخلاص خاں نے ان جلاوطن امیروں کی واپسی کے احکام صادر کر دیئے اور انھیں بیجاپور طلب کر لیا۔ ابوالحسن رفیع الدین حسین بلگاؤں سے شاہ قاسم اور مرتضیٰ خاں انجو پنالہ سے بیجاپور واپس آگئے۔

افضل خاں کا قتل اور رفیع الدین شیرازی کا محبوس ہونا

اخلاص خاں اپنے ذاتی استحکام کے لیے بڑے سے بڑے آدمی کی قربانی کو ایک معمولی چیز سمجھتا تھا جتنے ابتک وکیل السلطنت ہوئے ہیں اُن کا یہ اصول رہا کہ جن بڑے بڑے اُمراء کی جانب سے انھیں خطرہ یا اندیشہ ہوا کرتا تھا وہ انھیں برابر صاف کرتے چلے آرہے تھے چنانچہ کشور خاں نے مصطفیٰ خاں کو جو قتل کروایا اور چاند بی بی کو جو مقید کیا وہ اسی اصول پر مبنی تھا کہ کوئی دوسرا شخص اُس کی طاقت اور اقتدار کو گزند نہ پہنچا سکے۔ اور کوئی مخالف نہ ہو۔ اگر حکومت میں کوئی مخالف رہے تو کسی نہ کسی روز اُس کی طرف سے خدشہ لگا رہتا ہے۔ لہٰذا اُس کی سب سے آسان تدبیر یہی ہے کہ کسی مخالف کو زندہ نہ چھوڑا جائے۔ اب اخلاص خاں بھی اسی اصول پر کاربند تھا جب ابتدائی انتظامات سے اُسے فرصت ملی تو وہ اُن لوگوں کی طرف متوجہ ہوا جن کی جانب سے اُسے خطرہ تھا۔ سب سے پہلے افضل خاں کی طرف وہ متوجہ ہوا۔ یہ شخص کوئی معمولی شخصیت کا آدمی نہ تھا۔ یہ وہ شخص ہے جس نے کہ علی عادل شاہ کے زمانے میں وزارت کی تھی اور بادشاہ کا چہیتا رہا تھا۔ اور پھر فوج پر بھی اُس کا کافی اقتدار تھا۔ اُس نے کشور خاں کے زمانے میں سرلشکر کی حیثیت سے قطب شاہی اور نظام شاہی حملوں کی کامیابی کے ساتھ روک تھام کی تھی اور پھر ملک میں ہر دلعزیز بھی تھا۔ بادشاہ کا خاص معتمد علیہ تھا اور چاند بی بی کی بھی نظر عنایت اُس کی طرف مبذول رہتی تھی اور اُسے وہ ایک وفادار اور جاں نثار خادم تصور کرتی تھی۔ اخلاص خاں چاند بی بی کی جانب سے بھی کھٹکا ہوا تھا اور اُسکی طرف سے غیر ملکی فریق کی طرفداری اُسے بہت بری معلوم ہوتی تھی۔ اور اس وقت غیر ملکی فریق کا سب سے بڑا رہبر اور لیڈر یہی افضل خاں تھا۔ لہٰذا جیسے کشور خاں کے اقتدار کے زمانے میں مصطفیٰ خاں کا وجود اُس کے لیے سخت تکلیف دہ اور خطرناک تھا اسی طرح اخلاص خاں کو افضل خاں سے اندیشہ تھا۔ اخلاص خاں اب اس فکر میں ہوا کہ کسی طرح اس شخص کا خاتمہ کر دیا جائے۔ اُسکو یہ چیز خطرے سے خالی نہ معلوم ہوتی تھی کہ افضل خاں جیسی شخصیت کا آدمی حکومت میں شریک ہو جس وقت اخلاص خاں وکیل السلطنت ہوا تھا تو چاند بی بی کی رائے سے افضل خاں کو پیشوا بنایا گیا تھا اور ایک برہمن راموپنڈت نامی شخص کو جو افضل خاں کا پروردہ تھا اور سلطنت کا ایک معتبر آدمی تھا مستوفی الممالک کی خدمت دی گئی تھی۔ ان وجوہات کی بناء پر افضل خاں کی شخصیت اخلاص خاں کے لیے بڑی خطرناک تھی۔ اس بناء پر اُس نے تہیہ کر لیا کہ افضل خاں کو

کسی طرح ختم کردے۔ جب اکبار گی اُس نے قتل کی ٹھان لی تو پھر اُس کے لیے یہ کام کچھ مشکل نہ تھا۔ وکیل السلطنت تو تھا ہی کسی نہ کسی بہانے اُس نے بادشاہ کی دستخط افضل خاں کے قتل کے فرمان پر لے لی۔ ایک دو روز کی قید کے بعد افضل خاں بحکم اخلاص خاں قتل کر دیا گیا۔ چونکہ رفیع الدین شیرازی اُس کا چچازاد بھائی تھا اور دربار کے بڑے مقربین میں سے بھی تھا اس لیے اس کے قتل کی بھی تدبیر کی گئی۔ مگر چونکہ یہ کوئی صاحب فوج نہ تھا اور نہ اہل سیف بلکہ محض اہل قلم اور درباری تھا اس کے قتل کو ایسی زیادہ اہمیت نہ دی گئی اور فی الحال اسے محض قید کرنے پر اکتفا کیا گیا۔ بعض سربرآوردہ اُمراء کی سفارش سے غنیمت ہوا کہ اس غریب کے گلے پر بھی افضل خاں کی طرح چھُری نہ پھیری گئی اور یہ آئی ہوئی بلا محض چند روز قید پر ٹل گئی۔ رفیع الدین پر تو خیر گزری مگر راسو پنڈت جو مستوفی الممالک کے عہدے پر فائز تھا افضل خاں کی دوستی کی بناء پر قتل کر دیا گیا۔

افضل خاں کی موت جیسی بیکسی کی ہوئی ہے اُس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ برابر ایک رات اور ایک دن تک اُس کی لاش بے گور و کفن پڑی رہی۔ اس بے سروسامانی کی موت کی وجہ یہ تھی کہ یہ سیاسی وجوہات کی بناء پر قتل کیا گیا تھا۔ جب کسی بڑے آدمی پر آفت آتی ہے تو قدرتی طور پر اس کے ساتھ اُس کے عزیز و اقارب اور متعلقین بھی پس جاتے ہیں۔ چنانچہ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ افضل خاں مارا گیا۔ رفیع الدین قید رہا۔ بساتین کے الفاظ کے مطابق "خویشان و اقارب بعضے در حبس بودند و بعضے مختفی" جب ہر شخص منہ چھپائے بیٹھا ہو بھلا افضل خاں کی لاش کون دفناتا! ایک روز کے بعد فتح اللہ شیرازی نے مع اپنے شاگردوں کے اس کی تجہیز و تکفین کی۔ جس شخص کی موت اس بے سروسامانی سے ہوئی ہو اس کی عظمت کا اندازہ کرنے کے لیے کچھ اُس کا حال جاننا چاہیے۔ چونکہ افضل خاں بیجاپور کے بڑے لوگوں میں سے گزرا ہے اس لیے اس مقام پر اُس کے حالات کا دیا جانا کچھ غیر مناسب نہ ہوگا۔

افضل خاں کے حالات اور کیرکٹر | جس طرح کشور خاں کے زمانے میں مصطفیٰ خاں کا قتل ایک اہم سیاسی واقعہ ہے اسی طرح اخلاص خاں کے دور میں افضل خاں کا قتل وہی حیثیت اور وہی اہمیت رکھتا ہے۔ افضل خاں ایرانی النسل تھا۔ اس کے باپ کا انتقال اُس وقت ہوا جبکہ اُس کی عمر آٹھ سال تھی۔ اچھے معزز گھرانے سے اس کا تعلق تھا اس لیے باپ کے انتقال کے

لہ۔ بساتین السلاطین۔

باوجود اس کی طالبعلمی کا سلسلہ جاری رہا۔ اور خود لڑکا بھی ہونہار شوقین اور نیک کردار تھا۔ میر فتح اللہ شیرازی کی شاگردی میں دو سال تک رہا، تھوڑے زمانے کے اندر علوم متداولہ اور دیگر مروجہ فنون میں خاص امتیاز حاصل کرکے قسمت آزمائی کے لیے ہندوستان نکل آیا جو اس وقت لایق و فاضل ہستیوں کا ملجا و ماوی تھا۔ ہندوستان کی اسلامی ریاستوں نے جو علوم و فنون کی سرپرستی کی ہیں اور لایق و قابل ہستیوں کی جو قدردانی کی ہے وہ محتاج بیان نہیں۔ غرض حوادث روزگار نے افضل خاں کو چین لینے نہ دیا، اور وطن چھوڑ کر وہ عازم ہند ہوا۔ اس زمانے میں بیجاپور کی علمی سرپرستیوں کا بڑا شہرہ تھا، اور بیجاپور علمی سوسائٹی کا خاص مرکز ہو رہا تھا۔ علی عادل شاہ کے زمانے میں افضل خاں بیجاپور آیا اور اس مقام کو اپنا مسکن بنالیا۔ کچھ عرصے تک یہاں پر درس و تدریس کا سلسلہ خانگی طور پر جاری رکھا۔ چونکہ وہ اپنے زمانے کے بڑے قابل لوگوں میں سے تھا اس لیے اسکی بہت جلد شہرت ہوگئی اور آٹھوں پہر اس کے مکان پر قابل لوگوں کا جمگھٹا رہنے لگا۔ بہت سارے شوقین لوگ اس کے حلقۂ شاگردی میں داخل ہو گئے۔ اس طرح اس کی عزت و عظمت میں اضافہ بھی ہوتا رہا حتیٰ کہ علی عادل شاہ کو اس نووارد کی قابلیتوں کی خبر ملی۔ یہ بادشاہ بڑا علم نواز تھا، اس نے اپنے حضور میں طلب کر کے اسکی عزت افزائی کی اور اپنے مقربین میں شامل کر لیا۔ تھوڑے ہی زمانے میں یہ حال ہو گیا کہ افضل خاں دربار کے خاص لوگوں میں شمار کیا جانے لگا۔ اور بادشاہ کی طبیعت میں بھی اسے خاص دخل ہو گیا۔ افضل خاں کی قابلیت صرف علمی اور نظری ہی نہ تھی بلکہ اس نے عملی پہلو سے بھی خود کو بڑا کامیاب انسان ثابت کیا۔ بادشاہ نے بہت جلد ملکی خدمات اس کے تفویض کیں۔ ان خدمات کو اس نے اس خوبی سے انجام دیا کہ تھوڑے ہی عرصے میں وہ وکیل السلطنت کے عہدے پر فائز کر دیا گیا۔ بساتین[1] کے الفاظ سے اچھی طرح ظاہر ہوتا ہے کہ اس کی ترقی کیسی غیر معمولی تھی "بملازمت بادشاہ مشرف گشت و پسندیدۂ درگاہ آمد۔ بہ تکلیف ارکان دولت نوکری بادشاہ قبول کرد و در مجلسیان حضور داخل گردید و بہ ارکان دولت مخصوص گشت و خصوصیت او بجائے رسید کہ در مہمات ملکی و مالی دخل کلی داشت۔"

علی عادل شاہ کے آخر زمانے تک اسی عہدے پر فائز رہا اور اس کے انتقال تک برابر اس خدمت کو بحسن و خوبی

---

[1] بساتین السلاطین۔

انجام دیتا رہا اُسکے حُسن تدبر اور حسن انتظام کی ایک بہترین دلیل یہ ہے کہ علی عادل شاہ جیسا بادشاہ اُس کے متعلق کہا کرتا تھا کہ "تا افضل خاں در مہمات کار ملکی در آمدہ و قوت کار و بار دنیا و دنیاداری حاصل کردہ لذت سلطنت یافتم۔"[۱]

علی عادل شاہ کے انتقال کے بعد اسی شخص کی کوششوں سے ابراہیم کی تخت نشینی میں کسی قسم کی رخنہ اندازی کا موقع کسی کو نہ مل سکا (جس کا ذکر تخت نشینی کے باب میں کیا جا چکا ہے) نئے بادشاہ کی تخت نشینی کے بعد اکثر اُمراء و ارکان کا اصرار رہا کہ وہ وکیل السلطنت تو پہلے ہی سے ہے اب ریجنٹ کی بھی خدمت انجام دے۔ مگر اس نے انکار کیا اور معاملات سلطنت سے علٰحدگی اختیار کر لی، اور اُس کا یہ فعل انتہائی دور اندیشی پر مبنی تھا مگر بعد کے واقعات کی لپیٹ میں کشور خاں کے عہد میں اُسے سپہ سالار فوج کا عہدہ قبول کرنا پڑا۔ ان مہموں کے جو کچھ نتائج ہوئے اُن کا ذکر کیا جا چکا ہے۔ اُس کے بعد جب ان مہموں سے واپس ہوا تو اخلاص خاں کا دور شروع ہوگیا، اور یہ اخلاص خاں کی ہی کارستانی تھی کہ اس سچے بہی خواہ سلطنت کا بے وجہ خون بہایا گیا۔ اس کے بیان کرنے کے بعد اُس کی سیرت کے متعلق زیادہ لکھنے کی ضرورت نہیں۔ کیونکہ اب تک جو کچھ واقعات بیان کیے گئے ہیں انہی سے اُس کے کیرکٹر کا اچھی طرح اندازہ ہو سکتا ہے وہ بڑا ہی متدین، وفادار اور اپنے آقا و بادشاہ کا جاں نثار تھا جس سلطنت کی اُس نے خدمت کی جس بادشاہ کو اُس نے اپنا آقا بنایا جس ملک کو اُس نے اپنا ملک سمجھا اُس نے ان سب کے لیے اپنی جان تک گنوانے کو ہیچ سمجھا۔ یقیناً تاریخ کی ایسی ہی ہستیاں ہیں جو آئندہ نسلوں کو حُب وطن، حُب قوم، وفاداری اور دیانت داری کا سبق دیتی ہیں۔

پیشوائی کا جھگڑا۔ عین الملک کی چالاکی

افضل خاں کے مارے جانے سے حبشیوں کی عموماً اور اخلاص خاں کی خصوصاً قوت میں اضافہ ہوا۔ وہ اب میدان مار چکے تھے اُن کا سب سے بڑا حریف بے بسی اور بیکسی کی موت مر چکا تھا اور اب پوری ریاست میں کوئی ایسا شخص نہیں تھا جو اُن کے مقابلے میں اُنگلی اٹھانے کی بھی ہمت کر سکتا۔ اب حکومت کی کُل پوری کی پوری ان حبشیوں کے قبضۂ اقتدار میں آگئی تھی۔ اخلاص خاں تو وکیل السلطنت تھا ہی مگر افضل خاں کے مارے جانے سے پیشوائی کا عہدہ خالی ہو چکا تھا، اور اس کو پُر کرنے کی سخت ضرورت تھی حبشیوں کو یہ فکر تھی کہ اس عہدے پر بھی

[۱] بساتین السلاطین۔

کسی اپنے آدمی کو مقرر کیا جائے۔ تاکہ اقتدار قطعی طور پر اُن کے ہاتھ میں رہے۔ مگر اس وقت دوسرے اُمرا بھی موجود تھے جو چاہتے تھے کہ ان کے فریق کا آدمی پیشوا ہو۔ چنانچہ شاہ ابوالحسن و مرتضیٰ خاں آنجو ایک طرف اس عہدے کے دعویدار تھے تو دوسری طرف دکنی فریق کی کوشش تھی کہ عین الملک کو یہ عہدہ دیا جائے۔

غرض اس طریقے سے یہ ایک نئی اُلجھن پیدا ہوگئی۔ خدمت ایک تھی اور دعویدار تین۔ (۱) ایک تو خود حبشی غلام (۲) عین الملک اور اُس کا فریق (۳) ابوالحسن و مرتضیٰ خاں آنجو کا فریق (یہ وہی لوگ ہیں جنھیں اخلاص خاں نے شاہی فرمان کے ذریعے بُلا لیا تھا) حبشیوں اور تیسرے فریق کی نسبت تو ہم کچھ نہ کچھ جانتے ہیں، مگر عین الملک کے متعلق بھی دو چار لفظ لکھ دینے چاہئیں۔ یہ وہی شخص ہے جس کا اس سے پہلے اُس مہم کے سلسلے میں ذکر آچکا ہے جو کشور خاں نے بغرض مدافعت نلدرگ بھیجی تھی کہ نظام شاہی اور قطب شاہی حملے روکے جس میں افضل خاں بھی موجود تھا اور وہ اُمرائے حبش جن کے ہاتھ میں اس وقت حکومت کی باگ تھی کشور خاں کی طرف سے جب ایسے افعال کا ظہور ہوا جن سے اُس کی بدنیتی اور بد دیانتی ظاہر ہو رہی تھی ان سبھوں نے اتفاق کر کے اُس کی مخالفت کی ٹھانی تھی یہاں تک تو عین الملک نے باقی سب سرداران فوج کا ساتھ دیا تھا مگر جب فوجیں بیجاپور کی راہ اختیار کیں اس غرض سے کہ کشور خاں کو معزول کریں، عین الملک نے ان سے جدائی اختیار کی اور اپنی فوجوں سمیت، اپنی جاگیر چل دیا۔ غالبًا وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ دارالسلطنت کی اُلجھنوں میں پھنس کر خود بھی پریشان ہو۔ اس کے بعد سے برابر وہ اپنی جاگیر ہی میں مقیم رہا لیکن یہاں بیٹھے ہوئے برابر وہ اُن حالات کا معائنہ و مشاہدہ کر رہا تھا جو اس مرکز میں رونما ہو رہے تھے۔ چونکہ یہ بڑے اُمرا میں سے تھا اس لیے اُس کی کافی اہمیت تھی۔ اس کے پاس کافی فوج تھی اس لیے حبشی اُس سے کچھ گھبراتے تھے۔ ایسی صورت میں جبکہ اور کچھ بن نہ پڑے، وہ اس کے لیے تیار تھے کہ اُس سے اتحاد کر لیں اور پیشوائی کا عہدہ اُس کے سپرد کر دیں تاکہ دکنی فریق کو خوش کرنے کا موقع مل جائے۔ بساتین السلاطین اور برہان مآثر[۱] کے مطالعے سے واضح ہوتا ہے کہ وہ اس وقت تمام اُمرا میں زیادہ سربرآوردہ اور طاقتور تھا۔ عین الملک چونکہ اس وقت غیر معمولی حیثیت رکھتا تھا اس لیے یہ ممکن نہ تھا کہ اُس کی اہمیت کو حبشی نظرانداز کر سکتے اور سب سے بڑی بات یہ کہ اُس کے پاس

---

[۱] ملاحظہ ہو بساتین السلاطین و برہان مآثر۔

فوج تھی، روپیہ تھا اور طاقت تھی۔ یہ زمانہ تو ایسا تھا کہ جس کی لاٹھی اُس کی بھینس۔ اس لیے عین الملک سے حبشیوں کو خدشہ تھا۔ مگر اس خدشہ کو دوستی اور محبت کے پیرایہ میں چھپا رکھا تھا۔ جب اُن کی کچھ اور نہ چل سکی تو انھوں نے عین الملک کو فرمان شاہی کے ذریعے اس کی جاگیر سے طلب کیا کہ اُسے پیشوائی کا عہدہ دیں۔ عین الملک بڑے کروفر جاہ و حشم اور فوج و سپاہیوں کے ساتھ بیجاپور آیا۔ اس کے استقبال کی غرض سے یہ تینوں حبشی اُمراء شہر سے باہر گئے۔ چونکہ محض استقبال کی غرض سے گئے تھے اس لیے اُن کے ساتھ کوئی فوج وغیرہ نہ تھی۔ عین الملک نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا۔ اُس نے اُن کو تنہا دیکھ کر فوراً گرفتار کر کے پابزنجیر کر لیا۔ چونکہ عین الملک نے اچانک یہ کارروائی اختیار کی تھی۔ حبشی نہایت بے بسی کے ساتھ اُس کے ہاتھ میں پھنس گئے۔ اس طرح عین الملک کی یہ کارروائی بالکل کامیاب رہی۔ اخلاص خاں، حمید خاں، دلاور خاں (سہراب خاں ترکی[1]) قید کر لیے گئے۔

پہلی نظر میں عین الملک کے اس فعل پر سخت تعجب ہوتا ہے کہ اُس نے ایسا کیوں کیا۔ جن لوگوں نے پیشوائی دینے کے لیے اُسے طلب کیا تھا اور پھر اُس کے استقبال کو گئے تھے اُلٹے اس نے انھی کو قید کر لیا۔ لیکن اگر غائر نظر ڈالی جائے تو یہ سمجھنا دشوار نہیں کہ دراصل حبشیوں اور عین الملک میں کچھ دوستی اور اتحاد نہ تھا۔ بلکہ حبشیوں نے بظاہر دوستی پر جو کمر باندھی تھی وہ محض سیاسی اور مصلحتی دوستی تھی۔ چونکہ حبشیوں کو عین الملک کی غیر معمولی طاقت سے اندیشہ تھا اس لیے اُن کی خواہش یہ تھی کہ فی الحال کسی طرح اس طاقتور امیر کو راضی رکھا جائے اور اُس وقت تک اُسے غافل رکھیں جب تک کہ اُس کے مقابلے کی تاب اُن میں نہ پیدا ہو جائے اور جب یکبارگی اُن میں طاقت پیدا ہو جاتی اُس وقت وہ عین الملک کے ساتھ وہی سلوک کرتے جو کہ اُس نے اُس وقت اُن کے ساتھ کیا۔ عین الملک گُرگ باراں دیدہ تھا بھلا ان حبشیوں کی اس پالیسی کو وہ نہ سمجھتا، وہ اُن کا اصلی مطلب تاڑ گیا۔ اب موقع اُس کے ہاتھ آگیا تھا اور اس سے فائدہ اٹھا کر اُس نے ان کو قید کر لیا۔ اس طرح اُس کی خواہش تھی کہ ان حبشیوں کو نکال باہر کر کے خود وکیل السلطنت کے عہدے پر قابض ہو جائے اور حکومت کے بڑے بڑے عہدے اپنے لوگوں میں تقسیم کر دے۔ اس پالیسی پر عمل کر کے اُس نے یہ حرکت کی تھی۔ جو حفاظت خود اختیاری پر مبنی تھی۔

---

[1] بساتین السلاطین۔

عین الملک کی بزدلی اور اُمرائے حبش کا نجات پانا

عین الملک نے اتنا کچھ کرلیا تھا کہ اگر اور تھوڑی ہمت کرلیتا تو گوہر مقصود اُس کے ہاتھ آجاتا۔ اُس کی بعد کی حرکات سے اس نے خود کو سخت نا اہل، نالائق اور بزدل ثابت کردیا۔ سب سے پہلی غلطی تو اُس نے یہی کی کہ اپنی کارروائی کو تیزی کے ساتھ ختم نہیں کیا۔ اُن حبشی اُمرا کے گرفتار ہونے کے بعد ہی اُسے چاہیئے تھا کہ فوراً قلعے میں داخل ہوکر صورت حال کو اپنے قابو میں کرلیتا۔ بہ خلاف اس کے اُس نے دو تین روز یونہی گزار دیئے۔ اُس مدت کے گزرنے کے بعد کہیں یہ آپ کو سوجھی کہ قلعے میں داخل ہونا چاہیئے۔ یہاں تک بھی ٹھیک ہی تھا چنانچہ[1] قیدیوں کو لیکر اپنی فوج کے ساتھ وہ قلعے میں داخل ہونے کی طرف متوجہ ہوا۔ اسی اثنا میں جاسوسوں کے ذریعے معلوم ہوا کہ دستور خاں قلعدار کو (جو عین الملک سے ساز باز کرچکا تھا) بعض حبشی غلاموں نے (جو اندرون قلعہ موجود تھے اور حبشی اُمرا کے قدرتی طور پر طرفدار تھے) قید کرلیا ہے اور قلعے کے دروازے بند کردیئے ہیں۔ اِس طرح عین الملک کا راستہ رُک گیا۔ ذرا سے یہ بھی معلوم ہوا کہ یہ حبشی آمادۂ جنگ ہیں۔ عین الملک اس کے لیے تیار نہ تھا اور اُس کے ہوش وحواس اس خبر کے سُنتے ہی گُم ہوگئے۔ بجائے اس کے کہ وہ جم کر ان غلاموں کا مقابلہ کرتا، وہیں اپنے قیدیوں کو چھوڑ کر بھاگ گیا۔

اسی اثنا میں اک اور حبشی غلام مقصود خاں نامی یہاں آن پہنچا۔ جب دیکھا کہ عین الملک نے بدحواسی کے ساتھ فرار اختیار کی ہے اور اُس کے قیدی اُس سے بہت پیچھے رہ گئے ہیں اور اُن کی محافظت کا کوئی سامان نہیں تو فوراً

---

[1] حبشیوں کی گرفتاری اور اُن کی رہائی کے واقعات میں مورخین نے اختلاف کیا ہے۔ اوپر کا بیان فرشتے سے لیا گیا ہے۔ مگر برہان مآثر کے مصنف نے اس واقعے کو جدا طور پر قلمبند کیا ہے۔ اُس کا خلاصہ یہ ہے عین الملک نے حبشی امیروں کو دعوت دی اور دھوکہ سے قید کرلیا۔ دوسرے دن وہ اسی فکر میں تھا کہ قلعے کے اندر داخل ہوکر ابراہیم (بادشاہ) کو اپنے قبضے میں کرلے اور وکیل السلطنت کا عہدہ دبا بیٹھے اور ان حبشی امیروں کو کسی قلعے میں مقید کردے۔ چنانچہ وہ روانہ ہوا۔ مگر راستے میں اُسے خبر ملی کہ بادشاہ کے غلاموں نے فوج اور کوتوال بیجاپور سے یہ ساز باز کرلی ہے کہ جونہی عین الملک اپنے قیدیوں کے ساتھ قلعے کے اندر داخل ہو اُس پر لوٹ پڑیں۔ حبشی اُمرا کو چھڑالیں اور عین الملک کو گرفتار کرلیں۔ اِس جھوٹی خبر کے سُنتے ہی وہ ایسا بدحواس ہوا کہ عین بازار میں اپنے قیدیوں کو چھوڑ کر اپنی جاگیر کو بھاگ گیا (ملاحظہ ہو تاریخ فرشتہ، برہان مآثر، تحفتہ الملوک، بساتین السلاطین)۔

اپنے آدمیوں کے ساتھ آگے بڑھ کر انھیں چھڑالیا مقصود خاں کی وقتیہ امداد کی بدولت محض اتفاقی طور پر ان حبشیوں کو عین الملک کے پنجے سے رہائی ملی اور اُنکی کھوئی ہوئی قوت دوبارہ اُن کو حاصل ہوگئی۔

یہ پوری کارروائی عین الملک کی بیوقوفی، بزدلی اور اُس کی نااہلی پر دال ہے۔ ورنہ وہ اگر ذرا سمجھ سے کام لیتا تو پورے ملک کا اقتدار اُس کے ہاتھ میں آگیا ہوتا عین الملک یہاں سے جو بھاگا تو پھر اُس نے اپنی جاگیر میں پہنچ کر پناہ لی ہے۔

اس طرح جو کارروائی کہ محض پیشوائی کے لیے شروع ہوئی تھی اُس کا یہ انجام ہوا۔ اسی کارروائی کی بدولت حبشیوں نے ذراسی بات میں اپنا سارا اقتدار کھو دیا تھا۔ مگر قدرت نے اُن کی ایسی مدد کی کہ وہ اپنے اس بڑے دشمن کے پنجے سے چھوٹ گئے۔ اس غیر متوقع نجات کے ملتے ہی پھر اُن کا اقتدار اُن کے ہاتھ میں آگیا۔ اور کہنا چاہیئے کہ پہلے سے بھی زیادہ ہوگیا۔ کیونکہ اب اُن کا کوئی مخالف نہ رہا تھا۔ افضل خاں تلوار کے گھاٹ اتار دیا گیا۔ عین الملک جان بچاکر بھاگ گیا۔ اور تیسرا فریق (مرتضیٰ خاں انجو اور شاہ قاسم) جلاوطن کر دیا گیا۔ ان انتظامات کی وجہ سے حبشیوں کے اقتدار میں اور بھی زیادہ اضافہ ہوگیا۔ ملک میں کوئی اُن کا مدمقابل نہ تھا۔ اور تمام سیاہ وسفید کے وہ مالک ہو چکے تھے۔ اخلاص خاں حسب سابق سن رسیدہ، تجربہ کار ہونے کے اعتبار سے وکیل السلطنت کے عہدے پر فائز رہا۔ اور اُس کے دونوں ساتھی حمید خاں و دلاور خاں حکومت میں اُس کے شریک رہے۔

خارجی مشکلات۔ بیرونی حملے۔ یہ کسی اور جگہ واضح کر دیا گیا ہے کہ گولکنڈہ، احمد نگر اور بیجاپور کی ریاستوں کے درمیان شروع ہی سے ایسی رقابتوں کا سلسلہ جاری تھا کہ ہمیشہ ایک دوسرے کی تاک میں لگے رہتے تھے۔ جہاں کسی ریاست کے اندرونی حالات میں پیچیدگیاں پیدا ہوئیں کہ ان ریاستوں کے کان کھڑے ہوئے، اور موقعہ پاتے ہی اُس کی کمزوری سے فائدہ اٹھاکر پے در پے حملے کرنا شروع کر دیتے تھے۔

ابراہیم عادل شاہ ثانی کے ابتدائی عہد میں بھی یہی صورت حال پیدا ہوگئی یعنی تو لیان ریاست کے جھگڑوں نمک حراموں اور اُمراء کی کشمکش نے ریاست کو اندرونی طور پر پریشان کر رکھا تھا۔ ان حالات کا علم ہوتے ہی چاروں طرف سے بیجاپور پر حملے ہونے لگے جس کا ایک دلچسپ مظاہرہ ہم نے کشور خاں کے عہد اقتدار میں دیکھ لیا ہے۔ کشور خاں کا اندرونی طرز عمل خواہ کیسا ہی خراب کیوں نہ ہو مگر اُس نے ان بیرونی حملوں کی روک تھام کا نہایت اچھا انتظام کیا تھا۔

ایک بڑی زبردست اور جرار فوج افضل خاں کی سپہ سالاری میں غنیم سے مقابلے کے لیے روانہ کی گئی۔ اس فوج نے ان حملوں کی بڑی اچھی روک تھام کی، اور دشمن کو شکستیں بھی دی گئیں۔ افضل خاں تو چاہتا تھا کہ اور آگے بڑھ کر ان دشمنوں کا پوری پوری طرح خاتمہ کر دے۔ مگر بیجاپور کے حالات سے باخبر ہو کر سرداران فوج نے دوسری تدابیر اختیار کیں یعنی بیجاپور واپس آگئے۔ اس کے بعد کی تمام تفصیلات پچھلے صفحات میں بیان کر دی گئیں۔ کشور خاں فرار ہو گیا، حبشی برسر اقتدار ہو گئے۔ اس کے بعد بھی کشمکشوں کا سلسلہ جاری رہا۔ غرض ان اندرونی الجھنوں کی بنا پر بیرونی حالات سے قطعاً روگردانی کر لی گئی تھی۔ احمد نگر اور گولکنڈہ کی ریاستیں بھی کچھ تو اس فکر میں تھیں کہ دیکھئے بیجاپور کی حالت کیا رنگ لاتی ہے، اور کچھ اپنی فوجوں کو ستا کر پھر سے حملے کرنے کی تیاریوں میں مشغول تھیں۔ اتنے عرصے میں غنیم کو تازہ دم ہونے کا کافی موقع مل گیا تھا اور ادھر بیجاپور کی حالت میں اور خرابی بھی پیدا ہو گئی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پھر بیرونی حملوں کا سلسلہ شروع ہوا۔[1]

شاہ درگ کا محاصرہ اور محمد آغا ترکمان کی وفاداری

پچھلے باب میں اس کا ذکر دیا گیا ہے کہ بیجاپوری فوج نے بہزاد الملک کو ایسی زبردست شکست دی کہ وہ سید مرتضیٰ امیرالامراء کی فوج سے ملحق ہونے پر مجبور ہو گیا۔ اسی سلسلے میں نظام شاہیوں کو بیدر پر بھی ناکامی ہوئی۔ اب احمد نگریوں کو اس کی فکر تھی کہ اس دوہری شکست کا بیجاپوریوں سے بدلہ لے۔ اس غرض سے ایک زبردست فوج سید مرتضیٰ کی سرکردگی میں

---

[1] کشور خاں اور اخلاص خاں کے عہد حکومت میں جو بیرونی حملے ہوئے ہیں ان کے متعلق اور خصوصیت کے ساتھ ان کی ترتیب اور تفصیل میں مورخین نے بہت کچھ اختلاف کیا ہے۔ برہان مآثر، تاریخ قطب شاہی اور تاریخ فرشتہ میں اگر ان حالات کو پڑھا جائے تو انسان اختلافات کی زیادتی اور واقعات کی گنجلک کی بنا پر کھو جاتا ہے۔ فرشتے نے ان حملوں کی جو ترتیب و تفصیل دی ہے وہ ان تاریخوں سے ملتی نہیں۔ لیکن فرشتے کے بیان میں تسلسل اور صفائی ہے اس لیے اس کا بیان زیادہ معتبر معلوم ہوتا ہے۔ باقی دو تاریخوں میں (جن کا ذکر کیا گیا) بعض ایسے حملوں کی تفصیل اور واقعات دیئے گئے ہیں جن کا فرشتے میں پتہ نہیں۔ چونکہ ان اختلافات کو پوری پوری تفصیل کے ساتھ دینا ممکن نہیں، اور مضمون کو غیر ضروری طور پر طویل بنانا ہے

روانہ کی گئی۔ اس حملے کا اُس وقت سے اندیشہ تھا جبکہ بیجاپور پر کشور خاں حاوی تھا! وراسی لیے عادلشاہی فوج کشور خاں کو معزول کرنے کے لیے دارالسلطنت بیجاپور جانے سے پیچھے ہٹ رہی تھی کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ عین اسی اندرونی الجھن کے وقت سید مرتضیٰ بیجاپور پر حملہ کر دے (اس اندیشہ کو پچھلے باب میں ظاہر کر دیا گیا ہے) مگر غنیمت یہ ہوا کہ نظام شاہیوں نے تیزی سے کام نہیں لیا اور اُس وقت بیجاپور پر حملہ آور ہوئے جبکہ اخلاص خاں اور دیگر حبشی اُمرا کشور خاں کو معزول کر کے برسراقتدار آچکے تھے۔ غرض سید مرتضیٰ ایک بڑے بھاری لشکر کے ساتھ بیجاپور کی طرف متوجہ ہوا اور ادھر گولکنڈہ سے خود محمد قلی قطب شاہ مع فوجوں کے آن پہنچا کہ احمد نگری فوجوں سے ملحق ہو کر بیجاپور کے خلاف متحدہ کارروائی کرے۔ محمد قلی قطب شاہ کے خود بہ نفس نفیس آنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ احمد نگر سے دوستی اور اتحاد کی جڑوں کو مضبوط کرنا چاہتا تھا۔ جب یہ دونوں فوجیں ملحق ہو گئیں تو یہ طے پایا کہ پہلے شولاپور اور شاہ درگ کو فتح کر کے مرتضیٰ نظام شاہ کے قبضے میں دیا جائے۔ اور اس کے بعد گلبرگہ فتح کر کے محمد قلی قطب شاہ اپنے قبضے میں کر لے چنانچہ یہ دونوں فوجیں شاہ درگ پہنچیں اور اُس کا محاصرہ کر لیا گیا۔

(سلسلۂ گزشتہ) اس لیے محض اہم اختلافات کی بابت فٹ نوٹ میں اشارہ کر دیا جائے گا۔ چنانچہ ان مآثر سے واضح ہوتا ہے کہ ہزاد الملک کی شکست کے بعد عادل شاہی فوج نلدرگ میں قیام گزیں ہو گئی۔ ادھر سید مرتضیٰ اس شکست کا بدلہ لینے کے لیے نکلا، نلدرگ پر حملہ آور ہوا۔ اسی اثنا میں گولکنڈہ سے میر شاہ میر دس ہزار فوج کے ساتھ احمد نگری فوج کی امداد کی غرض سے نلدرگ آگیا۔ نلدرگ پر متحدہ حملہ ہوا، عادل شاہیوں کو شکست ہوئی۔ مگر بعد میں حلیفوں نے یہ طے کیا کہ نلدرگ کو چھوڑ کر بیجاپور پر حملہ کر دیں۔ غرض بیجاپور کا محاصرہ کر لیا گیا۔ اس وقت حبشی اُمرا برسراقتدار تھے۔ انھوں نے مدافعت کا سامان کیا، مگر جنگ میں اکثر بیجاپوریوں کو شکست ہوئی۔ اس محاصرے کے سلسلے میں کئی جنگیں ہوئیں (جن کا تاریخ فرشتہ میں ذکر نہیں) اسی اثنا میں امیر زنبیل استرآبادی ابراہیم قطب شاہ کی طرف سے پہلے ان حلیفوں کی مدد کے لیے آن پہنچا گو اس کا راستہ روکنے کے لیے حبشیوں نے مرزا نورالدین کو بھیجا مگر اس کا شبخون ناکام رہا۔ اس کو شکست ہوئی اور امیر زنبیل سید مرتضیٰ اور میر شاہ میر سے ملحق ہو گیا۔ اسی اثنا میں کشور خاں (سابق متولی بیجاپور) یہاں سے بھاگا تھا، احمد نگر میں پناہ گزیں ہو کر بادشاہ کا منظور نظر ہو گیا اور بادشاہ (مرتضیٰ نظام شاہ) نے اُسے بھی ایک فوج دی کہ وہ امیر الاُمرا سید مرتضیٰ کی مدد کو جائے چنانچہ

اس وقت یہاں پر آنما ترکمان ایک "غریب" قلعدار تھا۔ اگرچہ اس وقت پایۂ تخت کی حالت اتنی خراب تھی مگر باوجود اس کے اس شخص نے ایسی شجاعت اور مردانگی سے دشمنوں کا مقابلہ کیا کہ کہا جا سکتا ہے کہ اُس نے حق نمک ادا کر دیا۔ ایسی بہادری اور دلیری سے محاصرین کا مقابلہ کیا کہ غنیم کے بھی دانت کھٹے ہو گئے اور کسی طرح وہ زیر ہوتا بھی نظر نہ آتا تھا۔ ہر چند کوشش کی گئی، توپیں ازائی گئیں، ضربزن اور منجنیقوں سے کام لیا گیا، حملے کیئے گئے، دھاوے بولے گئے مگر کچھ اثر نہ ہوا۔ آنما ترکمان ترکی بہ ترکی جواب دے رہا تھا۔ آخر محاصرین بھی تنگ آگئے۔ انھوں نے شاہ درگ حاصل کرنے کی ایک آسان ترکیب یہ نکالی کہ اُسے رشوت دے دلا کر کسی طرح راضی کر لیں۔ مگر اُس وفادار و جاں نثار نے اُن کی ان کوششوں اور پیشکشوں کو ٹھکرا دیا، اور فرشتے کے الفاظ میں اُس نے جواب دیا کہ "صاحب و ولی نعمت من اعتماد کردہ چنیں قلعہ سرحدی را بمن سپرد است، اگر من خیانت ورزم درچنیں وقت ایں قلعہ را بہ شما بسپارم نزد خدا و خلق شرمندہ و مواخذ خواہم بود۔" اور اگر آج میں نے اپنے ولی نعمت سے بیوفائی کی تو کل کے روز سب سے پہلے آپ ہی لوگ مجھے طعنہ دیں گے، اور نفرت کرنے لگیں گے اس لیے یہ توقع نہ رکھیئے کہ کسی حال میں اس قلعے کو آپ کے حوالے کر دوں گا خواہ اُس کی مدافعت میں مجھے اپنی جان سے بھی ہاتھ دھونا کیوں نہ پڑے۔" (فرشتہ)۔

(بسلسلۂ گزشتہ) وہ بھی آیا (تاریخ فرشتہ سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بہت جلد قلعہ گولکنڈہ میں مارا گیا اور اُس وقت مر چکا تھا) غرض حلیفوں کی قوت بڑھ گئی۔ اور بیجاپوریوں کی حالت کمزور ہو گئی تھی۔ عین الملک جو اس وقت حبشی اُمرا سے ناراض ہو کر حلیفوں سے مل گیا تھا انھی حبشیوں کی درخواست پر اور یہ دیکھ کر کہ بیجاپور کی حالت نازک ہے پھر بیجاپوری فوج میں شامل ہو گیا (حالانکہ عین الملک اُس وقت بیجاپوری افواج سے ملحق ہوا ہے جبکہ ابوالحسن برسر اقتدار ہوا اور وہ بھی سید مرتضیٰ کی کوششوں سے (فرشتہ)) غرض اس صورت حال میں مقابلے ہوتے رہے جس میں اکثر عادل شاہیوں کو شکست ہوتی تھی۔ اس پر بیجاپوریوں نے ایک چال چلی اور سید مرتضیٰ کو دھوکہ دیا کہ ہم ابوالحسن کو وکیل السلطنت بناتے ہیں، بشرطیکہ محاصرہ اٹھا دیا جائے، اور ابراہیم قطب شاہ سے پیچھا چھڑایا جائے (ابراہیم قطب شاہ اس سے پہلے ہی مر چکا تھا اور وہ بیجاپور کے محاصرے کے وقت نہیں تھا) سید مرتضیٰ راضی ہو گیا۔ مگر بعد میں قطب شاہیوں کے سپہ سالار میر شاہ میر کو اس اندرونی اتحاد کی خبر لگ گئی۔ اُس نے سید مرتضیٰ کو

مختصر یہ کہ اس شخص نے بڑی مردانگی اور وفاداری کا ثبوت دیا کہ ایسی خود غرضی اور بیوفائی کے زمانے میں نمک کی لاج رکھی۔ جب کسی طرح شاہ درگ فتح ہوتا نظر نہ آیا تو محاصرہ کرنے والی فوجوں کی ہمتیں پست ہوگئیں محاصرہ کیئے ہوئے کوئی چار ماہ کا عرصہ ہوچکا تھا، بہت سارے لوگ بڑے بڑے افسر اور سپاہی مارے گئے تھے اور پھر نتیجہ کچھ بھی نہیں۔ محمد قلی قطب شاہ بیزار آچکا تھا اور شاہ میرزا (میر شاہ میر) اصفہانی کو بہت کچھ برا بھلا کہا کہ وہ زبردستی فتح کی امید دلا کر اُسے وہاں کھینچ لایا۔

بیجاپور کی طرف روانگی اور بیجاپور کا محاصرہ۔

آخر کار احمد نگر اور گولکنڈہ کے جنرلوں نے بالاتفاق یہ تصفیہ کیا کہ ایک معمولی قلعے کے پیچھے اتنی سر کھپی کرنا حماقت ہے اس پر محنت بھی صرف ہو رہی ہے بے وجہ وقت ضائع ہو رہا ہے، اور کوئی حسب دلخواہ نتیجے کی توقع بھی نہیں۔ لہٰذا مناسب یہ ہے کہ بیجاپور میں جہاں مدافعت کرنے والا کوئی نہیں ہے، اُمرا میں سخت اختلاف ہے اور باہمی فسادات کا سلسلہ جاری ہے۔ ایسی صورت میں بیجاپور میں کامیابی بہت سہل اور آسان ہوگی۔ جب پایہ تخت قبضے میں آجائے تو پھر دوسرے

(بسلسلۂ گزشتہ) لعنت ملامت کی اور پھر گولکنڈہ اور احمد نگری فوجوں کے درمیان اتحاد ہوگیا۔ ادھر بیجاپوری اُمراء نے جب دیکھا کہ ابوالحسن کو پیشوا بنانے سے کچھ فائدہ نہ ہوا تو اُسے انھوں نے پھر قید کردیا (حالانکہ یہ غلط ہے، وہ بیجاپور کے محاصرے تک برابر پیشوا رہا) حلیفوں نے بیجاپور کے محاصرے کو جاری رکھا۔ اس وقت بیجاپور کی امداد کے لیے کچھ برگی (مرہٹہ) فوجیں آگئیں جنھوں نے دشمن کو پریشان کرنا شروع کیا۔ جب یہ حالت ہوئی تو حلیفوں نے محاصرہ اٹھا دیا اور تمام ملک کو تاراج کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ دوبارہ نلدرگ کی راہ لی۔ اس وقت، ابراہیم قطب شاہ کا انتقال ہو (۹۸۹ھ م ۱۵۸۱ء) یہ سنہ غلط ہے ابراہیم کی قبر پر اُس کی وفات کا سنہ ۱۵۸۰ کندہ ہے اور فرشتے سے بھی یہی ثابت ہوتا ہے، نلدرگ کے اس محاصرے کے وقت محمد قلی قطب شاہ میر شاہ میر کے مشورے سے بہ نفس نفیس موقعۂ جنگ کی طرف توجہ کرتا ہے اس محاصرے کے وقت برہان مآثر کا مصنف وہی تفصیلات دیتا ہے جو فرشتے سے لیکر اوپر درج کیئے گئے جس میں آقا ترکمان (یا برہان مآثر کے مطابق وزیر الممالک) کی وفاداری اور مردانگی کا حال درج ہے یہاں جب کچھ پیش نہ گئی تو پھر یہ طے پایا کہ بیجاپور کی طرف توجہ کرکے اُس کا محاصرہ

علاقوں کا ہاتھ آنا کون بڑی بات ہے۔ درخت کی جب پیڑی کاٹ دی جائے تو شاخیں خود بخود نیچے آ رہیں گی۔
یہ تدبیر سب کو پسند آئی اس لیے ان فوجوں نے شاہ درگ کا محاصرہ اٹھا دیا اور بیجاپور کی راہ لی۔
اس وقت حلیفوں کے پاس تقریباً چالیس ہزار کی زبردست فوج تھی۔ بیجاپور پہنچکر انھوں نے پایۂ تخت کا محاصرہ
کر لیا۔ بیجاپور کی اس وقت جو حالت تھی وہ محتاج بیان نہیں۔ اکثر اُمراء و سردار بددل اور غلاموں کی حکومت سے

(بسلسلۂ گزشتہ) کر لینا چاہیے۔ لہٰذا دونوں فوجیں روانہ ہوگئیں۔ دریائے بھیما تک آگے بڑھتے ہوئے چلے گئے اور
یہاں پہنچکر قیام کیا اور بیس روز تک پڑے رہے۔ آخر کار محمد قلی قطب شاہ اس جنگ سے بیزار ہو کر بیجاپور کے
محاصرے کا ارادہ فسخ کر کے اپنے دار الخلافہ کو روانہ ہوگیا۔ محمد قلی کا جانا تھا کہ سید مرتضیٰ بھی اپنی فوجوں کو لیکر احمدنگر کی
طرف چلدیا۔ اس طرح بیجاپور کا دوسرا محاصرہ نہ ہوا۔ البتہ چلتے وقت قطب شاہ نے اپنی تھوڑی فوج امیر زبیل
استرآبادی کے تحت اور سید مرتضیٰ نے اپنی تھوڑی سی فوج بعض سرداروں کے تحت چھوڑ دی تھی کہ وہ سرحدی
علاقوں کو فتح کریں۔ اس طریقے سے برہان مآثر کے مصنف نے فرشتے سے بہت کچھ اختلاف کیا ہے۔ سب سے بڑا اختلاف تو
یہی کہ اس نے نلدرگ کے دو محاصروں کی تفصیل دی ہے۔ دوسرے محاصرے کا ذکر جو اُس نے کیا ہے اُس کی تصدیق فرشتے سے
ہوتی ہے۔ مگر وہ فرشتے کے اعتبار سے پہلا محاصرہ ہے (جو اُمرائے حبش کے زمانے میں ہوا) اور ان دو محاصروں کے
درمیان بیجاپور کے محاصرے کا حال دیا گیا ہے۔ حالانکہ بیجاپور کا محاصرہ باعتبار فرشتہ نلدرگ کے اس محاصرے کے بعد ہے
جس میں کہ آغا ترکمان نے ایسی مردانگی اور جواں مردی دکھلائی لیکن برہان مآثر کا مصنف آغا ترکمان والے
محاصرے کو بیجاپور کے محاصرے کے بعد بتاتا ہے اور فرشتے کے اعتبار سے پہلے یہ محاصرہ ہوتا ہے اُس کے بعد بیجاپور کا۔
پھر اُس نے لکھا ہے کہ بیجاپور کے محاصرے کے وقت ابراہیم قطب شاہ زندہ تھا اور فوجوں کے ساتھ۔ حالانکہ اس محاصرے سے ایک سال
پہلے ہی اس کا انتقال ہو چکا تھا اور اُس کا بیٹا محمد قلی قطب شاہ بیجاپور کے حملے کے وقت اپنی فوجوں کے ساتھ تھا۔ جب بیجاپور سے
محاصرہ اٹھ گیا تو پھر نلدرگ کی طرف حلیفوں نے توجہ نہیں کی لیکن سید علی ماژندرانی نے لکھا ہے کہ پھر نلدرگ کا محاصرہ
ہوا جو غلط ہے۔ اس طریقے سے برہان مآثر کے بیانات میں گنجلک ہے اسی لیے وہ قابل اعتبار نہیں۔ اس کے علاوہ
ان حملوں، لڑائیوں کے سلسلے میں اور تفصیلات دی ہوئی ہیں جن کو بخوف طوالت نظر انداز کیا گیا۔ (ان اختلافات کے لیے ملاحظہ ہو
تاریخ قطب شاہی، برہان مآثر، تاریخ فرشتہ، تحفۃ الملوک، بساتین السلاطین)۔ [1] تاریخ فرشتہ۔

ناراض، بادشاہ کم عمر و کمسن، حبشی برسرِ اقتدار، فوج پریشان و منتشر، باہمی کشمکش و فساد کی بنا پر ایک امیر کو دوسرے پر اعتبار نہیں۔ جو کچھ فوج قلعے کے اندر تھی وہ بالکل ناکافی۔ ان نازک و ناگفتہ بہ حالات کے اندر احمد نگر اور گولکنڈہ کی فوجیں بیجاپور کا محاصرہ کر لیتی ہیں۔ حبشیوں کو سوائے اس کے چارہ نہیں رہا کہ محصور ہو جائیں۔ کیونکہ زیادہ سے زیادہ اُن کے پاس اس وقت دو تین ہزار فوج تھی۔[1] اتنی تو ہمت نہ تھی کہ باہر نکل کر مردانہ وار مقابلہ کرتے۔ مجبوراً قلعے کے اندر ہی رہ کر جنگ کی کچھ تیاریاں کرنے لگے۔ بہرحال مقابلے کے لیے کچھ انتظام کرنا ضروری تھا، لہٰذا انھوں نے آنکس خاں اور عین الملک کو بغرضِ امداد فرمانِ شاہی کے ذریعے طلب کیا۔ یہ لوگ آنے کو تو آ گئے مگر حبشیوں سے سخت مخالفت تھی اور اُن کے اقتدار کو وہ پسند نہیں کرتے تھے۔ ساتھ ہی اُن پر ان لوگوں کو کوئی اعتماد و اعتبار بھی نہ تھا۔ اور پھر عین الملک سے حبشیوں کے جو تعلقات رہے ہیں اُن کو بیان کر دیا گیا ہے اور وہ مزید تشریح کے محتاج نہیں۔ بھلا ایسی صورت میں ان دو فریقوں کے درمیان کیا اتحاد عمل ہو سکتا تھا؟ ان وجوہات کی بنا پر آنکس خاں اور عین الملک نے اپنی فوجوں سمیت قلعۂ بیجاپور سے باہر ہی اپنا پڑاؤ ڈال دیا اور قلعے میں داخل ہونے سے احتراز کرتے تھے۔ ان امیروں کے ساتھ تقریباً کوئی سات آٹھ ہزار فوج تھی۔[2] انھوں نے اپنا کیمپ اللہ پور کے دروازے کی جانب ڈال رکھا تھا۔ اسی اثنا میں حلیف افواج اور عادل شاہی فوجوں کے درمیان جنگ شروع ہو گئی۔ اسی جنگ کے سلسلے میں عین الملک اور آنکس خاں کی فوجوں سے بھی دشمن کی جھڑپ ہو جایا کرتی تھی۔ اس طریقے سے سلسلۂ جنگ عرصے تک جاری رہا۔ عموماً عادل شاہی فوج کو شکست کا منھ دیکھنا پڑتا تھا، اور یہ ایک بالکل قدرتی امر بھی تھا۔ اس لیے کہ ایک طرف باہمی رنج و فساد، دشمنی اور رقابت کی وجہ سے اتحاد و اتفاق بالکل مفقود، دوسری طرف دو زبردست فوجیں اور وہ بھی متحد و متفق۔ جب صورتِ حال یہ ہو تو عادل شاہیوں کا شکست کھانا نا تعجب خیز امر ہوگا۔ اس پر مزید بدقسمتی یہ ہوئی کہ موسم بارش کا تھا جس کی وجہ سے عین محاصرے کے زمانے میں قلعے کی بیس گز دیوار گر گئی۔ محصورین کے دل بیٹھ گئے اور اوروں کو یقین ہو گیا کہ اب بیجاپور پر اُن کا قبضہ ہو جائے گا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ

[1] تاریخ فرشتہ۔

[2] حدیقۃ العالم۔

قبضہ ہونے میں کوئی بات باقی نہ تھی۔ عین الملک اور انکس خاں جو اب تک محض قلعے کے باہر پڑے ہوئے تھے بجائے اس کے کہ ایسے نازک وقت میں اپنے ملک اور بادشاہ کی خدمت کرنے کو اپنا فرض سمجھتے اُلٹے دشمنوں سے جا ملے۔ اور انھوں نے اپنی اس حرکت سے انتہائی کورنمکی، غداری اور ملک فروشی کا ثبوت دیا۔ محض ذاتی مخاصمتوں کی بنا پر انھوں نے ملکی مفاد کو ٹھکرا دیا۔ جہاں یہ چیز ذاتی طور پر ان لوگوں کے کیرکٹر کی سخت کمزوری کو ظاہر کرتی ہے وہیں اس سے اس زمانے کی عام ذہنیت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اُس میں کس قدر گندگی اور ناپاکی کے اثرات سرایت کر چکے تھے۔ ان بیجاپوری اُمراء کی اس غدارانہ حرکت سے بیجاپور کے دشمنوں کا اور بھی پلہ بھاری ہو گیا اور اُسی نسبت سے بیجاپور کی طاقت میں انحطاط ہوا۔ غرض تھوڑے ہی عرصے میں حالات نے نہایت خطرناک صورت اختیار کر لی اور اب وہ دن دور نظر نہ آتا تھا کہ بیجاپور پر اُس کے دشمنوں کا قبضہ ہو جائے۔ احمدنگر کے جرنیلوں اور محمد قلی قطب شاہ نے اب تہیہ کر لیا کہ دوسرے روز صبح کو حملہ کر کے بیجاپور پر قبضہ کر لیں مگر اس کے بعد بھی ایسے واقعات رونما ہوئے کہ تمام صورت حال بدل گئی۔

حبشیوں کی معزولی اور شاہ ابوالحسن کا برسرِ اقتدار آنا

اگر حملہ کرنے کی تدبیر پر فوراً عمل کیا جاتا تو یقیناً وقت واحد میں ان حلیفوں کو کامیابی ہو جاتی۔ مگر اس تدبیر کو عملی جامہ پہنانے میں تساہل کیا گیا، اور تساہل کی ایک خاص وجہ تھی۔ وہ یہ کہ احمدنگر کے فوجی سرداروں کے درمیان اتحاد نہ تھا۔ نظام شاہ نے یا زیادہ صحیح طور پر اُس کے پیشوا نے یہ بڑی غلطی کی تھی کہ دو ایسے سرداروں کو اس مہم پر روانہ کیا تھا جن میں سخت چشمک تھی۔ چونکہ دونوں پلے کے لوگ تھے ان میں بنتی نہ تھی خصوصاً سید مرتضیٰ امیر الامرائے برار اس کو پسند نہ کرتا تھا کہ بہزاد الملک جیسے کم عمر ناتجربہ کار نوجوان کو اُس پر فوقیت دی جائے، اور وہ سپہ سالار رہے[1]۔ اسی نااتفاقی کی بدولت کشور خاں کے زمانے میں بہزاد الملک کو ایسی فاش شکست ہوئی تھی۔ اب بھی یہی صورت حال پیدا ہو گئی۔ سید مرتضیٰ یہ نہیں چاہتا تھا کہ یہ حملہ کامیاب ہو[2] اور بہزاد الملک کی ناموری ہو۔ اس لیے اُس نے عین اُس وقت میں جبکہ بیجاپور

---

[1] ۔ تاریخ فرشتہ

[2] ۔ ؍؍ ؍؍ ۔

دشمنوں کا ایک لقمۂ تر بنا ہوا تھا حملہ کرنے میں تساہل کیا۔ بیجاپور کی حالت اس وقت ایسی نازک تھی اور مدافعتی انتظام اس قدر کمزور تھا کہ اگر معمولی حملہ بھی ہو جاتا تو شاید بیجاپوری مقابلے کی تاب نہ لا سکتے۔ مگر سید مرتضٰی باوجود یہ جاننے کہ وہ ایک زرین اور نایاب موقع کھو رہا ہے اس معاملہ کو لیت ولعل میں ڈال دیا۔ اتنی فرصت تو محصورین کو ملنی ہی تھی انھوں نے فوراً اپنی مدافعت کا انتظام ٹھیک کر لیا۔ اس عرصے میں اُس دیوار کی بھی مرمت ہو گئی جو ٹوٹ گئی تھی اور کہیں نہ کہیں سے کچھ سپاہی اور کچھ فوج بھی فراہم کر لی گئی۔ اس طرح وہ اس قابل ہو گئے کہ ان حملہ آوروں کا ترکی بہ ترکی جواب دیں۔

ادھر حملہ آور فوجوں نے تھوڑا سا تساہل کر کے موقع کو ہاتھ سے کھو دیا اور اُس طرف حبشی اُمراء کو بھی کچھ عقل آ گئی اور حالات کی نزاکت کا احساس پیدا ہوا۔ اور اُن کا جذبۂ وطن پرستی یکبارگی مشتعل ہو گیا۔ حبشیوں میں ہزار نقص اور ہزار بُرائیاں ہی مگر وہ ملک و مالک کے بڑے وفادار تھے۔ یہ ضرور ہے کہ بعض اوقات وہ اپنے ذاتی مفاد کے لیے شہر اور ریاست میں ایک اودھم مچا دیتے تھے مگر فی الواقع وہ دشمن ریاست و بادشاہ نہ تھے۔ یوں آپس میں لڑنے کو کون نہیں لڑتا مگر اس کے معنی یہ نہیں کہ وہ ملک فروشی پر آمادہ تھے یا حقیقی معنی میں سلطنت کی بربادی کے درپے تھے۔ بلکہ اس کے خلاف وہ وفاداری اور نمک حلالی کو اپنا ایمان سمجھتے تھے۔ جب انھوں نے دیکھا کہ اُن کے ہٹ پر اڑے رہنے سے اندیشہ ہے کہ بیجاپور قطب شاہیوں اور نظام شاہیوں کے قبضے میں چلا جائے اور خود ریاست خطرہ میں ہے تو اس فکر میں ہوئے کہ کسی طرح اس بلا کو ٹال دیا جائے خواہ اُس میں تھوڑا سا ذاتی نقصان ہی کیوں نہ ہو۔ وہ یہ بھی جانتے تھے کہ سارا فساد اس لیے ہے کہ حکومت کی باگ اُن کے ہاتھ میں آ گئی ہے۔ اکثر بڑے بڑے اُمرا جن کی اس وقت مدد ایک غیر معمولی چیز ثابت ہو گی محض اس لیے مدد کرنے سے جی چرا رہے ہیں کہ اُن کو حبشیوں کی اطاعت کرنی پڑے گی۔ اگر وہ حکومت سے دست بردار ہو جائیں یا کم از کم کسی دوسرے شخص کو سب سے اعلیٰ عہدہ (وکیل السلطنت) پر فائز کر دیں تو بہت سارے اُمراء اور سرداران فوج جو اس وقت دست کشیدہ بیٹھے ہیں بیجاپور کی مدد کو آ پہنچیں گے۔ اس لیے ان حبشیوں نے بالاتفاق یہ فیصلہ کیا کہ کم از کم تھوڑے عرصے کے لیے حکومتی معاملات سے کنارہ کش ہو جائیں۔ اس لیے وہ چاند بی بی کے حضور میں گئے اور یہ ظاہر کیا کہ ان کی حکومت کے کچھ اچھے نتائج برآمد نہیں ہوئے ہیں۔ بیجاپور دشمنوں کا لقمۂ تر بنا چاہتا ہے اس لیے وہ حکومت سے دست بردار ہونا چاہتے ہیں۔ چاند بی بی جس کسی کو مناسب سمجھے ملک کے انتظام کے لیے مقرر کر دے۔[1]

[1] تاریخ فرشتہ

چاند بی بی بھی ان کے جذبۂ وفاداری سے متاثر ہوئی۔ اور اُن کے اس ایثار کو بہ نظر استحسان دیکھا، اُن کی خطائیں معاف کر کے شاہ ابوالحسن کو جو شاہ طاہر کا بیٹا تھا انھی حبشیوں کی صلاح سے منصب امیر جملگی[1] پر سرفراز کیا۔ بادشاہ نے بھی رسم زمانہ کے مطابق ابوالحسن کو خلعت فاخرہ عطا کیا، اس طرح وزارت یا حکومت وقت میں تبدیلی پیدا ہو گئی۔ اب حکومتی معاملات حبشیوں کی بجائے ابوالحسن کے ہاتھ میں آ گئے۔ اگرچہ فرشتے نے یہ ظاہر کیا ہے کہ امیر جملگی کا عہدہ ابوالحسن کو دیا گیا مگر بعد کے واقعات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ محاصرے کے زمانے تک یہ بیجاپور میں مختار کُل تھا اور باقی سب عہدہ دار اُس کے ماتحت تھے۔

حکومت میں تبدیلی ہونا ہی تھی کہ آن کی آن میں بیجاپور کی حالت بدل گئی، جس سے ایک طرف ابوالحسن کی لیاقت اور اُس کی ہر دلعزیزی ظاہر ہوتی ہے تو دوسری طرف حبشیوں سے ملک کی عام ناراضی۔ وہ تمام اُمرا اشراف و اعیان جو اب تک بددل و ناراض ہو کر اپنے اپنے گھر بیٹھ چکے تھے فوراً ابوالحسن کی طلب پر اپنے وطن کی خدمت کے لیے حاضر ہو گئے۔ اور ساری نا اتفاقیاں اور دشمنیاں غائب ہو گئیں۔ اس طرح بیجاپور کی سیاسی حالت میں عظیم الشان فرق پیدا ہو گیا۔ کافی فوج جمع ہو گئی مزید کمک کی توقع تھی۔ عہدہ داران سلطنت اور اُمرائے عظام میں یکدلی اور یکجہتی پیدا ہو گئی۔ اور انھوں نے تہیہ کر لیا کہ اب دشمن کو نواحی بیجاپور سے مار نکالیں گے شہر میں ایک ہلچل پیدا ہو گئی۔ گویا مُردہ جسم میں از سرنو جان آ گئی۔ ابوالحسن نے سب سے پہلے اور سب سے بڑا کام یہ کیا کہ اُس نے برکی اُمرا کو اپنی مدد کے لیے طلب کیا اور کرناٹک کو اپنے کارندے روانہ کیے کہ وہاں سے برکی فوج کو مہیا کر کے جلد کمک روانہ کریں۔

سید مرتضیٰ سے گفت و شنید
بیجاپور کے محاصرے کا اٹھ جانا

ابوالحسن کا دوسرا اہم کام یہ تھا کہ اُس نے سید مرتضیٰ امیر الاُمرائے برار سے گفت و شنید شروع کی جو اس وقت احمد نگری فوج میں اک پایہ کا جنرل تھا۔ سید مرتضیٰ اور ابوالحسن کے

[1] یہاں پر فرشتے نے برہان مآثر سے جو اختلاف کیا ہے وہ ظاہر ہے۔ سید علی لکھتا ہے کہ یہ محض حبشیوں کی چال تھی جو اُسے قید سے نکال کر اس عہدے پر فائز کیا لیکن بعد میں نتائج حسب دلخواہ برآمد نہ ہونے کی وجہ سے پھر قید کر دیا۔ فرشتے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ برابر محاصرے کے ختم ہونے تک اس عہدے پر فائز رہا۔ اُمرائے برکی کو طلب کرنا فوج کی فراہمی فرشتے کے مطابق ابوالحسن کے کارنامے ہیں جو برہان مآثر اور تاریخ قطب شاہی میں اُمرائے حبش سے منسوب کیے گئے ہیں۔ ملاحظہ ہو تاریخ قطب شاہی و برہان مآثر۔

نہایت اچھے اور خوشگوار تعلقات تھے۔ سید مرتضیٰ کو شاہ ابوالحسن سے عزیزداری بھی تھی[1] اور چونکہ شاہ طاہر سے اُس کو
بڑی عقیدت تھی اس لیے ابوالحسن کی بھی وہ عزت اور احترام کرتا تھا۔ ان وجوہات کی بنا پر ان دونوں کے درمیان
گہری دوستی تھی۔ اسی دوستی کی بنا پر شاہ ابوالحسن نے سید مرتضیٰ سے نامہ و پیام شروع کیا۔ اُس سے درخواست کی کہ
کسی طرح کوشش کر کے قطب شاہ کو راضی کر لے اور بیجاپور کا محاصرہ اٹھا دے۔ سید مرتضیٰ ایک تو اُس دوستی اور عقیدت کی
بنا پر جو اسے ابوالحسن سے تھی اور نیز اس وجہ سے بھی کہ وہ اس مہم کی کامیابی کو دل سے نہ چاہتا تھا اس فکر میں ہوا کہ
کسی طرح بیجاپور کا محاصرہ اٹھا دیا جائے۔ ابوالحسن نے اُسے یہ دھمکی بھی دی تھی کہ اگر محاصرہ نہ اٹھایا جائے گا تو تھوڑے ہی
عرصے میں اُمرائے برکی کی ایک زبردست فوج مدد کے لیے آجائے گی اور اُس وقت تلنگیوں کا نہ صرف یہاں ٹھہرنا
مشکل ہو جائے گا بلکہ واپسی بھی پُرخطر ہو جائے گی۔ اور جب تک اپنی اپنی سرحد کو نہ پہنچ جائیں گے ان کی اور ان کی
فوجوں کی سلامتی مشکل ہے۔ اس دھمکی کا تو شاید ہی اثر ہوا ہوگا مگر اصلی وجہ وہی بہزادالملک سے دشمنی اور رقابت تھی
جس کی بنا پر سید مرتضیٰ بیجاپور کے محاصرے کے اٹھانے کی فکر کرنے لگا۔ سب سے پہلے اُس نے بیجاپوری اُمرا
آنکس خاں اور عین الملک کو طلب کیا۔ انھیں نصیحت کی اور سمجھایا کہ ایسے وقت میں جبکہ بیرونی حملے ہو رہے ہوں
اپنے بادشاہ سے غداری کرنا اور اُس کے دشمنوں سے ملحق ہو جانا انتہائی کورنمکی اور نمک حرامی کی دلیل ہے۔ اس سے
بڑھ کر کوئی فعل اور کوئی حرکت قبیح اور مذموم نہیں ہو سکتی۔ مناسب یہ ہے کہ [illegible] بیجاپور شاہ کی خدمت میں حاضر ہو کر
وطن کی خدمت پر کمربستہ ہو جائیں۔ ان اُمرا پر ابوالحسن کی اس گفتگو کا بہت اثر ہوا اور چونکہ اب حکومت وقت میں
تبدیلی بھی پیدا ہو چکی تھی، اُمرائے حبش کے اقتدار کا زمانہ ختم ہو چکا تھا اور ان کی بجائے شاہ ابوالحسن بیجاپور پر
کارفرما تھا لہٰذا ان باغی اُمرا کو مخالفت کی کوئی وجہ باقی نہ رہی تھی اس لیے وہ قطب شاہی اور احمدنگری فوجوں
سے علیحدہ ہو کر بیجاپور میں داخل ہو گئے[2] اور بادشاہ کی آستان بوسی کا شرف حاصل کیا۔ ان کی آمد کی خبر سن کر

---

[1] ۔ تاریخ قطب شاہی۔

[2] ۔ برہان مآثر سے ظاہر ہوتا ہے کہ عین الملک اُمرائے حبش کے اقتدار کے زمانے ہی میں اُن کی [illegible]
دشمنوں سے علیحدہ ہو کر بیجاپور میں داخل ہو گیا۔ یہ صحیح نہیں معلوم ہوتا کیونکہ حبشیوں کے زمانے میں اُس کی سخت مخالفت ہو رہی تھی۔

بہت سارے اُمرا اور اعیان دولت بھی اپنی فوجیں لیکر آگئے۔ یہ گویا اک زبردست اخلاقی اثر تھا جو اُن کی آمد کی وجہ سے پیدا ہوا۔ اس طریقے سے شاہ ابوالحسن کی کوششوں سے تھوڑے ہی عرصے میں بیس ہزار[1] کی ایک جرار فوج بیجاپوری جھنڈے کے نیچے جمع ہوگئی۔ کچھ برگی مرہٹے بھی بغرض امداد آن پہنچے۔ اور یہ صرف ایک مہینے کی کوششوں کا نتیجہ تھا۔

برگی افواج نے حملہ آوروں کو ایسا پریشان کیا کہ اُن کے ہوش و حواس قایم نہ رہے۔ یکایک ٹوٹ پڑنا، چھاپے مارنا، اچانک حملے کرنا، شبخون مارنا، رسد روکنا، غلہ و اذوقہ کا سامان بند کر دینا، مال و اسباب لوٹ لینا، بے دردی سے قتل و غارت کرنا یہ اُن کی معمولی خصوصیات تھیں۔ ایسے پریشان کن دشمن سے خدا ہی پناہ میں رکھے کوئی سامنے ڈٹ کر لڑے تو اُسکا مقابلہ بھی کیا جائے۔ جو غفلت کا متلاشی ہو اور عین اُسی وقت حملہ کیا کرے جبکہ فوجیں بے خبر ہوں اُس کا کیا بگاڑا جا سکتا ہے۔ ان برگیوں نے اب یہ کارروائی شروع کردی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قطب شاہی اور نظام شاہی فوج پریشان ہوگئی۔ ان کے ہاں ابتری پھیلنے لگی۔ غلہ ختم ہوگیا۔ مزید رسد کے راستے مسدود ہوگئے۔ اس طرح قحط نے اپنا بھیانک منھ دکھانا شروع کیا۔ محاصرہ طول کھینچ چکا تھا۔ تقریباً ۴ مہینے[1] گذر چکے تھے۔ کچھ حسب دلخواہ نتائج برآمد نہ ہوئے تھے۔ فوج کے سپاہی بددل اور بیزار ہو رہے تھے۔ غرض ہر طریقے سے ہر شخص کا دل اس مہم سے بیزار آگیا تھا۔ محمد قلی قطب شاہ کو کچھ کرتے دھرتے بن نہ پڑتی تھی۔ اور اسی فکر میں تھا کہ کسی طرح اس الجھن سے نجات پائے۔ اسی اثنا میں بعض قطب شاہی امیروں نے جن کو شاہ میرزا اصفہانی سے کچھ کدورت تھی بادشاہ کو سمجھایا کہ مرزا نے بادشاہ کو موقعۂ جنگ پر طلب کرکے نہ صرف اُسے بے وجہ تکلیف دی ہے بلکہ اُس کی تحقیر و تذلیل کا باعث ہوا ہے۔ کیونکہ سلاطین دکن کا ہمیشہ سے یہ قاعدہ رہا ہے کہ اُسی وقت ایک بادشاہ دوسرے بادشاہ کی مدد کے لیے بہ نفس نفیس موقعۂ جنگ پر جاتا ہے کہ جبکہ دوسرا

(بسلسلۂ گزشتہ) دراصل وہ ابوالحسن کے زمانے میں سید مرتضیٰ کی کوششوں سے اپنی ملکی فوج سے ملحق ہوگیا جیسا کہ فرشتے نے ظاہر کیا ہے اور یہ ایک قرین قیاس امر بھی ہے۔ سید علی مازرندرانی لکھتا ہے کہ وہ آٹھ روز تک دشمنوں کے کیمپ میں رہا اور جب وہ چپکے سے علحدہ ہونا چاہا تو حلیفوں کی فوج نے اس کا تعاقب کیا۔ اُس کے بہت سارے لوگ مارے گئے اور بہت کچھ مال و اسباب لوٹا گیا۔ (ملاحظہ ہو برہان مآثر و تاریخ قطب شاہی)۔

[1] تاریخ قطب شاہی۔

[2] تاریخ فرشتہ۔

بادشاہ بھی وہاں موجود ہوتا ہے اگر وہ خود موجود نہ ہو اور پھر بھی مدد طلب کرے تو شاہان سلف کا یہ طریقہ تھا کہ وہ اپنے کسی سردار کے تحت ایک فوج بھیج دیتے تھے۔ مگر اب یہاں مرتضیٰ نظام شاہ تو آیا ہی نہیں اور قلی قطب شاہ محض شاہ میرزا کے کہنے پر احمد نگر کا افواج کی مدد کے لیے آن پہنچا۔ اس میں بادشاہ کی سخت ذلت ہے[1]۔ محمد قلی قطب شاہ کے ذہن میں یہ بات آ گئی۔ وہ شاہ میرزا پر بہت بگڑا اور وہاں سے بیجاپور کا محاصرہ اٹھا کر چلد ینے کی فکر میں تھا۔ ادھر فوج بھی سخت بیزار تھی۔ کامیابی تو کجا الٹے پریشانیاں گلے کا ہار تھیں۔ اب اس پر بھی محاصرے کا جاری رکھنا دانشمندی سے بعید تھا۔ احمد نگر کے سرداروں میں سے سید مرتضیٰ تو ابتدا ہی سے اس کوشش میں تھا کہ محاصرہ اٹھ جائے، اور اب قطب شاہ بھی اُس کا ہمخیال ہو گیا تھا۔ چنانچہ معاملات پر غور کرنے کے لیے ایک مشورت کی مجلس طلب کی گئی۔ اس میں یہ طے پایا کہ بیجاپور کا محاصرہ اٹھا دینا چاہیئے احمد نگر کی فوج پھر سے شاہ درگ کا محاصرہ کرلے۔ بہزاد الملک اور سید مرتضیٰ اُس طرف روانہ ہوں۔ قطب شاہ گلبرگہ کا محاصرہ کر کے اُسے فتح کرلے[2]۔ ان تدابیر پر عمل کرنے کے لیے احمد نگری اور قطب شاہی فوجوں نے بیجاپور کا محاصرہ اٹھا کر اپنا اپنا راستہ اختیار کیا۔

بیجاپور کے محاصرے نے بہت طول کھینچا۔ فرشتے سے ظاہر ہوتا ہے کہ تقریباً ۲ مہینے تک محاصرہ جاری رہا اور اس وقت بیجاپور کی اندرونی حالت جیسی کچھ بھی تھی ظاہر کردی گئی۔ اتنی ابتری کے باوجود ابوالحسن کے وزیر ہونے سے صورت حال کا بدل جانا، آن کی آن میں پانسہ کا پلٹ جانا، حملہ آوروں کا محاصرہ اٹھانے پر مجبور ہونا درحقیقت ابوالحسن کی ہر دلعزیزی اور اُس کی غیر معمولی قابلیتوں کی دلیل ہے۔ اس کی انتظامی قابلیت، اس کا تدبر، اس کی فراست نے بیجاپور کی ڈوبتی کشتی کو بچا لیا۔ اگر ابوالحسن اس وقت برسر کار نہ آتا تو تھوڑے ہی عرصے میں طلیف بیجاپور پر قبضہ کرنے میں کامیاب ہو جاتے اور غالباً اس ریاست کی اینٹ سے اینٹ بج جاتی۔ یا کم از کم بیجاپور اس بری طرح اُجڑتا کہ شاید سالہا سال میں یہ سلطنت پھر نہ سنبھل سکتی۔ اس موقع پر اُمرائے حبش کی تعریف کیے بغیر نہیں رہا جا سکتا۔ گو اُن کے پچھلے اور بعد کے افعال بہت کم تعریف کے مستحق ہیں، مگر عین وقت پر موقع کی اہمیت کو جان کر خود خوشی سے ایک دوسرے شخص کو با اقتدار

---

[1] حدیقۃ العالم و فرشتہ۔

[2] تاریخ فرشتہ۔

بنانے میں مدد دینا واقعی حب وطن کی ایک بہترین مثال ہے۔ اس وقت کہنا چاہیے کہ ابوالحسن کی لیاقت اور اُمرائے حبش کے تھوڑے بہت ایثار نے بیجاپور کے گڑے کام کو بنا دیا۔ فرشتہ بجا طور پر لکھتا ہے کہ "ہیچ ذی عقل تصور این معنی نہ کند کہ چہل ہزار سوار کارگزار بپائے قلعہ بیجاپور رسند و آن کہ دراں وقت زیادہ از دو سہ ہزار کس در قلعہ نبودہ باشد و بعد از یکسالہ محاصرہ خاشاکے ازاں بلدہ متصرف نشدہ خائب و خاسر بممالک خود شتابند۔ فیلاں و اثاثہ سلطنت ہر دو بادشاہ بجوزہ دیوان صاحبقران در آمد"[1] اور بعد میں اس غیر معمولی کامیابی کو بادشاہ کی اقبالمندی اور تائید غیبی پر محمول کرتا ہے لیکن خدا کی امداد اور ابراہیم کے اقبال کے ساتھ ساتھ یقیناً ابوالحسن کی بھی کچھ قابلیتوں نے اس موقع پر بیجاپور کی مدد کی۔

جب حملہ آور فوجوں نے بیجاپور کا محاصرہ اٹھا لیا تو انھوں نے تدبیر تو خوب ظاہر کی تھی کہ بہزاد الملک اور سید مرتضی شاہ درگ کے قلعے کا محاصرہ کر لیں اور اُسے فتح کر کے احمد نگر کی ریاست میں داخل کر لیں محمد قلی قطب شاہ حسن آباد گلبرگہ کو فتح کرے۔ مگر ان تدابیر پر کامیابی کے ساتھ عملدرآمد نہ ہوا۔ اس وقت مرتضی نظام شاہ کی نیم دیوانگی کی وجہ سے خود اندرونی حالات اُس ریاست کے خراب ہو رہے تھے اور اُمراء میں سخت نااتفاقیاں پیدا ہو رہی تھیں اس لیے احمد نگر کی فوج بجائے شاہ درگ کا محاصرہ کرنے کے سیدھے احمد نگر کی راہ اختیار کی۔ مگر جاتے ہوئے اتنا ضرور کیا کہ عادل شاہی علاقہ جات کو جو راہ میں پڑے تھے خوب تباہ و تاراج کیا۔ گلبرگہ اور مرنج کے علاقے خصوصیت کے ساتھ بُری طرح تباہ کیے گئے۔[2] محمد قلی قطب شاہ نے بھی سیدھے اپنے ملک کی راہ لی۔ البتہ اتنا ضرور کیا کہ اپنے ایک بہترین

---

[1] تاریخ فرشتہ۔

[2] برہان مآثر میں ان علاقوں کی تباہی و بربادی کی بہت تفصیل دی گئی ہے گلبرگہ کے متعلق سید علی لکھتا ہے کہ یہ دکن کا اس زمانے میں ایک بارونق شہر تھا۔ تاریخ قطب شاہی میں ان مقامات کے نام دیئے گئے ہیں جو تباہ و تاراج کیے گئے وہ حسب ذیل ہیں:۔

گلبرگہ، مرنج، رائے باغ، ہونگیری، پنالہ اور ستارہ وغیرہ۔ اس لوٹ مار کے بعد فرشتہ لکھتا ہے کہ قطب شاہی اور نظام شاہی فوجوں نے اپنے اپنے ملک کی راہ لی مگر برہان مآثر اور تاریخ قطب شاہی میں لکھا ہے کہ اس کے بعد نلدرگ کا

جنرل کو (جس کا نام امیر زنبیل استرآبادی تھا اور جسے حال میں مصطفےٰ خاں کے خطاب سے سرفراز کیا گیا تھا) گلبرگہ کی مہم پر نامزد کرتا گیا۔ اور اُس کے ساتھ ایک زبردست جرار فوج بھی بھیجدی کہ اس علاقے کو فتح کر کے قطب شاہی عملداری میں داخل کر دے۔ اس طرح قطب شاہیوں سے جنگ کا سلسلہ کچھ اور دن جاری رہا۔ اب مصطفےٰ خاں کے حملوں کو روکنے اور گلبرگہ کی مدافعت کے لیے بیجاپوری حکومت نے دلاور خاں حبشی کو ایک فوج کے ساتھ روانہ کیا۔ مگر دلاور خاں کی معرکہ آرائی کے واقعات قلمبند کرنے سے پہلے بیجاپور کی اندرونی حالت اور نئے انتظامات کے متعلق اک دو چار سطریں لکھدینی چاہئیں جو دشمنوں سے نجات پانے اور محاصرے کے اٹھنے کے بعد عمل میں آئے۔

ابوالحسن کا قید کیا جانا
اُمرائے حبش کا اقتدار

جب بیجاپور کا محاصرہ اٹھ گیا تو پھر ان حبشیوں نے کوشش کی کہ اقتدار اُن کے ہاتھ میں آ جائے۔ تھوڑے زمانے تک تو ابوالحسن کے ساتھ بالاتفاق کام کرتے رہے۔ مگر یہ کاغذ کی ناؤ بھلا کب تک چل سکتی۔ جس طرح ایک میان میں دو تلواریں، ایک اقلیم میں دو بادشاہ نہیں رہ سکتے اسی طرح ایک اقتدار کے دو دعویدار یکجا نہیں رہ سکتے۔ یہاں اب ابوالحسن اور حبشیوں کے درمیان اسی اقتدار کے لیے سخت رقابت پیدا ہو گئی۔ حبشیوں نے محض موقع کی نزاکت کا احساس کر کے اقتدار ابوالحسن کے سپرد کر دیا تھا۔ مگر اب چونکہ کوئی خطرہ باقی نہیں رہا تھا اس لیے ابوالحسن کی وہ کوئی ضرورت محسوس نہیں کر رہے تھے۔ اور چاہتے تھے کہ کسی حیلے سے اسے قید کر کے خود حکومت پر قابض و متصرف ہو جائیں۔ اس رقابت نے بالآخر کشیدگی پیدا کر دی۔ ابوالحسن تو غریب اکیلا تھا اور یہ تین اُس کے خلاف میں

(بسلسلۂ گزشتہ) محاصرہ کیا گیا۔ اس محاصرے کی جو تفصیلات دی ہیں وہ وہ محاصرہ ہے جس کو فرشتے نے بیجاپور کے محاصرے سے پہلے لکھا ہے جس کی تفصیل دی گئی یعنی آقا ترکمان کی وفاداری کا جس میں ذکر ہے۔

برہان مآثر اور تاریخ قطب شاہی کے مصنفین کا بیان ہے کہ جب بیجاپور کے محاصرے سے فوجیں لوٹی ہیں اور نلدرگ کا ارادہ کیا گیا اُس زمانے میں ابراہیم قطب شاہ کا انتقال ہوا، فوج نانڈگاؤں میں تھی کہ بادشاہ کے انتقال کی خبر ملی۔ اس کے بعد محمد قلی قطب شاہ شاہ میر کے اصرار سے نلدرگ کے محاصرے کے لیے آیا۔ فرشتے کے اعتبار سے ان واقعات کو گزر کر ایک سال ہو گیا ہے اور یہ بیجاپور کے محاصرے سے پہلے کے ہیں۔ مگر یہاں ان کو اس طرح بیان کیا گیا ہے (دیکھو تاریخ قطب شاہی اور برہان مآثر و تاریخ فرشتہ)۔

متحد و متفق۔ کہاں تک ان کی فریب کاریوں سے محفوظ رہتا۔ کوئی نہ کوئی موقع ہاتھ آگیا ہوگا کہ ابوالحسن کو غفلت میں پاکر انھوں نے قید کر دیا[1]۔ ابوالحسن کا قید ہونا ہی تھا کہ پھر حکومت کی کل ان حبشیوں کے ہاتھ میں آگئی اِس طرح ابوالحسن کی حکومت اور اُس کے اقتدار کا زمانہ بیجاپور کے محاصرے کے اٹھنے کے بعد ہی ختم ہو جاتا ہے۔ پھر حسب معمول یا حسب سابق "اتحاد ثلاثہ" اہل حبش قایم ہوتا ہے جس میں کہ اخلاص خاں آتالیق اور عہدہ دار اعلیٰ کی حیثیت سے کام کرتا ہے۔ اگر حبشیوں کی اس کارروائی پر تنقیدی نظر کی جائے تو سوائے اسکے اور کچھ نہیں لکھا جا سکتا کہ انھوں نے انتہا درجے کی احسان فراموشی سے کام لیا کہ ایک ایسا شخص جو پورے ملک اور پوری ریاست کا محسن تھا اس کے ساتھ یہ بُرا سلوک کیا۔ ان کی مزید احسان فراموشی کی دلیل یہ ہے کہ مقصود خاں حبشی جیسے محسن کو بھی انھوں نے قید کر ڈالا۔ یہ وہی شخص ہے جس نے ان کو عین الملک کی قید سے بچایا تھا مگر اُس کے احسان کے باوجود۔ انھوں نے اسے اس وجہ سے قید کر ڈالا کہ وہ زیادہ طاقتور ہوتا جا رہا تھا۔

---

[1] اوپر جو کچھ لکھا گیا ہے اُس کی تفصیل تاریخ فرشتہ میں نہیں۔ فرشتہ محاصرۂ بیجاپور کے اٹھنے کے بعد ابوالحسن کا ذکر ہی نہیں کرتا۔ حالانکہ وہ خود لکھتا ہے کہ محاصرۂ بیجاپور کے زمانے میں ابوالحسن مقتدر رہا، اور حبشی حکومت سے کنارہ کش ہو گئے تھے۔ بعد کے واقعات کے سلسلے میں وہ یکدم اخلاص خاں اور دیگر حبشی اُمراء کا اس طرح ذکر کرنے لگتا ہے جیسے کہ وہی حکومت پر فائز ہیں۔ یہ نہیں ظاہر کرتا کہ کس طرح ان حبشیوں نے ابوالحسن کو حکومت سے خارج کیا۔ البتہ بساتین السلاطین سے یہ واضح ہوتا ہے کہ حبشیوں نے چندے ابوالحسن کے ساتھ بالاتفاق و بالاشتراک کام کیا۔ اُس کے بعد جب انھوں نے ابوالحسن کے ایسے آثار دیکھے جس سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بلا شرکت غیرے حکومت کا مالک ہونا چاہتا تھا تو خود پیش دستی کر کے ابوالحسن کو انھوں نے قید کر ڈالا۔ چونکہ دوران محاصرہ میں ابوالحسن حکومت پر فائز تھا اس لیے اندازہ یہی ہوتا ہے کہ محاصرے کے بعد حبشیوں نے اسے حکومت سے خارج کر دیا اور حسب سابق وہی حاکم ہو گئے۔ ملاحظہ ہو تاریخ فرشتہ و بساتین السلاطین۔ صفحہ (۱۶۱۰)۔

جب حکومت پھر ان حبشیوں کے ہاتھ میں آگئی تو انھوں نے اپنے میں کے ہی ایک آدمی کو امیر زنبیل استرآبادی کے مقابلہ کو روانہ کیا۔ یہ شخص دلاور خاں تھا۔ سب سے پہلی مرتبہ اب وہ ایک خاص حیثیت کے ساتھ ہمارے سامنے آتا ہے۔ یوں تو جب سے کہ حبشی گروہ حکومت پر قابض تھا یہ شخص بھی حکومت کا شریک رہا، اور حکومت کے کسی نہ کسی بڑے عہدے پر فائز رہا[۱] مگر اب تک وہ اک طرح پس پردہ تھا۔ اخلاص خاں چونکہ اس دوران میں پیش پیش رہتا ہے اس لیے حمید خاں اور دلاور خاں کے حالات اور ان کی کارگزاریاں ایک ثانوی حیثیت اختیار کر لیتی ہیں مگر اب وہ پہلی مرتبہ افسر اعلیٰ بنا کر ایک زبردست مہم پر بھیجا جا رہا تھا۔ یہ گلبرگہ کی مہم تھی اس مہم میں اس نے اپنے آپ کو ایسا کارداں ثابت کیا کہ تھوڑے ہی عرصے میں اس کی ترقی کا راستہ صاف ہو گیا اور اس مہم سے واپس ہونے کے بعد اخلاص خاں کا خاتمہ کر کے خود وکیل السلطنت ہو گیا۔ اس طرح یہ مہم اس کی ترقی کا پہلا زینہ ثابت ہوتی ہے اور یہاں سے اس کی کامیابیوں اور کامرانیوں کا دور طویل دور شروع ہوتا ہے جو تقریباً ۸ سال تک جاری رہتا ہے۔ بحیثیت اتالیق کے آٹھ سال تک بیجاپور میں برسر اقتدار رہنا یہ مدت بلکہ اس نے اپنی قابلیت کا غیر معمولی ثبوت دیا۔ یہی وہ ایک اتالیق ہے جس نے کہ ایک عرصے تک بیجاپور پر حکمرانی کی اور باقی جتنے اتالیق ہوئے ہیں ان کی حکومت صرف مہینوں پر مشتمل رہی[۲] چونکہ دلاور خاں سے آیندہ صفحات میں زیادہ عرصے تک سابقہ رہے گا اس لیے اس کے متعلق تمہیداً یہ دو چار لفظ لکھ دیئے گئے۔

دلاور خاں اور امیر زنبیل استرآبادی کا مقابلہ

محمد قلی قطب شاہ نے سات ہزار فوج دیکر مصطفیٰ خاں کو اس مہم پر نامزد کیا تھا۔ دوسرا امیر زنبیل استرآبادی اپنی فوجوں کو لیکر عازم گلبرگہ ہوا، اور دلاور خاں اپنے بیجاپوری لشکر کے ساتھ اس کے حملے کو روکنے کیلئے اس کے سر پر آن پہنچا۔ دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا، معرکہ نہایت سخت اور خونریز تھا۔ اس میں مصطفیٰ خاں کو شکست فاش ہوئی اور بہت سا مال غنیمت عادل شاہیوں کے ہاتھ لگا جس میں ۱۵۰ ہاتھی بھی شامل تھے[۳] اس زبردست کامیابی کے بعد دلاور خاں بیجاپور واپس ہوا۔ فرشتے نے اس جنگ کے متعلق صرف اسی قدر تفصیل دی ہے لیکن تاریخ قطب شاہی [illegible]

۱۔ اخلاص خاں کے زمانے میں وہ سرنوبتی کے عہدے پر فائز رہا۔

۲۔ کامل خاں اور کشور خاں کے عہد ہائے حکومت نو مہینوں پر مشتمل رہے۔ اخلاص خاں نے البتہ دو سال حکومت کی۔

۳۔ تاریخ فرشتہ۔

اور حدیقۃ العالم میں مزید تفصیلات درج ہیں۔ چونکہ یہ معرکہ نہ صرف بیرونی سیاسیات کے نقطۂ نظر سے اہم ہے بلکہ داخلی حالات پر بھی اس نے اپنے گہرے نقوش چھوڑے ہیں۔ اس کے متعلق مزید تفصیل دینا غیر مناسب نہ ہوگا۔ جیوش ثلاثہ نے اس قطب شاہی حملے کے روکنے کے لیے اپنے میں کے ایک آدمی کو سپہ سالار تو بنادیا مگر اب ضرورت اس امر کی تھی کہ مزید فوج ہو حال حال میں جو کچھ حالات پیش آئے تھے اُن کی وجہ سے اکثر اُمراء بددل اور پریشان ہو چکے تھے۔ اب انھوں نے ان اُمراء کی تالیف قلوب شروع کی خصوصیت کے ساتھ عین الملک اور انکس خاں کو بڑی چاپلوسی سے مدد کے لیے طلب کیا۔

اُن کو ہر طرح خوش کرنے کی تدبیر کی گئی[1]۔ جب یہ لوگ آ گئے تو بیجاپور کی ایک اچھی خاصی فوج تیار ہوگئی۔ اصل فوج تو بیس ہزار تھی۔ مگر عین الملک اور انکس خاں کے آجانے کی وجہ سے دس ہزار سوار کا اور اضافہ ہوا[2]۔ اخلاص خاں نے اس مہم پر اتنی کثیر فوج روانہ کردی کہ خود اُس کے پاس دارالخلافہ کے انتظام کے لیے بہت کم سپاہ رہ گئے۔ جب بیجاپور کی یہ زبردست فوج روانہ ہوئی تو قطب شاہیوں نے احمد نگر سے مدد طلب کی چونکہ موجودہ خارجہ پالیسی میں احمد نگر اور گولکنڈہ ہمرنگ و ہمخیال تھے وہاں سے دو تین ہزار کا ایک دستہ مرزا یادگار، رستم خاں، شمشیر خاں جیسے سرداروں کی سرکردگی میں روانہ کردیا گیا۔ بیجاپور کی فوج کے پہنچنے سے پہلے ہی یہ فوجیں قطب شاہی افواج سے ملحق ہوگئیں[3]۔ جب دلاور خاں کی فوج مخالفوں کے

---

[1] ۔ تاریخ قطب شاہی میں یہ لکھا ہے کہ اس جنگ میں پیشقدمی بیجاپوریوں کی طرف سے ہوئی چونکہ بیجاپور کی سلطنت یہ چاہتی تھی کہ اُن علاقہ جات کو حاصل کرلے جو اس سے پہلے کے معرکوں میں چھین لیے گئے تھے۔ اُن کے استخلاص کے لیے دلاور خاں کی سرکردگی میں یہ فوج بھیجی گئی تھی۔ دلاور خاں کے حملے کی مدافعت کی غرض سے قطب شاہ نے اپنی فوجیں روانہ کیں۔ حالانکہ تاریخ فرشتہ اور بساتین السلاطین میں اس کے خلاف میں واقعات درج ہیں جو اوپر دیئے گئے ہیں۔ تاریخ قطب شاہی صفحہ ۴۹۰ قلمی نسخہ کتب خانہ آصفیہ۔ برہان مآثر میں لکھا ہے کہ جب عادل شاہی امیروں نے دیکھا کہ حملہ آوروں کی فوجیں روانہ ہوگئی ہیں تو انھوں نے ان علاقوں کو حاصل کرنے کی فکر کی جو کہ محمد قلی نے اس عرصے میں اُن سے چھین لیے تھے۔ اس طرح یہ بھی قریب قریب قطب شاہی کی تصدیق کرتا ہے۔

[2] ۔ بساتین السلاطین۔

[3] ۔ تاریخ قطب شاہی۔

[4] ۔ تاریخ قطب شاہی قلمی نسخہ صفحہ ۴۹۰۔

بالکل مقابل ہوگئی تو اس نے ایک اچھا اور مناسب موقعہ دیکھ کر اپنا پڑاؤ ڈالا۔ بارش کا موسم تھا اس لیے چھ مہینے تک معمولی جھڑپ اور ہوتی رہی لیکن اس سے بڑھ کر کوئی جنگ نہ ہوئی۔ بارش کے ختم ہو جانے کے بعد بیجاپوری افواج نے دشمن کو تنگ کرنا شروع کیا جس کا نتیجہ ایک زبردست جنگ کی صورت میں ظاہر ہوا صبح سے دوپہر تک بڑی زبردست اور گھمسان کی لڑائی جاری رہی۔ عالم خاں و طاہر محمد خاں کے حملوں کی وجہ سے بیجاپوریوں کا میمنہ متزلزل ہو گیا، حالانکہ انکس خاں جو حصے کی سپہ سالاری کر رہا تھا اس نے بڑی مردانگی کے ساتھ مقابلہ کیا اور ایک عرصے تک حملے کو روکے رہا۔ صلابت خاں کے پے در پے صف شکن حملوں نے بیجاپوریوں کے میسرہ کو بھی شکست دے دی۔ اب کوئی بات باقی نہ تھی کہ بیجاپور کو شکست ہو جائے۔ مگر اس اثناء میں جنگ کی صورت حال بالکل بدل گئی۔ وہ یہ کہ جب میمنہ و میسرہ کو پسپائی ہوئی تو مخالفین یہ جان کر ان کے پیر میدان سے اکھڑ گئے ہیں فوراً بے ترتیبی کے ساتھ تاخت و تاراج اور لوٹ کھسوٹ میں مصروف ہو گئے۔ مال غنیمت کی تلاش میں یہ کامیاب فوج پریشان و منتشر ہونے لگی۔ دلاور خاں نے یہاں پر اپنی کاردانی اور فوجی قابلیت کا زبردست ثبوت دیا۔ وہ جنگ کے شروع ہونے سے پیشتر ہی فوج کے بہترین حصے کو لیکر کسی کمین گاہ میں چھپ گیا تھا کہ اچانک حملہ کر کے عین وقت پر مخالف فوج کو پریشان کردے جب جنگ کا یہ نقشہ ہو گیا تو وہ فوراً اپنی کمین گاہ سے نکل کر غنیم پر ٹوٹ پڑا جو اس وقت فتح کے یقین اور لوٹ مار کی فکر میں پریشان تھا۔ مرزا یادگار[1] اور امیر زنبیل ابھی تک کچھ فوج کے ساتھ میدان میں ڈٹے ہوئے تھے۔ دلاور خاں کا پہلا حملہ ان پر ہوا۔ یہ تھوڑی سی فوج دلاور خاں کے زبردست حملے کی تاب نہ لا سکی۔ بالآخر شکست ہوئی۔ جب اس شکست کی خبر پریشان و منتشر حصہ ہائے فوج کو ملی تو میدان چھوڑ کر فوراً بھاگ نکلی۔

میدان دلاور خاں کے ہاتھ رہا۔ کئی قطب شاہی اور نظام شاہی ہاتھی[2] اور بہت کچھ مال غنیمت بیجاپوریوں کے ہاتھ آیا۔ بساتین السلاطین کے مطابق بیس ہاتھی عادل شاہیوں کو ہاتھ لگے۔ اس طرح قطب شاہیوں کا یہ

---

[1] بساتین السلاطین۔

[2] برہان مآثر سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھیوں کی تعداد (۱۳۵) تھی۔ بساتین السلاطین کا مصنف (۲۰) بتلاتا ہے۔ فرشتہ (۱۵۰)۔

حملہ بھی ناکام رہا۔[لہ]

اخلاص خاں کے عہدِ اقتدار کی یہ آخری کارروائی تھی جو بیجاپور کی حد تک بہت کامیاب رہی چونکہ اسکے بعد ہی حبشیوں اور دکنیوں کی نااتفاقیوں کی وجہ سے ان کا یہ تھا اتحاد ٹوٹ جاتا ہے اور اخلاص خاں کا عہدِ اقتدار بھی ختم ہو جاتا ہے اس لیے دو چار لفظ یہاں پر ان حملوں اور فوج کشیوں کے متعلق لکھنے چاہئیں جو اس چھوٹے سے دور میں غیر معمولی کامیابی سے بیجاپور پر ہوئے ہیں۔ کشور خاں کے زمانے سے ہی اندرونی حالات کے خراب ہونے کی وجہ سے قطب شاہی اور احمد نگری حملے ہو رہے تھے۔ مگر اخلاص خاں کے زمانے میں تو یہ حالت ہو گئی کہ بیجاپور کا تک محاصرہ کر لیا گیا اور بیجاپور کے فتح ہو جانے میں کوئی بات ہی باقی نہ رہی تھی۔ مگر ابوالحسن نے بیجاپور کو بچا لیا۔ ابوالحسن کے بعد جب پھر اخلاص خاں برسرِ اقتدار ہو گیا تو قطب شاہ نے گلبرگہ چھیننے کے لیے مصطفےٰ خاں کو بھیج رکھا تھا۔ اس طرح پھر وہی خارجی الجھنوں کا سلسلہ شروع ہو گیا جو ابوالحسن کے مختصر سے زمانے میں اس کی قابلِ قدر کوششوں سے منقطع ہو گیا تھا۔ یہاں پر یہ لکھنا پڑتا ہے کہ یہ محض بیجاپور کی خوش قسمتی تھی کہ ایسے وقت میں جبکہ اندرونِ ملک بدامنی

لہ برہان مآثر کے مصنف نے اس جنگ کی کچھ اور تفصیل دی ہے وہ یہ ہے کہ عادل شاہیوں کو جب یہ معلوم ہوا کہ دشمنوں کی افواج اپنے اپنے ملک کو روانہ ہو گئی ہیں تو وہ کھوئے ہوئے علاقوں کے حاصل کرنے کی فکر کرنے لگے۔ دلاور خاں اس مہم پر روانہ کیا گیا۔ مرزا امیر زنبیل نے اپنے بادشاہ کو لکھا کہ عادل شاہی افواج کا ایک زبردست اجتماع ہوا ہے اور مقابلے کی تاب نہیں [illegible] موجودہ فوج ناکافی ہے [illegible] مدد بھیجی جائے۔ محمد قلی نے کمک روانہ کی۔ اسی اثنا میں میر شاہ میر کے دشمنوں نے [illegible] خط محمد قلی کے سامنے پیش کیا جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ وہ عادل شاہیوں کا طرفدار ہے اور ان کی [illegible] کر رہا ہے کہ وہ ہمت سے لڑیں اور گولکنڈہ کے غیر ملکی فریق کی ہمدردیاں ان کے ساتھ وابستہ ہیں۔ محمد قلی نے بغیر تحقیقات کے میر شاہ میر کو قید کر دیا چونکہ یہ شخص غیر ملکی فریق کا رہبر تھا اکثر امراء اور سرداران فوج بددل ہو گئے۔ اس بددلی اور ناراضی کے عالم میں بھلا فوج کیا لڑ سکتی۔ بغیر ایک تیر چلائے کے تمام فوج غائب ہو گئی۔ میدان عادل شاہیوں کے ہاتھ رہا۔ بے شمار مال غنیمت ان کو ملا جس میں ۵۱۳ ہاتھی تھے (ملاحظہ ہو برہان مآثر)۔

پھیلی ہوئی ہوا اور سخت کشمکش کا سلسلہ جاری ہو بیرونی حملوں سے اُسے خلاف توقع نجات مل گئی اور وہ بھی کامیابی کیساتھ یوں تو یہ اندرونی کشمکش اور خارجی حملے اپنے بُرے نتائج پیدا کئے بغیر نہیں رہ سکے مگر بحیثیت مجموعی یہ کہا جا سکتا ہے کہ بیجاپور کے حق میں ان کے کچھ زیادہ بُرے اثرات مترتب نہ ہوئے اور اُس کی طاقت کو کچھ غیر معمولی دھکا نہیں لگا جس کا بدیہی ثبوت یہ ہے کہ بیرونی سلطنتوں کو اس کا موقع نہیں مل سکا کہ وہ اپنے اُن جارحانہ منصوبوں کو پورا کر سکیں جو انھوں نے بیجاپور کے خلاف باندھے تھے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ باوجود اندرونی کمزوریوں کے بیجاپور نے کس طرح اپنے دشمنوں کے اتنے زبردست اجتماع کو توڑا اور انھیں بے نیل و مرام اپنے ملک کو واپس ہونے پر مجبور کیا ہوگا۔

اس سے اگر کچھ نہیں تو کم از کم بیجاپور کی بنیادی مضبوطی ظاہر ہوتی کہ پچھلے بادشاہوں نے اتنا مضبوط و مستحکم اور باوقار بنا دیا تھا کہ باوجود ایک تھوڑے سے زمانے کی پریشانیوں کے وہ دشمنوں کے مقابلے میں کامیاب و سرخرو نکلتا ہے۔ دوسرے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ اس نازک اور پرآشوب زمانے میں اس وقت بھی بیجاپور میں ایسی ہستیاں موجود تھیں جنھیں مغتنمات سے سمجھا جانا چاہیئے۔ مثلاً ابوالحسن، چاند بی بی وغیرہ۔ ان کا وجود ہی ایک اچھا اور زبردست اخلاقی اثر پیدا کرتا تھا جو مادی قوت کی جان ہوا کرتا ہے اور خود حبشیوں (اور خصوصیت کے ساتھ اخلاص خاں) کے متعلق بھی یہ کہنا چاہیئے کہ بیشک آپس میں یہ لڑنے کے لیے ہر وقت تیار رہتے تھے اور بعض اوقات اتنا لڑتے کہ خود ریاست کا وجود خطرے میں پڑ جاتا تھا، مگر پھر بھی وہ بیرونی دشمنوں کے مقابلے میں بیجاپور کی ریاست کے بچانے اور عادل شاہی خاندان کی حفاظت کرنے کو اپنا ایمان تصور کرتے تھے۔ اگر اُمرا میں آپس میں اتفاق ہوتا اور خود غرضی کا پہلو ذرا کمزور رہتا تو یقیناً ابراہیم کا یہ ابتدائی عہد بھی کامیاب اور درخشاں رہتا جتنا کہ اُس کا آیندہ دور رہا۔ اگر کسی چیز نے ابراہیم کے اس "دور طفولیت" کو تاریک بنا دیا تو وہ بھی اُمرا کی آپس کی کشمکش، لڑائیاں اور خود غرضیاں تھیں جس کی باعث دوسری ریاستوں کو اتنی ہمت ہوئی کہ وہ بیجاپور پر چڑھ آئیں۔ مگر یہ سلطنت بیجاپور کی بلند اقبالی اور اُس کی بنیادی قوت کا مظاہرہ تھا کہ باوجود پے در پے حملوں کے وہ اُن کو روکنے میں منصور و کامیاب رہتا ہے۔

"اتحاد ثلاثہ" کی شکست اخلاص خاں کا زوال

جب دلاور خاں کو قطب شاہیوں اور احمد نگریوں کے مقابلے میں یہ زبردست کامیابی

حاصل ہوئی تو اُس کی طاقت و قوت اور عظمت و وقار میں بڑا اضافہ ہو گیا اب اُس کے پاس ایک زبردست فوج تھی جو بالکل اُس کے حکم میں تھی۔ اِس وقت جتنے اُمرا اور سردار فوج کے ساتھ تھے وہ سب اُس کے کہنے میں تھے۔ اور ادھر اخلاص خاں کے پاس بہت کم فوجیں رہ گئی تھیں کیونکہ قطب شاہی حملے کی مدافعت کے لیے اُس نے ریاستی فوجوں کے بیشتر حصے کو دلاور خاں کے تحت روانہ کر دیا تھا۔ اب اُس کے پاس اتنی کافی سپاہ نہ تھی جس سے کہ اگر موقع ہو تو وہ اپنی مدافعت و محافظت کر سکے۔ یوں بھی اخلاص خاں ملک میں کچھ زیادہ ہر دلعزیز نہ تھا۔ اگر اُس کے خلاف اچانک کوئی کارروائی ہو تو شہر کا ایک بچہ بھی شاید اُس کی حمایت میں اُنگلی نہ اٹھائے۔ دلاور خاں اس حقیقت سے خوب آگاہ تھا۔ یہ شخص فطرۃً ایک حوصلہ مند آدمی واقع ہوا تھا۔ گو وہ سرنوبتی کے عہدے پر فائز تھا اور اُس کو اتنی بڑی فوج کی سپہ سالاری دی گئی تھی، مگر پھر بھی وہ اس پر قانع نہ تھا۔ اور اُس کی خواہش تھی کہ وہ ملک کا سب سے اعلیٰ عہدہ حاصل کرے۔ وہ اپنی دانست میں یہ سمجھتا ہوگا کہ جب اخلاص خاں وکیل السلطنت ہونے کے لائق ہے تو میں کیوں نہیں؛ مجھ میں جتنی قابلیتیں ہیں وہ شاید ہی اخلاص خاں میں ہوں۔ غرض اُس کی حوصلہ مندی اور اولوالعزمی نے اُسے بے چین کر رکھا تھا۔ وہ موقع کا متلاشی تھا کہ اپنی اس دیرینہ آرزو کو پورا کرے۔ قدرت نے اُس کو ایک زبردست اور زرین موقع بھی اس وقت عطا کر دیا تھا۔ شاید اس سے بہتر موقع پھر کبھی ہاتھ نہ آتے اس لیے اب وہ اخلاص خاں کی معزولی کا درپے ہوا جس وقت سے کہ ان حبشی اُمرا نے اقتدار حاصل کیا تھا ان میں غیر معمولی اتحاد و اتفاق جاری رہا اور دراصل یہی وہ اتحاد تھا جس کی بنا پر اخلاص خاں نے اتنے عرصے تک بیجاپور پر حکومت کی اور کوئی دشمن ان پر غالب نہ آسکتا تھا۔ اُلٹے وہ جس کو چاہتے زیر کر لیتے تھے چنانچہ ابوالحسن کا معزول ہو کر قید کیا جانا ان کے غیر معمولی اتفاق و اتحاد کی ایک بہترین مثال ہے۔ غرض اسی اتحاد نے اتنے عرصے تک ان کو برقرار رکھا بلکہ کہنا چاہیئے کہ انھوں نے اقتدار جو حاصل کیا وہ خود ان کی باہمی متحدہ کوششوں کا نتیجہ تھا چونکہ اخلاص خاں عمر میں بڑا تجربہ کار اور باعتبار فوج کے زیادہ ذی وقار تھا اس لیے قدرتاً وہ حکومت کے سب سے بڑے عہدے پر فائز رہا اور اپنے ان دونوں ساتھیوں کی مدد سے حکومت کرتا رہا لیکن قوت و اقتدار ایسی چیزیں ہیں کہ انسان کو بہت جلد بدمست کر دیتے ہیں اور رفتہ رفتہ حکومت کا ایسا چسکہ لگتا ہے کہ اُس میں کسی دوسرے کی شرکت تلخ اور ناگوار معلوم ہونے لگتی ہے یہیں سے اتفاق و اتحاد کی وہ کڑیاں ٹوٹنے لگتی ہیں جن سے کہ خود یہ اقتدار حاصل کیا گیا تھا۔ اس طرح مقتدر ہستیاں مائل بہ زوال ہونے لگتی ہیں۔ اب یہاں بھی یہی ہوا جب تک حکومت کا نشہ چڑھا نہ تھا

ان حبشیوں کا اتحاد بڑا مضبوط اور مستحکم رہا لیکن جب یکبارگی اس شراب نے انھیں مست کر دیا تو پھر ان کی طبیعتوں کے اصلی جوہر ظاہر ہونے لگے اور طبائع کے اختلاف نے انھیں بہت جلد ایک دوسرے سے بیزار کر دیا حمید خاں سادہ دل، نیک طینت اور کریم النفس آدمی تھا اس لیے اس کی جانب سے نہ اخلاص خاں کو کچھ ڈر تھا اور نہ دلاور خاں کو کچھ خوف۔ مگر دلاور خاں ان تینوں میں بہت ہشیار، چالباز اور عیار واقع ہوا تھا۔ موقع کی نزاکت کو جان کر ایک عرصے تک اخلاص خاں کے ماتحت کام کرتا رہا، مگر ہمیشہ اسی تگ و دو میں رہتا تھا کہ کسی صورت سے ان دونوں (اخلاص خاں وحمید خاں) میں افتراق پیدا کر کے ان کو لڑا دے! اور یہ آپس میں جب لڑ کر کمزور ہو جائیں تو ان دونوں کو علٰحدہ کر کے حکومت پر خود قابض ہو جائے اُس کی ابتدا سے یہی پالیسی تھی مگر حمید خاں جیسے نیک دل آدمی کو لڑا دینا بھی آسان نہ تھا اس لیے ایک عرصے تک وہ اپنے منصوبے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ یہ عجیب بات ہے کہ قدرت جن کو ترقی دینا چاہتی ہے اُن کو مناسب مواقع بھی عطا کرتی ہے چنانچہ دلاور خاں کی خوش قسمتی سے دوران حکومت میں اخلاص خاں اور حمید خاں کی چشمک ٹھن گئی۔ مگر اس نفاق کے ظاہر کرنے سے پہلے ہم کو دلاور خاں کی کارروائیوں پر نظر ڈالنا چاہیئے کہ وہ قطب شاہیوں کو شکست دیکر کن کاروبار میں مصروف رہا۔

دلاور خاں کی واپسی کی خبر اوپر لکھ دیا گیا ہے کہ دلاور خاں نے قطب شاہیوں کے خلاف کامیابی کیا حاصل کی کہ اُس کے اقتدار میں غیر معمولی اضافہ ہوگیا۔ دراصل اس کامیابی کے معنی اخلاص خاں کا زوال اور دلاور خاں کا عروج تھا ایک زبردست فوج اُس کے پاس تھی اور کہنا چاہیئے کہ اس ایک فتح نے حکومت کے محور و مرکز کو بدل دیا۔ گو بظاہر اب بھی مستقر پر اخلاص خاں ہی وکیل السلطنت تھا مگر بے دست و پا اور دلاور خاں اگرچہ اس وقت محض ایک کامیاب جنرل کی حیثیت رکھتا تھا لیکن اقتدار کا اصلی مرکز وہی ہوگیا تھا۔ غرض قطب شاہیوں کو شکست دینے کے بعد اُس نے اپنی فتح کی خبر بیجاپور روانہ کر دی اور خود بھی چلنے کی تیاریاں کرنے لگا۔ جب اخلاص خاں کو معلوم ہوا کہ دلاور خاں بڑے جاہ و حشم کے ساتھ بیجاپور آنیوالا ہے تو اُسے اپنی فکر ہوئی کہ مبادا وہ قوت و اقتدار جو اسے اس اثناء میں حاصل ہوا ہے اُسکے خلاف ہی دلاور خاں نہ استعمال کرے۔ اُس کا یہ اندیشہ رفتہ رفتہ قوی ہوگیا اور چاروں طرف جو ایک نگاہ ڈالی تو

کسی کو اپنا دوست نہ پایا۔ اپنی ذاتی حفاظت و مدافعت کے لیے اور موقع ہو تو دلاور خاں سے مقابلہ کرنے کے لیے اُس کے پاس کافی فوج بھی نہ تھی۔ اس لیے اُس کی پریشانی اور بھی بڑھ گئی۔

اخلاص خاں کی تدابیر | اب صرف اُس کے پاس ایک چارۂ کار تھا کہ کسی صورت سے دلاور خاں کی آمد اسی حد تک روک لی جائے کہ اس عرصے میں وہ اپنی مدافعت کے لیے کچھ سامان مہیا کر سکے۔ اس غرض سے اُس نے ایک شاہی فرمان دلاور خاں کے نام روانہ کیا کہ تاحکم ثانی دلاور خاں بیجاپور کا ارادہ نہ کرے۔ اور اس وقت جہاں مقیم ہو وہیں ٹھہرا رہے۔ اور جو کچھ مال غنیمت اسپ و فیل وغیرہ اس جنگ میں حاصل ہوئے ہوں وہ حضور میں روانہ کر دے۔ دلاور خاں اس کے لیے تیار ہی تھا۔ اور وہ اخلاص خاں کا داؤ سمجھ گیا۔ اس وار کو خالی دینےکی فکر کرنے لگا۔ مدبر اور کارداں تو تھا ہی اُس نے فوراً بڑے اُمرا اور سرداروں کی ایک مجلس مشورت طلب کی، اور اُس عام مجلس میں اخلاص خاں کا یہ حکم پڑھ کر سنایا ساتھ ہی بتلایا کہ اخلاص خاں کے ارادے نیک نہیں ہیں۔ وہ چاہتا ہے کہ خود تن تنہا حکومت کرے اور ہم کو حکومت سے بیدخل کرنے کی یہ تدبیر نکالی ہے کہ شاہی فرمان کے ذریعہ ہماری بیجاپور کو روانگی ممنوع قرار دی ہے۔ گویا اس طریقے سے وہ سب کو جلاوطن کیا چاہتا ہے۔ اور خود بلا شرکت غیرے حکومت پر قابض رہنے کا ارادہ رکھتا ہے۔ دلاور خاں کا یہ منطقی استدلال ایسا تھا کہ سب کی سمجھ میں آگیا اور وہ بھی اخلاص خاں کے حکم کے وہی معنی لینے لگے جو دلاور خاں نے بتلائے تھے۔ اور پھر جیسا پہلا کہا گیا ہے اخلاص خاں سے بہت کم لوگ خوش تھے۔ اُس کی اُن کارروائیوں کو اور بھی مشتبہ نظروں سے دیکھنے لگے۔ ایک تو یوں بھی وطن یاد آ رہا تھا اور سب بے چین تھے جنگ میں کامیابی حاصل کر کے وہ اپنے اپنے گھروں کو جانے کی فکر میں تھے کہ اخلاص خاں کا یہ نادری حکم پہنچا۔ اس لیے اُن کو یہ زبردستی کی روک بھلی معلوم نہ ہوئی۔ سب کے سب بگڑ بیٹھے اور دلاور خاں سے ہر ایک نے وعدہ کیا کہ وہ اُس کو آخری وقت تک مدد دینے کے لیے تیار ہے۔ دلاور خاں کا مطلب پورا ہو گیا۔ اُس نے سرداروں کے موقتی جذبات کا بہت خوبی سے فائدہ اٹھایا۔ اور قبل اس کے کہ اخلاص خاں اپنی محافظت کی کچھ فکر کرتا وہ اُس کے سر پر آن پہنچا۔

ادھر اخلاص خاں اس ادھیڑ بن میں تھا کہ اگر دلاور خاں تھوڑا سا تساہل کرے یا کسی وجہ سے بھی اُس کی آمد ڈھیل میں پڑ جائے تو اُس کے مقابلے کے لیے کافی تیاری کر لی جاسکے۔ اس وقت خاص

قلعۂ شاہی (ارک بیجاپور) پر حیدر خاں مقرر تھا۔ بارہا اس قلعہ کی قلعداری پر جھگڑا ہو چکا تھا جو وکیل السلطنت ہوتا وہ اپنے آدمی کو یہاں رکھنا چاہتا تھا کیونکہ جب تک قلعہ قابو میں نہ ہو بھلا اپنی حفاظت کا کیا یقین، مگر اخلاص خاں کی بدقسمتی سے حیدر خاں، دلاور خاں کا دوست اور عزیز تھا جس زمانے میں حبشی یک جان و یک قالب تھے یہ اُس وقت کا مقرر کیا ہوا آدمی تھا، اب جو ان میں آپس میں بگڑ گئی تو ان کی پارٹی میں بھی پھوٹ پڑ گئی۔ حیدر خاں اپنی عزیزداری کی بنا پر دلاور خاں کا ساتھ دینے کے لیے تیار تھا۔ اس طرح دلاور خاں اگر ایکدم سر پر آن پہنچے تو اخلاص خاں اُس کے پنجے میں تھا۔ اس وقت اخلاص خاں کا ایک مقصد یہ بھی تھا کہ کسی طرح حیدر خاں کو معزول کر کے اُس کی جگہ پر کسی اپنے آدمی کو فائز کر دے تاکہ قلعہ اپنے قابو میں رہ سکے اس کے لیے تھوڑی مہلت کی ضرورت تھی، مگر دلاور خاں، حیدر خاں کی موجودگی کو غنیمت سمجھتا تھا۔ اب اُس کی کوشش یہ ہوئی کہ حیدر خاں کے نکالے جانے سے پہلے ہی وہ بیجاپور پہنچ جائے۔ اس لیے برق و باد کی مانند مہینوں کی راہ دنوں میں طے کرتا ہوا دس روز کا راستہ پانچ روز میں قطع کر کے بیجاپور آ پہنچا۔ ہر روز اور ہر منزل پر برابر اُسے شاہی حکم (جو دراصل اخلاص خاں کے حکم تھے) پہنچتے تھے کہ وہ توقف کرے۔ مگر اُس نے ان کی پروا نہ کی۔ جب بیجاپور کے قریب پہنچا تو اُسے ایک تاکیدی حکم ملا کہ وہ آج شہر میں داخل نہ ہو۔ بلکہ دوسرے روز اپنے سفر کی تکان دور کر کے آستاں بوسی کا شرف حاصل کرے۔ دلاور خاں جانتا تھا کہ یہ سب اخلاص خاں کی چالیں ہیں اور محض مہلت لیکر اپنے کو مستحکم کرنا چاہتا ہے، اس لیے وہ برابر اُس کے وار خالی دے رہا تھا۔ اب جبکہ اُسے یہ تاکیدی حکم ملا تو اُس نے جواباً کہلا بھیجا کہ آج ہی آستاں بوسی کا شرف حاصل کرنا ہمارے لیے باعث سعادتمندی ہوگا، اس لیے تاخیر کی گنجایش نہیں۔

جب دلاور خاں آ ہی گیا تو اخلاص خاں کو ظاہرداری کی خاطر سوائے اس کے چارہ نہ رہا کہ وہ اُس کے استقبال کو جائے جیسے کہ ایک کامیاب جنرل کے استقبال کو حکومت کے نمایندے جاتے ہیں اور اُس کا خیر مقدم کرتے ہیں۔

دلاور خاں کا خیر مقدم امرائے حبش کے اختلافات

اخلاص خاں نے بادشاہ کو ہمراہ لیکر دلاور خاں اور دیگر سرداران فوج کا طوعاً و کرہاً استقبال کیا اور بڑی عزت و توقیر کے ساتھ اُن کو شہر میں لایا۔ ہر طرح اُن کی حوصلہ افزائی کی گئی اور انھیں خوش کیا گیا۔ مگر یہ سب ظاہری نمایش تھی، اندرونی طور پر فسادوں اور رنجشوں کا مواد پک رہا تھا اور محض ایک ٹھیس کی ضرورت تھی کہ یہ نکلے۔ نہ صرف اخلاص خاں و دلاور خاں، بلکہ ہر شخص اپنی جگہ سمجھا ہوا تھا کہ یہ ظاہرداریاں

زیادہ عرصے تک چل نہیں سکتیں۔ اس وقت حکومت اور اقتدار کے دعویدار دو شخص تھے۔ اور ان میں سے کسی ایک کے حق میں فیصلہ ہونا ضروری تھا۔ یوں تو حمید خاں بھی ان دو کے علاوہ امیدوار تھا، مگر حقیقی کشمکش دراصل دلاور خاں اور اخلاص خاں کے درمیان ہی تھی۔ حمید خاں کی اگر کچھ اہمیت تھی تو یہی کہ وہ جس کسی کا بھی ساتھ دے گا اُس کا پلّہ اُس کے دشمن کے مقابل میں بھاری ہو جائے گا۔ دلاور خاں چونکہ ہشیار اور بلا کا سیاس واقع ہوا تھا، حمید خاں کی اہمیت کی جو خاص نزاکت تھی اُس کو تاڑ گیا۔ چونکہ اُس کا اصلی رقیب اور مدمقابل اس وقت اخلاص خاں تھا جس کو وہ ہٹانا چاہتا تھا اس لیے اُس نے حمید خاں سے دوستی پیدا کر لی اور دوستی کو استوار کرتا گیا۔ اوپر کسی جگہ اشارہ کیا گیا ہے کہ اُس کی ابتدا سے پالیسی یہی تھی کہ کسی طرح ان دونوں کو لڑا کر کمزور کر دے اور پھر خود قابض ہو جائے۔ اب چونکہ اخلاص خاں سے مخالفت بھی بڑھ گئی تھی اس لیے حمید خاں کو اپنا کر کے اُسے اخلاص خاں کے خلاف اُکسانے لگا۔ اخلاص خاں بیوقوف بھی تھا کہ موقع کی اہمیت کا پورا پورا احساس نہ کر سکا، اور عین اُس زمانے میں جبکہ دلاور خاں اُس کے خلاف ہو گیا تھا اُس نے حمید خاں سے بھی لڑائی مول لی۔ حالانکہ اُسے چاہیئے تو یہ تھا کہ ایسے نازک موقع پر اُس کی ہر طرح دلجوئی کرتا اور تالیف قلب کے ذریعہ اپنا بنا رکھتا۔ یہ تو کچھ سوجھی نہیں الٹے حمید خاں کو بھی دشمن بنا لیا۔ رفتہ رفتہ اخلاص خاں اور حمید خاں کی بُری طرح ٹھن گئی، اور بگڑی بھی ایسی کہ توپ و تفنگ کی نوبت آ گئی۔ اور معاملہ بالکل معمولی تھا۔ محض کچھ ہاتھیوں پر جھگڑا تھا، اور کچھ یہ کہ اخلاص خاں نے جاگیریں زیادہ داب رکھی تھیں۔ یہ اس کی سراسر زیادتی تھی۔ چاہیے تھا کہ تینوں میں علی السویہ تقسیم کر دیتا۔ اخلاص خاں کو چاہیئے تھا کہ حمید خاں اور دلاور خاں کے مطالبے پورے کر دیتا، مگر ضدی اور ہٹیلا بلا کا تھا جو کہہ گیا سو کہہ گیا۔ برابر اپنی ضد پر قائم رہا۔ حمید خاں اور دلاور خاں تو یہاں تک بھی راضی ہو گئے کہ "ایک لاکھ" کی جاگیر وہ اُن دونوں سے زیادہ اپنے دسترخوان کے خرچ کے طور پر لے سکتا ہے مگر اس سے زیادہ نہیں۔ اخلاص خاں کسی قسم کے شرائط بھی سُننے کے لیے آمادہ نہ تھا۔ اُس کے ضدی پن نے اُس کی عقل و ہوش کو سلب کر لیا تھا۔ اس ذرا سے معاملے کو اتنا طول دیا کہ لڑائی کی نوبت پہنچ گئی۔ لڑائی زیادہ تر حمید خاں اور اخلاص خاں کے درمیان تھی اور دلاور خاں کبھی مُنھ نہ آتا تھا مگر اس فتنہ و فساد کی آگ کو اور زیادہ مشتعل کرنے میں برابر دلچسپی لے رہا تھا۔ کارروائی تو پوری کئے گیا مگر آخر وقت تک پس پردہ رہا۔ ادھر اُس کو کچھ سمجھاتا اور ادھر اس کو کچھ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حمید خاں اپنے گھر بیٹھ گیا۔ اُدھر اخلاص خاں نے بھی اپنے گھر کی

قلعہ بندی کرلی طرفین سے توپیں سر ہونے لگیں۔ اس آپس کی پیکار میں بیچارے راہ چلتے شہری زخمی ہو جاتے تھے یہ کشمکش اور خانہ جنگی کا سلسلہ ایک عرصے تک جاری رہا۔ اس کے تباہ کن اثرات ونتائج کا اندازہ اُس واقعہ سے ہو سکتا ہے جس کو ابراہیم زبیری نے اس خانہ جنگی کے سلسلے میں بیان کیا ہے۔ چنانچہ وہ لکھتا ہے کہ "ہر روز از ہر طرف توپ و دیگر آلات حرب در کار بود۔ مردم فقیر، مسکین و رعیت در میان جنگ ایشاں پامال حوادث می گشت چنانکہ یک روز مولانا دوست محمد استرآبادی در دکان سوداگر نشستہ بود کہ گولہ توپ از جانب اخلاص خاں برشش نفر از نفران مولانا مشار الیہ رسید۔ یکے بر دیگرے خوردہ از ہم پاشیدہ ہلاک گشتند۔" غرض اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان کی آپس کی خانہ جنگیوں کی وجہ سے امن پسند رعایا مفت میں پس رہی تھی۔ جب یہ جھگڑا طول کھینچنے لگا ملک کے بعض سربرآوردہ لوگوں نے اس امر کی کوشش کی کہ صلح ہو جائے۔ مگر اخلاص خاں کی ضد نے کام بننے نہ دیا اور دوسرے دلاور خاں بھی اس صلح کو دل سے پسند نہ کرتا تھا، گو بظاہر اُس نے بھی پیشقدمی کی چنانچہ رفیع الدین شیرازی صدر جہاں و شیخ سالم، مولانا دوست محمد خاں وغیرہ اخلاص خاں کے پاس مصالحت کی غرض سے گئے! اُسے بھتیرا سمجھایا، سلطنت کی حالت بتلائی، دشمنوں کا چاروں طرف دانت لگائے بیٹھنا ظاہر کیا اور یہ بتلایا کہ یہ موقع لڑنے جھگڑنے کا نہیں آپس میں صلح کرلینی چاہیئے۔ مگر ان کوششوں کا کوئی سودمند نتیجہ برآمد نہ ہوا۔

معاملات بگڑتے ہی گئے، توپیں سر ہوتیں، تیر وتفنگ سے کام لیا جاتا اور ہر طریقے سے بدامنی پیدا ہو رہی تھی۔ رنجشوں کا ایک سلسلہ تھا کہ ختم ہی نہ ہوتا تھا۔ کشمکش جاری رہی، ہاتھیوں پر جھگڑے، ملک کی کمی زیادتی پر جھگڑے، اختیارات پر جھگڑے۔ غرض کوئی ایسی بات نہ تھی جس پر کہ ایک دوسرے کو کچھ اعتراض نہ ہوتا حتیٰ کہ دربار میں آتے تو مسلح آدمیوں کو ساتھ لاتے، اور خود مسلح رہتے۔ یہاں تک بدگمانی بڑھی ہوئی تھی کہ ایک دوسرے پر قطعاً اعتبار نہ کرتا تھا۔ بالآخر اس طولانی نفاق نے اپنا رنگ جمایا۔ اخلاص خاں دن بدن کمزور ہوتا گیا، اُس کی ضد نے اُس کے بہت سارے دشمن بنا دئے۔ وہ لوگ بھی اُس کا ساتھ چھوڑنے لگے جو ابتداً اُس کے ساتھی تھے چنانچہ عین الملک و آنکس خاں بھی حمید خاں و دلاور خاں سے آملے جو اب تک اخلاص خاں کا ساتھ دے رہے تھے۔ اُس کے لوگوں نے یہاں تک کنارہ کشی اختیار کی بالآخر وہ بیچارہ یکا و تنہا رہ گیا۔ اب اس وقت حمید خاں اور دلاور خاں میں خوب اتفاق تھا اور ان دونوں کا پلہ بھاری تھا! آخرکار دلاور خاں نے اپنی فوجوں کو آراستہ کیا اور اخلاص خاں کے

گھر کو گھیر لیا۔ اخلاص خاں یہ جانتا تو تھا ہی کہ آثار کچھ ٹھیک نہیں جب دلاور خاں نے یہ کارروائی کی تو پریشان ہو گیا، اور خفیہ طور پر کسی صورت سے اپنے بچوں کو لیکر حمید خاں کے گھر آیا کہ اُس سے کچھ مدد طلب کرے۔ مگر بُرے وقت کا کون ساتھی ہوتا ہے، دوست بھی دشمن ہو جاتے ہیں۔ یہ تو پہلے ہی اخلاص خاں پر جلا بیٹھا تھا، بھلا اس وقت کیا سیدھے منھ بات کرتا، رُخ کرکے ایک بات نہ کی، البتہ سرسری طور پر اتنا ضرور کہہ دیا کہ اُس کی جان کو کسی قسم کا گزند نہ پہنچایا جائے گا، اور مکہ معظمہ جانے کی اجازت دے دی جائے گی۔

اخلاص خاں کو تھوڑا بہت اطمینان تو ہو گیا مگر پھر بھی دلاور خاں کی جانب سے خدشہ تھا۔ کیونکہ یہ وعدہ تو حمید خاں نے کیا تھا، اور اخلاص خاں یہ جانتا تھا کہ جب اقتدار دلاور خاں کے ہاتھ میں آ جائے (جو کہ آنا لازمی ہے)، تو پھر حمید خاں کس شمار و قطار میں۔ اسی وجہ سے وہ پورے طور پر مطمئن نہ ہوا۔

ادھر دوسرے روز حمید خاں اور دلاور خاں نے دربار میں اپنی حاضری بتائی اور وہاں بادشاہ سے ملاقات کا شرف حاصل کیا۔ اس باریابی کے معنی یہ تھے کہ سرکاری طور پر اقتدار اخلاص خاں کے ہاتھ سے نکل کر دلاور خاں اور حمید خاں کے ہاتھ میں آگیا۔ اس کے بعد دلاور خاں نے پہلا کام یہ کیا کہ تمام شہر کے محافظین اور پہرہ داروں کو احکام روانہ کر دیئے کہ شہر کے تمام دروازے بند کر دیئے جائیں، اور اخلاص خاں کو فرار ہونے کا موقعہ نہ دیا جائے۔

اخلاص خاں کی گرفتاری اور قید کیا جانا۔

اخلاص خاں نے اس عرصے میں پھر ایک بار حمید خاں کو اپنا بنانے کی کوشش کی اور اُس کے گھر پر آیا۔ مگر دلاور خاں کے آدمیوں کے ذریعہ معلوم ہوا کہ اُسے بادشاہ نے مکہ معظمہ جانے کی اجازت مرحمت فرما دی ہے، وہ سفر کی تیاریاں کر رہا ہے اور جلد از جلد عازم حرمین شریفین ہو جائیگا۔ اخلاص خاں کو تو جان کے لالے پڑے تھے اُس نے اسی کو غنیمت جانا اور سفر کی تیاریوں میں مشغول ہو گیا۔ مگر اُس غریب کی قسمت میں بیجاپور سے صحیح و سلامت جانا نہیں لکھا تھا۔ سرکاری طور پر احمد خاں کو اخلاص خاں کے ساتھ اُسے سرحد تک پہنچانے کے لیے مقرر کیا گیا۔ مگر حقیقت میں اُس کے مقرر کئے جانے کا کچھ اور ہی مقصد تھا جو ابھی ظاہر ہوتا ہے! احمد خاں دراصل دلاور خاں کا سکھایا پڑھایا تھا۔ دلاور خاں کو یہ بھی گوارا نہ تھا کہ اخلاص خاں صحیح و سلامت اُس کے پنجے سے نکل جائے۔ اس لیے اُس نے یہ تدبیر اختیار کی تھی جب اخلاص خاں احمد خاں کی معیت میں مرتضیٰ آباد (مرج) پہنچا تو احمد خاں نے اُسے مزید سرکاری حکم سنائے۔ وہ احکام یہ تھے کہ جب تک بارش کا

موسم ختم نہ ہو لے اخلاص خاں دریا کے سفر کا ارادہ نہ کرے! ورمناسب موسم کے انتظار میں چند یہیں (یعنی مرتضیٰ آباد مرج) میں قیام گزیں رہے۔ ان احکام کا سُننا ہی تھا کہ اخلاص خاں کی روح سرد ہوگئی۔ وہ بچہ بھی نہ تھا کہ اُس کا اصلی مقصد نہ سمجھتا اور دلاور خاں کی چالبازیوں کو نہ تاڑ لیتا۔ یہ حکم اُس کے لیے حبس دوام کے حکم سے کچھ کم نہ تھا۔ یہ دلاور خاں کی عیاری اور چالاکی تھی کہ عین شہر میں اخلاص خاں کے ساتھ کچھ بُرا سلوک نہیں کیا بلکہ اپنی سفاکی کو ایک تدبیری جامہ پہنا کر اس طرح اخلاص خاں کو مرتضیٰ آباد مرج میں قید کروا دیا۔ اور دراصل احمد خاں روانہ اسی لیے کیا گیا تھا کہ وہ اخلاص خاں کو مرج سے ایک قدم آگے بڑھنے نہ دے بلکہ یہیں قید کر دے چنانچہ اس پر عمل ہوا، اخلاص خاں قید کر دیا گیا اور تھوڑے دنوں کے بعد دلاور خاں کے حکم سے ہی اُسے اندھا بھی کر دیا گیا۔ دلاور خاں کے عہد اقتدار تک (جو ہشت سالہ دور ہے) اخلاص خاں مع اہل وعیال کے قلعۂ مرج میں قید رہا۔ جب ابراہیم نے عنان حکومت اپنے ہاتھ میں لی تو اخلاص خاں کو بھول نہیں گیا بلکہ اُس کو اور اُس کے بچوں کو رہائی عطا کی۔ بیجاپور طلب کیا، اور کچھ سرکاری طور پر وظیفہ مقرر کر دیا کہ وہ اور اُس کا خاندان آسودگی سے زندگی بسر کر سکے۔ اخلاص خاں کا انتقال ۱۰۰۱ھ میں ہوا۔

اخلاص خاں کا دورِ حکومت اور کیرکٹر۔

اس طرح اخلاص خاں کا دورِ حکومت ختم ہوتا ہے دو سال تک اس نے بحیثیت ریجنٹ کے حکومت کی۔ بہ نسبت دوسرے متولیوں کے جو اس سے پہلے گزر چکے تھے اس نے زیادہ عرصے تک حکومت کی۔ اس کے دور میں بیجاپور میں نہ صرف خانہ جنگیاں ہوئیں بلکہ بیرونی حملوں کا بھی ایک طویل سلسلہ جاری رہا۔ اس طریقے سے یہ مختصر سا زمانہ نہایت پُر آشوب ہے۔ اس عرصے میں وہ زمانہ بھی شریک ہے جبکہ اخلاص خاں حقیقی معنی میں وکیل السلطنت نہ تھا بلکہ ابوالحسن اُس کی جگہ پر کارفرما تھا۔ لیکن ابوالحسن کے بعد پھر وہ حسب سابق مقتدر ہو گیا۔ اس کی طبیعت کی تیزی اور ہٹیلے پن نے اس کو بہت نقصان پہنچایا، ورنہ یہ ممکن تھا کہ وہ اور زیادہ عرصے تک حکومت کر سکتا۔ بیجاپوری محاصرے کے وقت اس نے بڑے ایثار سے کام لیا کہ خود بخود اپنے ساتھیوں کے ساتھ مستعفی ہو گیا اور ابوالحسن کو حکومت کا موقع دیا۔ اگر وہ اس وقت بھی جبکہ حالات اُس کے خلاف

ہو رہے تھے اُسی طرح از خود مستعفی ہو جاتا جیسا کہ اس سے پہلے کیا تھا تو شاید اُسے یہ بُرا دن دیکھنا نصیب نہ ہوتا۔ مگر دلاور خاں کی چالبازی، ہشیاری اور عیاری نے اُسے پنپنے نہ دیا۔[1]

[1] - اخلاص خاں کے زوال کے متعلق یا زیادہ صحیح طور پر اخلاص خاں جس طرح کہ دلاور خاں کے پنجے میں پھنسا ہے اُس کے متعلق اوپر جو تفصیل دی گئی ہے وہ زیادہ تر تحفتہ الملوک اور بساتین السلاطین سے لی گئی ہے۔ مگر تاریخ فرشتہ میں اس کے خلاف واقعات درج ہیں۔ چنانچہ وہ یہ لکھتا ہے کہ دلاور خاں قطب شاہیوں کو شکست دینے کے بعد خود وکیل السلطنت ہونا چاہتا تھا۔ اور اخلاص خاں کو معزول کرنے کی فکر کرنے لگا اس لیے اُس نے حیدر خاں قلعدار کو مواعید دلفریب اور عہد میثاق کے ذریعہ اپنا ہمخیال کر لیا۔ اس کارروائی کو تکمیل کو پہنچا کر وہ حسن آباد گلبرگہ سے بیجاپور آیا۔ جب اللہ پور کے قریب پہنچا تو اُس نے اپنے آدمیوں کو اخلاص خاں کے ہاں روانہ کیا۔ چنانچہ فرشتے کے الفاظ ہیں "متعلقان معتمد خود را نزد اخلاص خاں فرستادہ تقریبات انگیختہ چنداں لوازم اخلاص و اعتقاد و شرایط و چاپلوسی بتقدیم رسانیدکہ او غافل مطلق شدہ دلاور خاں را جزوضعیف عاجز دانستہ و از رعایت حزم دور افتادہ در محافظت و ضبط شہر و قلعہ نہ کوشید" اسطرح اخلاص خاں نہ صرف غافل ہو گیا بلکہ دلاور خاں کو کہلا بھیجا کہ موقع ملتے ہی حضور میں باریاب کروادوں گا۔ دلاور خاں نے جب دیکھا کہ اخلاص خاں بالکل غافل ہو گیا ہے تو سات ہزار فوج کے ساتھ شہر میں داخل ہو کر قلعۂ ارک پر قبضہ کر لیا۔ جہاں پر حیدر خاں نے حسب وعدہ کوئی مزاحمت نہ کی۔ دلاور خاں نے چاروں طرف اپنے آدمی مقرر کر دئیے، بادشاہ کے پاس حاضر ہوا اور باریابی بھی حاصل ہو گئی۔ جس وقت دلاور خاں شہر میں داخل ہوا ہے اخلاص خاں دیوانذی کے کام سے فراغت پاکر اپنے گھر میں آرام کر رہا تھا۔ اسی اثنا میں اُسے معلوم ہوا کہ شہر میں ایک کایا پلٹ ہو گئی ہے۔ فوراً تین چار ہزار سپاہیوں کے ساتھ دلاور خاں کے مقابلے کو نکلا۔ لیکن دلاور خاں کی فوج کی گولیوں کی بوچھار نے اُسے پیچھے ہٹنے پر مجبور کیا۔ چار مہینے تک اخلاص خاں نے

اس کے کیرکٹر کے متعلق یہ بات صاف اور صریح طور پر واضح ہے کہ جس وقت اس کے ہاتھ میں اقتدار آیا اس میں سفاکی اور ظالمانہ اوصاف بھی سرایت کر گئے چونکہ اس نے اپنے زمانے میں اپنے دشمنوں کے ساتھ کبھی رحمدلی کا سلوک نہیں کیا تھا اس لیے وہ رحمدلی کے سلوک کا مستحق بھی نہ تھا۔ کشور خاں کے اہل و عیال کے ساتھ وہ جو سلوک کرنا چاہتا تھا وہ اس کے کیرکٹر کے ایک شرمناک پہلو کو ظاہر کرتا ہے۔ اور اس کی یہ کوتاہ ظرفی و کینہ پروری پر دال ہے کہ وہ اپنی اس مخاصمت کو جو اسے کشور خاں سے تھی اس کے بیگناہ عورتوں اور بچوں پر نکالنا چاہتا تھا۔ آدمی نہایت تندمزاج، غصیلا، ضدی اور اپنی ہٹ کا تھا۔ اگر اس کے ساتھ ہی بہادر، وفادار اور نمک حلال بھی تھا اس نے ملک کے ساتھ کبھی بدخواہی نہ کی۔ یہ اور بات ہے کہ اس کی طبیعت کی کمزوریوں کی

(بسلسلۂ گزشتہ) شہر کا محاصرہ کر لیا۔ اور فریقین میں جنگ ہوتی رہی۔ بالآخر اخلاص خاں کے ساتھی اس کا ساتھ چھوڑنے لگے۔ چنانچہ بلبل خاں حبشی نے جو کسی زمانے میں مصطفیٰ خاں اردستانی کے خاص ملازمین میں سے تھا اور اس کے قتل کے بعد سے اخلاص خاں کے ساتھ اپنے کو وابستہ کر لیا تھا، عین اس موقع پر بے وفائی کی اور دلاور خاں سے مل گیا جس کی وجہ سے اسکی طاقت میں اضافہ ہو گیا، اور اخلاص خاں کمزور پڑ گیا۔ اخلاص خاں میں اب مقاومت کی تاب نہ رہی، اگر پھر بھی وہ بھاگنے کو عار سمجھتا تھا اس لیے نہ بھاگا۔ دلاور خاں نے اسے گھیر کر پکڑ لیا اور اندھا کروا دیا۔ اس طرح فرشتہ اور بساتین السلاطین و تحفۃ الملوک کے بیانات میں اخلاص خاں کے زوال کے متعلق اختلاف ہے۔ رفیع الدین شیرازی کا بیان مصدقہ معلوم ہوتا ہے اس وجہ سے کہ وہ اس وقت یہاں پر موجود تھا اور فرشتہ ان واقعات کے بعد بیجاپور آیا ہے۔ اس وجہ سے تحفۃ الملوک اور بساتین السلاطین کے بیان کو (جو تحفۃ الملوک کی پیروی کیا کرتا ہے) ترجیح دی جا سکتی ہے۔ یہاں پر یہ بھی لکھ دینا چاہیے کہ گو واقعات میں کچھ اختلاف ہے، مگر کوئی اہم اختلاف نہیں۔ ملاحظہ ہو (فرشتہ، بساتین السلاطین، تحفۃ الملوک)۔

وجہ سے وہ ملک کو زیادہ فائدہ نہ پہنچا سکا۔ بلکہ الٹے خانہ جنگیوں اور بیرونی مشکلات کا باعث ہوا۔

متولیانِ ریاست

باب ششم

دلاور خاں حبشی

دلاور خاں اور حمید خاں کی ان بن، حمید خاں کا قید ہونا

گزشتہ باب میں اس کا تذکرہ کیا گیا ہے کہ اخلاص خاں، حمید خاں اور دلاور خاں کی متفقہ کوششوں سے معزول کیا گیا اور پھر اسے قید کر دیا گیا۔ اس کے بعد قدرتی طور پر تمام ملکی اختیارات ان دونوں کے ہاتھ میں آ گئے اور چند روز تک ان دونوں نے متحدہ طور پر مہماتِ ملکی کو انجام دیا، مگر دلاور خاں اور حمید خاں کا یہ اتفاق و اتحاد محض وقتی تھا اس میں پائیداری کی کوئی گنجایش ہی نہ تھی، کیونکہ دونوں کی طبیعتوں میں زمین و آسمان کا فرق تھا، اسی طرح قابلیتوں کے اعتبار سے بھی یہ ایک دوسرے سے بالکل متغائر تھے، دلاور خاں ایک نہایت ہوشیار اور تجربہ کار آدمی تھا، یہ اسی کی چالاکیوں کا نتیجہ تھا کہ اخلاص خاں جیسا آدمی پسپا ہو گیا، اور بالآخر اس کو ہار ماننی پڑی، حمید خاں محض بھرتی کا آدمی تھا، دراصل اخلاص خاں کے اکھاڑنے کے لیے دلاور خاں نے اس کو اپنا ساتھی بنا لیا اور اس کو بھڑکا کر اخلاص خاں کا مخالف بنا دیا تھا، مطلب یہ تھا کہ جب دونوں لڑ کر کمزور ہو جائیں تو خود قابض ہو جائے اور وکیل السلطنت کا عہدہ حاصل کر لے! اور اس کو یقین تھا کہ اخلاص خاں سے اگر راستہ صاف ہو جائے تو حمید خاں کو بیدخل کر دینا ایک منٹ کا کام ہے، وہ اس کی سادگی اور سادہ لوحی کو اچھی طرح جانتا تھا، اور اس کی جانب سے اسے کوئی خطرہ نہ تھا، اسی لیے چند روز تک محض نمایش کے لیے اسے اپنی حکومت کا شریک بنائے رکھا اور ہر طرح اس کی دلجوئی کی، اس چال سے اس کا مقصد یہ تھا کہ حمید خاں کچھ غافل ہو جائے اور اس اثناء میں کوئی مناسب موقع بھی ہاتھ آئے کہ اس کو بھی نکال باہر کیا جائے۔ اس اصول پر کام کر کے اس نے حمید خاں کو غافل کر دیا، یہ غریب نہایت سیدھا سادہ آدمی تھا اسے سیاسی داؤ پیچ سے کسی قسم کی مناسبت نہ تھی۔ وہ بھلا دلاور خاں کی چالبازیوں کو کیا خاک سمجھ سکتا، وہ نہایت سادگی سے اخلاص خاں کے اکھاڑنے میں

دلاور خاں کا ساتھ دیا مگر یہ نہ سمجھا کہ خود اپنے حق میں اس کے کیا نتائج ہوں گے، ان وجوہات کی بناء پر چند روز تو ایسے گذرے کہ حمید خاں اور دلاور خاں ایک جان و دو قالب ہوگئے، اور مہمات ملکی کو متحدہ اور متفقہ طور پر انجام دینے لگے، لیکن اصلی قوت کا مرکز و محور دلاور خاں تھا، اگرچہ غیر محسوس طور پر حمید خاں ایک ثانوی حیثیت اختیار کر رہا تھا، وجہ صاف ظاہر ہے، ایک پکا مدبر اور غیر معمولی طور پر معاملہ فہم واقع ہوا تھا، اور تمام سیاسی جوڑ توڑ کے نازک اصولوں سے پورا واقف تھا، دوسرے میں یہ سارے اوصاف قطعاً مفقود تھے اور وہ تدبر اور سیاست دانی کی نزاکتوں سے عاری تھا، اگر کچھ استعداد تھی بھی تو دلاور خاں کی دانشمندی کے سامنے وہ ماند پڑ گئی، اور وہ اپنے اس "دوست نما حریف" کے مقابل چمک نہ سکا، اور اس پر طرہ یہ کہ سادہ لوحی سے وہ اس پر پورا اعتماد و اعتبار کئے ہوئے تھا اس وجہ سے غافل رہا اور موقع کو کھو دیا، جب صورت حال ایسی ہو تو بھلا یہ ظاہری اتفاق و اتحاد کب تک جاری رہ سکتا تھا۔ نفاق ہونا لازمی تھا یا لآخر ہو کر ہی رہا۔

حمید خاں یہ سمجھے ہوئے تھا کہ اخلاص خاں کے ہٹ جانے سے وکیل السلطنت کا عہدہ خالی ہو جاتا ہے، اگر اس عہدے پر دلاور خاں قابض ہو جائے تو کم از کم سرنوبتی کا اُسے عہدہ ملنا چاہیئے اور اسی عہدہ پر وہ دانت لگائے بیٹھا تھا۔ دلاور خاں نے بھی اسے غافل رکھنے کے لیے چند روز تک اس کو ایسے ایسے سبز باغ دکھائے کہ وہ بالکل اسکے فریب میں آگیا، اور اپنے بچاؤ کی کوئی تدبیر ہی نہ کر سکا۔

جب دلاور خاں کے پاؤں خوب اچھی طرح جم گئے تو وہ حمید خاں کی طرف متوجہ ہوا، یہاں سے کھلم کھلا مخالفت کا سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ دلاور خاں اپنے طرز عمل سے یہ ثابت کر دکھاتا ہے کہ اب اسے حمید خاں سے کسی قسم کا خوف نہیں رہا ہے، اس لیے اس نے سرنوبتی کے عہدہ پر (جس پر کہ حمید خاں دانت لگائے بیٹھا تھا) اپنے بیٹے کمال خاں کو مامور کیا۔[ا]

دلاور خاں کا یہ فعل حمید خاں کے حق میں اعلان جنگ سے کچھ کم نہ تھا، اس کے معنی یہ تھے کہ دلاور خاں اپنے ذاتی استحکام کی تدابیر میں مصروف ہے، اور اپنی کامل ترقی کے لیے اپنا راستہ صاف کر رہا ہے، اس راہ میں جو بھی آئیں وہ اُس کے نزدیک اس کے دشمن ہوں گے اور ان دشمنوں کا وہ بیدردی سے خاتمہ کر دے گا۔ کمال خاں کا سرنوبتی پر فائز ہونا اس اتفاق و اتحاد کی آخری کڑی کا ٹوٹنا تھا جو ایک زمانے میں "حبشیوں کے اتحاد" کے نام سے قائم ہوا تھا

[ا] بساتین السلاطین

جس کے تین بڑے رکن تھے جس میں سے ایک اخلاص خاں کا پہلے ہی خاتمہ ہو چکا تھا اب یہ دوسرا رکن بھی علٰحدہ کیا جا رہا تھا۔
دلاور خاں کی اس حرکت سے حمید خاں کو نہ صرف رنج ہوا بلکہ پریشانی بھی ہوئی اس وجہ سے کہ جب اتفاق ہی باقی نہ ہو تو
دلاور خاں کی طرف سے ہر قسم کا اندیشہ ہو سکتا ہے اس نے آج اسے ایک عہدے سے محروم کیا ہے کل اس کی جان بھی
لے لیگا! اور عہدے سے محروم کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ کسی کو اپنا مد مقابل رکھنا نہیں چاہتا تھا نیز وہ اپنے ہم پلہ ذی عزت
لوگوں کو ذمہ دار خدمات دینا محض اس لیے نہ چاہتا تھا کہ اس کو ان سے عاقبت کار غداری کا اندیشہ تھا۔ وہ
ایسے لوگوں کو اپنے ماتحت رکھنا چاہتا تھا جو بالکلیہ اس کے حکم میں ہوں جو ترقی اور عروج کے لیے محض اسکے ممنون احسان
ہوں، جن پر وہ کامل طور پر اعتبار و اعتماد کر سکے، حمید خاں ہزار صاف دل و سادہ نفس ہو گر پھر بھی وہ بڑے
ذی حیثیت امراء میں سے تھا اس کی طاقت و قوت بھی بہت کافی تھی، وہ اخلاص خاں کے ساتھ کام کر چکا تھا، اسکو
حکومت کا چسکا لگا تھا، یہ ساری چیزیں ایسی تھیں جن کی طرف سے دلاور خاں چشم پوشی نہیں کر سکتا تھا، اس لیے وہ
آہستہ آہستہ حمید خاں کی جڑیں کاٹنے لگا، سرنوبتی کے عہدے کا نہ دیا جانا گویا اس کی قوت کی پہلی جڑ کاٹنا تھا،
اور حمید خاں کے زوال کا ابتدائی زینہ تھا، اس عہدے سے محروم کئے جانے سے حمیدخاں بھی تاڑ گیا کہ دلاور خاں
پرخاش پر آمادہ ہے، اور غالباً یہ مادہ رکھتا ہے کہ ساری قوت و اقتدار اس سے چھین کر اس کو اسی طرح قید کر دے
جس طرح کہ اس نے اخلاص خاں کو قید کر دیا تھا، غرض دلاور خاں کے اس طرز عمل سے حمیدخاں کو بڑی تشویش
پیدا ہو گئی تھی اور اب وہ اس طرح دلاور خاں کے پنجے میں تھا کہ رہائی بھی ممکن نہ تھی، وقت ہاتھ سے گذر چکا تھا،
مخالفت میں انگلی بھی اٹھائی نہیں جا سکتی تھی، اس لیے کہ دلاور خاں ہر آئینہ نظم و نسق ملک پر حاوی ہو گیا تھا، مگر
حمیدخاں کی یہ پریشانی و تشویش زیادہ عرصہ تک نہ رہی، کیونکہ دلاور خاں نے بہت جلد ایک شاہی حکم
نکلوا دیا کہ حمید خاں بغیر اجازت شاہی گھر سے باہر قدم نہ نکالے[۱]، گھر پر پہرے بٹھا دئے گئے چاروں طرف
شہر کے بڑے بڑے دروازوں پر احکام روانہ کر دئے گئے کہ حمید خاں کو کسی حال شہر سے باہر جانے
نہ دیا جائے[۲] اور ساتھ ہی ایک اور حکم بایں مضمون حمید خاں کے پاس روانہ کیا گیا کہ اسپ و فیل و

۱و۲۔ تذکرۃ الملوک۔

قوت میں اضافہ ہی ہوتا جاتا تھا۔ اُسے منصب وکالت حسب خواہش تو ملا مگر ضرورت اس امر کی تھی کہ حاصل شدہ قوت کو برقرار رکھنے اور اپنے موجودہ عہدہ پر بحال رہنے کی استحکامی تدابیر شروع کی جائیں۔

استحکام کی دو شکلیں ہو سکتی تھیں ایک تو یہ کہ مخالف عنصر کو سیاسی قوت سے محروم کر دیا جائے۔ (۲) دوسرے یہ کہ اپنی جڑیں مضبوط کرنے کے لیے تمام ملک کے بڑے بڑے عہدے اور مناصب جلیلہ کو اپنے لوگوں اور ہوا خواہوں میں تقسیم کر دے۔ پہلے ہم ان انتظامات کی تفصیل دیں گے کہ جن کے ذریعہ اس نے تمام ملک کو اپنی مٹھی میں لے لیا۔ سب سے پہلے تو اس نے یہ کیا کہ ملک کے بڑے بڑے ذی حیثیت گھرانوں سے رشتۂ اتحاد جوڑا، ذی اثر، طاقتور امراء کو اس نے اپنی بیٹیاں، پوتیاں دیں، اور ایسے ہی گھرانوں کی لڑکیاں اپنے بیٹوں، پوتوں کے لیے کیں۔ اس طریقہ سے امراء کے ایک بڑے بھاری اور طاقتور طبقہ کو اپنا ہمنوا اور حامی بنا لیا۔ اور ان سے خوشگوار تعلقات[1] پیدا کر لیے۔ دوسرے حکومت کے بڑے عہدوں پر اپنے متعلقین اور لواحقین کو مامور کر دیا، چنانچہ اس کے خود چار بیٹے ملک میں سب سے بڑے عہدوں پر فائز کئے گئے۔ اپنے سب سے بڑے بیٹے محمد خاں کو ابراہیم کا استاد اور اتالیق مقرر کیا کہ وہ بادشاہ کو گلستاں، بوستاں اور قرآن شریف کا سبق دے۔ ابراہیم تو ابھی بچہ ہی تھا، اس کی تعلیم و تربیت جاری تھی، پچھلے دو متولیوں نے تو اتنا بھی نہیں کیا، انھوں نے اسے لہو و لعب میں چھوڑ رکھا تھا، اور وہ اپنی اپنی فکر میں اس قدر غرق رہتے تھے کہ بادشاہ کی تعلیم و تربیت بالکل نظر انداز کر دی گئی تھی۔ دلاور خاں کے عہد اقتدار کا یہ ایک روشن پہلو تو ہے کہ اس نے اس طرف بھی توجہ کی، خواہ وہ توجہ ایک حد تک غرض آلود ہی کیوں نہ ہو، مانا کہ اس نے اپنے بیٹے کو بارسوخ بنانے کے لیے یہ اہم خدمت اسکے سپرد کی مگر پھر بھی اس سے بادشاہ کی تعلیم و تربیت کا انتظام تو ہو گیا، اس کا یہ بڑا بیٹا بہت لائق و فاضل تھا اور اپنے عہد کے قابل ترین لوگوں میں شمار ہوتا تھا، اس طرح اس کا اسی خدمت پر مامور کیا جانا کچھ بُرا نہ تھا۔ دوسرے بیٹے کمال خاں کو سر نوبتی کا عہدہ دیا گیا تھا جس کا پہلے ذکر کیا گیا ہے، اور ساتھ ہی یہ بادشاہ کے ساتھ چوگان بازی اور دوسرے کھیلوں میں بھی شریک رہتا تھا گویا ایک طریقہ سے کھیلوں اور مردانہ فنون کے سکھانے کا کام اس کے ذمہ تھا۔ تیسرے بیٹے حیرت خاں کو ایک بلند پایہ

[1] بساتین۔

امیر بناکر بادشاہ کا مقرب خاص اور مصاحب بنا دیا، اور بادشاہ کی محافظت اور پاسبانی کا کام بھی سپرد کیا۔ چوتھے بیٹے عبدالقادر کو سلک امیران صاحب شوکت میں داخل کر کے قلعۂ ارک (بیجاپور) کا قلعہ دار بنا دیا چونکہ یہ لڑکا کم عمر تھا اور اس خدمت کو انجام نہیں دے سکتا تھا، لہٰذا اس خدمت کو رومی خاں[1] منجانب عبدالقادر انجام دیتا تھا، رومی خاں خاندان شاہی کے خانہ زادوں میں سے تھا اور کچھ دور کا رشتہ بھی رکھتا تھا۔

ان اہم عہدوں اور مناصب جلیلہ کے علاوہ ہر ایک لڑکے کو اس نے "دو ہزار اسپی کماندار" بھی بنا دیا اور چھ ہزار نہایت آزمودہ کار فوجیں ہمیشہ کیل کانٹے سے لیس براہ راست اُس کے حکم میں رہتی تھیں۔ بلبل خاں جو اخلاص خاں سے غداری کر کے اس کے ساتھ مل گیا تھا اور جس کی وجہ سے دراصل اخلاص خاں کے خلاف اسے کامیابی حاصل ہوئی تھی اس کو بہت بڑا عہدہ دیا اور اپنا آغوشی فرزند بنا لیا[2] تھا۔

ان کارروائیوں کے علاوہ اس نے چند مزید تدابیر اپنے استحکام کے لیے جو اختیار کیں ان کی تفصیل یہ ہے
سب سے پہلی چیز تو وہی جس کا اوپر ذکر کیا گیا یعنی غیر ملکی فریق کا ریاست سے خارج کیا جانا، فرشتہ[3] کے مطابق ساٹھ[4] حبشیوں اور ایک سو غیر ملکیوں کے سوا باقی سب کا اخراج عمل میں آیا، پھر خصوصیت کے ساتھ بڑے بڑے عہدہ دار الگ کیے گئے اور جو پہلے ہی الگ تھے انھیں قید کیا گیا یا قتل کر دیا گیا، چنانچہ ابوالحسن جو اخلاص خاں کے زمانہ میں قید ہوا تھا دلاور خاں کے حکم سے پہلے اندھا کیا گیا اور پھر قتل کر دیا گیا، حاجی بشیر[5] جو علی عادل شاہ کا ایک با حیثیت مقرب تھا اس کا بھی یہی حشر ہوا، غالب خاں کلہ دادھونی کو

لہ۔ تذکرۃ الملوک۔
سہ۔ بساتین السلاطین۔
سہ۔ برگس، صفحہ ۱۵۶ لیکن فرشتہ کے فارسی نسخہ میں حسب ذیل عبارت پائی جاتی ہے:۔
"صد ہزار نفر از غریباں و شصت ہزار نفر از حبشیاں ...... برداشتہ از قلمرو اخراج کردہ"
سہ۔ حاجی نور۔ فرشتہ

کچھ بغاوت کی تھی حکمت اور تدبیر کے ذریعہ مغلوب کر کے قید کر دیا گیا، اور اس کے بعد اس کی آنکھیں نکلوائی گئیں،
دلاور خاں کا دست ستم اس قدر دراز ہونے لگا تھا کہ چاند بی بی بھی اس کی فریب کاریوں سے محفوظ نہ رہ سکی،
اور اُس کے اختیارات میں بہت کمی کر دی گئی، اور وہ بھی وکیل السلطنت کی ایماء کے بغیر ایک تنکے کو ادھر سے
اُدھر نہ کر سکتی تھی۔ غرض اپنی اس کارروائی کو اس نے یہاں تک پھیلایا کہ بڑے سے بڑے عہدہ دار سے لیکر
حرم سرا اور دربار شاہی کے چھوٹے سے چھوٹے ملازم اور خدمتگار (خواہ وہ عورت ہو کہ مرد) دلاور خاں کے
اشاروں پر کام کرتے تھے اور یہ سب لوگ اپنی اپنی خدمات پر اسی کے حکم سے مامور کئے گئے تھے مختصر یہ کہ
اس کے حکم کے بغیر شاہی محل میں پتہ بھی نہ ہل سکتا تھا محل کی خدمتگار عورتیں اور خادمائیں دلاور خاں کی
سکھائی پڑھائی ہوتی تھیں، اور وہ خفیہ طور پر اسے رتی رتی کی خبر دیتی تھیں، اس طرح اگر شاہی محل میں
پتہ کھڑک جاتا تو اس کو فی الفور اس کی خبر ہو جاتی، ان سخت انتظامات کی وجہ سے خود بخود چاند بی بی کے اختیارات کی
تحدید عمل میں آئی۔ غرض جس طرف دیکھو دلاور خاں کا ہی بول بالا نظر آتا تھا، ہر طرف "دلاور خانیوں"
ہی کی حکومت تھی، پوری ریاست اس وقت اس کے پنجے میں تھی، بادشاہ اور چاند بی بی اسکے زیر نگرانی
اور زیر حکم۔ دلاور خاں اس وقت اتنا مستحکم ہو گیا تھا کہ اس کو بیجاپور کا "آمر مطلق" اگر کہا جائے تو بجا ہے،
اور یہ "آمریت" کا دور دورہ تقریباً آٹھ سال تک برابر جاری رہا۔

گو اس کے پہلے بھی متولیوں نے اپنے استحکام کی غرض سے ایسے انتظامات ضرور کئے تھے مگر کسی نے ان
انتظامات کو اس قدر نہیں پھیلایا اور نہ کسی کو اتنی کامیابی نصیب ہوئی۔

علمی سرپرستی انہی استحکامی انتظامات کے سلسلہ میں اور ملکی انتظامات پر توجہ کرنے سے پیشتر دلاور خاں کے
کیرکٹر کے ایک درخشاں پہلو کو بھی دکھا دینا چاہیئے، وہ یہ کہ اس نے علوم و فنون کی سرپرستی کرنی شروع کی،
کیونکہ وہ خود ایک نہایت قابل اور لائق آدمی تھا، اکثر علماء و فضلاء اور طلباء کو دوست رکھتا اور
انہیں ہر طرح علوم و فنون کی ترغیب و تحریص دیتا اور مدد بھی کرتا تھا، اس کی علمی سرپرستی کے
باعث تھوڑے ہی عرصہ میں مختلف مقامات کے علماء اور لائق لوگوں سے ملک معمور نظر آنے لگا۔ بالخصوص
گجرات اور لاہور کے علماء نے بیجاپور کو اپنا مرکز بنا لیا تھا،[1] رات دن علم و فن کے چرچے رہتے تھے،

[1] تذکرۃ الملوک۔

فقہی مسائل پر تحقیقی بحثیں ہوتیں، مناظرے اور مکالمہ کا سلسلہ جاری رہتا، اور یہ لوگ اکثر دلاور خاں کے گھر پر ہی مطالعہ تفاسیر و احادیث میں اپنا وقت گذارتے، دلاور خاں بھی ان کا شریک رہتا جب تک وہ برسر اقتدار رہا برابر علمی طبقے کی سرپرستی کرتا رہا جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ علوم و فنون کا سچا مربی اور بہی خواہ بھی تھا، اس علمی خدمت سے اس نے ملک کو بہت کچھ فائدہ پہنچایا، اسی سلسلہ میں ایک اہم چیز جو قابل ذکر ہے یہ ہے کہ دلاور خاں نے مذہب امامیہ کو خارج کر کے حنفی مذہب کو سرکاری مذہب قرار دیا، کیونکہ وہ خود بھی حنفی تھا، بادشاہ کو بھی اس نے اسی مذہب کی تعلیم دی۔

انتظامات ملکی، دلاور خاں کی پہلی مہم، بلبل خاں کا کرناٹک پر حملہ

مصطفےٰ خاں اردستانی کے بعد سے دارالسلطنت بیجاپور میں کچھ ایسی بدانتظامی اور بے اطمینانی رہی کہ متولیان ریاست کو اپنے ذاتی استحکام و استقلال کی اکھاڑ پچھاڑ میں اور ہم سایہ ریاستوں کی یورشوں کے مقابلے سے اتنی فرصت نہ ملسکی کہ ملک کے دور دراز علاقوں کی طرف توجہ کی جائے مصطفےٰ خاں اردستانی جیساکہ پہلے بتایا جاچکا ہے، نہایت سخت گیر آدمی تھا اور ساتھ ہی زبردست منتظم و مدبر بھی تھا، اور پھر لطف یہ کہ بحیثیت جنرل کے بھی کسی سے کم نہ تھا، ان ہی اعلیٰ خصوصیات کی بنا پر وہ کرناٹک کے مفسد علاقہ پر قابو رکھنے میں کامیاب ہوا تھا، بلیبار ایک بالکل نو مفتوحہ علاقہ تھا، راجہ بیجانگر کی بربادی کے بعد علی عادل شاہ نے کرناٹک پر جو پے در پے حملے کئے اور یہ علاقہ بیجاپور کی ریاست کا ایک جزو بن گیا، لیکن اس سلسلۂ فتوحات کو مصطفےٰ خاں اردستانی نے علی عادل شاہ کے آخر زمانے تک جاری رکھا تھا، اور کئی قلعوں پر متصرف ہوچکا تھا، چنانچہ بنکاپور، بلگاؤں وغیرہ انہیں فتوحات کا نتیجہ تھے، جب تک علی عادل شاہ زندہ رہا مصطفےٰ خاں بے کھٹکے اس کامیابی کے سلسلہ کو جاری رکھا اور پھر مفتوحہ علاقے کو اپنے ہی دست اختیار میں رکھا، علی عادل شاہ نے ان علاقوں پر اپنا پورا اقتدار رکھنے کے لیے مفتوحہ علاقوں ہی میں اس کو جاگیریں دیدی تھیں، یہی وجہ ہے کہ جس وقت علی عادل شاہ کا انتقال ہوا، مصطفےٰ خاں بیجاپور میں موجود نہ تھا، علی عادل شاہ کے انتقال کے بعد بیجاپور میں جو کچھ بدعنوانیاں

لہ۔ اس مہم کا ذکر بساتین السلاطین میں نہیں، او تحفۃ الملوک میں بھی کہیں ذکر نہیں ملتا، فرشتہ سے واقعات لیے گئے ہیں۔

ہوتی رہیں اُن کی تفصیل نظر سے گذر چکی ہے۔ اور پھر کشور خاں نے تو یہاں تک کیا کہ خود مصطفےٰ خاں کو قتل کروادیا۔ مصطفےٰ خاں اس خدمت کے لیے بیحد موزوں تھا، اب اس کا ثانی یا نعم البدل ملنا بہت دشوار تھا۔ اول تو اسے ایک عرصہ کا تجربہ تھا، دوسرے سخت گیر اور منتظم ہونے کی وجہ سے اس نے فتنہ وفساد کی جڑیں بالکل کاٹ دی تھیں، اس کی موجودگی میں کسی کی ہمت نہیں پڑتی تھی کہ کسی قسم کی شورش بپا کی جائے، چونکہ یہ علاقہ نو مفتوحہ اور دارالسلطنت بیجاپور سے دور تھا، اس لیے اس پر کافی نگرانی نہیں ہو سکتی تھی، پھر چھوٹے چھوٹے زمیندار راجہ، راجکمار جو وجیانگر کی عظیم الشان ریاست کی ایک حقیر یادگار رہ گئے تھے اس علاقے پر پھیلے ہوئے تھے، انھیں مسلمانوں کی غلامی اچھی نہیں معلوم ہوتی تھی۔ اور وہ دن بھی ان کو یاد تھے جبکہ خود یہ مسلمان ان کی طاقت وقوت کے رعب وداب سے کانپتے تھے، اس وجہ سے یہاں جب ذرا ڈور ڈھیلی ہوئی فتنہ وفساد ضرور برپا ہوجاتا۔ انھیں حالات کے باعث اس علاقے کی جانب سے ہمیشہ ہوشیار رہنا پڑتا تھا، ذراسی غفلت کے ساتھ ہی ہندو زمیندار بغاوت کر بیٹھتے، تمرد اور فساد ان کے رگ وپے میں سرایت کر چکا تھا، ان کی سرکشیوں کو روکنے کے لیے ہمیشہ ایک سخت سپہ سالار کے رہنے کی ضرورت محسوس ہوتی تھی۔ مصطفےٰ خاں ایک زمانے تک اس اہم ضرورت کو پورا کرتا رہا، مگر جب کشور خاں کی دراز دستی کا شکار ہو گیا تو کوئی شخص اس کی جگہ کو اس قابلیت سے پُر نہ کر سکا، اس کے علاوہ چونکہ اندرون ملک مشکلات کا جال پھیلا ہوا تھا، اس لیے بھی توجہ نہ ہو سکی، یہ تمام اثرات یہاں مترتب ہو رہے تھے اور ادھر زمینداروں نے اودھم مچا رکھی تھی، خراج ادا کرنا چھوڑ دیا تھا اور اپنے آپ کو آزاد سمجھے ہوئے تھے۔

جب دلاور خاں کو اندرونی اور ذاتی انتظامات سے فرصت ملی تو اس نے سب سے پہلے کرناٹک کے علاقہ کی طرف توجہ کی۔ دلاور خاں حکومت کا حریص سہی، لیکن وہ حکومت کا صحیح استعمال بھی جانتا تھا، وہ حکومت کرنا چاہتا تھا اور شان سے، کامیابی سے، لیاقت سے، وہ حوصلہ مند تھا، اور حکومتی قابلیتیں بھی اس میں موجود تھیں۔ وہ بیجاپور کو اک منظم اور منتظم حالت میں لانا چاہتا تھا، اس کا خیال تھا کہ ہر طرف انتظامات ٹھیک ہوں، ملک کے صوبے براہ راست مستقر کے ماتحت ہوں، فساد نہ ہو،

نافرمانی نہ ہو، محصول برابر وصول ہوتا رہے، امن و امان رہے اور عوام الناس کے لیے عدل و انصاف کے چشمے جاری کئے جائیں، مگر اس کے ساتھ ہی وہ چاہتا تھا کہ خود ان تمام چشموں کا منبع ہو اور تمام ریاست کی کنجی اسی کے ہاتھ میں رہے، یہ محض اس کی کمزوری تھی، غرض دلاور خاں کی توجہ قدرتاً ادھر مبذول ہوئی، جہاں رائے اور رجواڑوں نے محصول اور خراج دینا بند کر دیا تھا۔ اس نے بلبل خاں کو ایک زبردست فوج دیکر روانہ کیا کہ وہ محصول وصول کر لائے۔ بلبل خاں اس فوج کے ساتھ کرناٹک چلا گیا۔ جب اتنی بڑی فوج کو کرناٹکیوں نے سر پر آتے دیکھا تو ان کے ہوش و حواس گم ہو گئے، اور سب نے یہ تصفیہ کیا کہ بلا تعرض اطاعت قبول کر لی جائے۔ چنانچہ ارسب نائک جو علاقۂ جترہ کا ایک چھوٹا سا راجہ یا زمیندار تھا مرعوب ہو کر بلبل خاں کی خدمت میں حاضر ہو گیا اور اطاعت قبول کر لی اور خراج دینے کا وعدہ کر لیا۔ جب ارسب نائک کی امدادی فوجوں کے ساتھ بلبل خاں آگے بڑھا تو شنکر نائک ایک چھوٹے سے راجہ نے اطاعت قبول کرنے سے انکار کیا، اس سرکشی کی وجہ یہ تھی کہ اس کا قلعہ کرور بہت مضبوط تھا، خود محصور ہو گیا[1] اور لڑنے کی تیاریاں کرنے لگا، بلبل خاں نے بھی توپیں بڑھائیں اور اس کے قلعہ کا اچھی طرح محاصرہ کر لیا۔

انتظامات کے سلسلہ میں بلبل خاں ایک روز مورچوں کے نصب کرنے اور دیگر دیکھ بھال میں مصروف تھا کہ یکایک شنکر نائک کے کچھ سپاہیوں نے موقعہ پاکر اس کو وہیں گرفتار کر لیا چونکہ اس کے ساتھ کوئی سپاہی وغیرہ نہ تھے اس لیے وہ ان کے پنجہ میں بآسانی پھنس گیا، یہ لوگ اسے پکڑ کر شنکر نائک کے پاس لے گئے اور اس نے اس کو وہیں قید کر لیا لیکن خیر یہ گذری کہ بلبل خاں قتل نہیں کرا دیا گیا۔ جب بلبل خاں ہی گرفتار ہو گیا تو اور کیا کارروائی کی جا سکتی تھی، بغیر افسر کے کوئی فوج بھی کسی مہم کو سر نہیں کر سکتی۔ بلبل خاں کی اس یکایک گرفتاری سے تمام فوج پریشان ہو گئی اور کرناٹک کی یہ مہم بالکل ناکام رہی۔

بلبل خاں کا قید سے چھوٹنا بلبل خاں اپنی اس غیر متوقع گرفتاری سے بیحد پریشان ہوا، اور اس کو اپنے قتل کئے جانے کا ڈر لگا ہوا تھا، لیکن جب شنکر نائک نے صرف اسے قید کرنے کا حکم دیا تو کچھ جان میں جان آئی۔ غالباً شنکر نائک کی ہمت نہ بڑھی کہ اتنے بڑے جنرل کو قتل ہی کر دے، کیونکہ وہ شاہی افواج سے

[1] تاریخ فرشتہ

مرعوب تھا۔ بلبل خاں کے قتل کرنے سے شنکر نائک کو کچھ حاصل تو نہ ہوتا، سوائے اس کے کہ کچھ اور آفت اس پر نازل ہو جاتی، مگر جب ایسے پایہ کے جنرل کو قید رکھا جائے تو گورنمنٹ اسے واپس لینے کی کوشش کرے گی اور وہ فدیہ لیکر چھوڑ سکتا ہے اور اپنے منہ بولے خراج حاصل کر سکتا ہے، غالباً اسی خیال سے اس نے بلبل خاں کو قتل نہیں کیا۔ غرض وجہ کچھ بھی ہو مگر بلبل خاں کی تو یہ خوش قسمتی تھی کہ وہ قتل نہیں کیا گیا۔

یہ تو تھا بہت ہوشیار آدمی، بجائے بدحواسی میں وقت گذارنے اور پریشان رہنے کے اپنی رہائی کی تدبیریں کرنے لگا۔ قلعہ کے چند ادنیٰ ملازمین کو کچھ دے کر اپنا دوست بنا لیا۔ نرمی کے برتاؤ اور حسن سلوک سے جانور بھی رام ہو جاتے ہیں، یہ تو آدمی ہی تھے، اس کے گرویدہ ہو گئے اسی زمانے میں اتفاقاً مسلسل چھ سات روز تک موسلادھار بارش ہوتی رہی اور قلعہ میں بہت کیچڑ ہو گئی، قلعہ کے اندر بہت سارے مویشی رہتے تھے جو شنکر نائک کی ملک تھے، اس دلدل کی وجہ وہ قلعہ کے اندر نہیں رکھے جا سکتے تھے، اس لیے حکم دیا گیا کہ انھیں باہر کسی خشک جگہ لیجا کر باندھ دیا جائے مویشیوں کے ساتھ ان کا دانہ چارہ، گھاس پات بھی روانہ کیا گیا اور یہ ٹوکروں میں بھر بھر کر باہر لیجا رہے تھے بلبل خاں نے کچھ سائیسوں کو ملا لیا، یہ لوگ پہلے ہی سے اس سے راضی تھے، انھوں نے اسے ایک ٹوکرے میں بٹھا کر اور کچھ گھاس پات اوپر ڈال قلعہ سے باہر پہنچا دیا، کسی کو اس طرح فراری کا گمان بھی نہیں ہو سکتا تھا، اور سائیسوں اور علف برداروں کی بھلا کب تنقیح کی جاتی تھی۔ غرض حسنِ اتفاق کہیئے یا بلبل خاں کی خوش قسمتی کہ اسے ایسا موقع مل گیا، اور وہ جان بچا کر بھاگ نکلا۔ اس نے قلعہ سے کیا رہائی پائی گویا موت کے پنجہ سے چھوٹ گیا۔

بلبل خاں نے یہاں سے نکل سیدھا بیجاپور میں جا کر دم لیا۔ بیجاپور میں پہلے ہی اس مہم کی ناکامی کے حالات معلوم ہو گئے تھے۔ دلاور خاں اپنی اس پہلی مہم کی ناکامی پر بہت چیں بہ جبیں ہوا۔ اور اس کو بلبل خاں کی نا اہلی، بد احتیاطی اور بے پروائی پر محمول کیا۔ وہ بیحد ناراض تھا اسلیئے جب بلبل خاں بیجاپور آیا تو دلاور خاں نے کچھ گرمجوشی سے اس کا استقبال نہیں کیا۔ بلبل خاں نے درخواست کی کہ اسے ایک اور موقع دیا جائے تاکہ وہ شنکر نائک کو اس کی اپنی غداری اور نمک حرامی کا مزہ چکھائے مگر

دلاور خاں اس کے لیے تیار نہ تھا، اور اس معاملہ کو کسی اور مناسب وقت کے لیے اٹھا رکھا، کیونکہ اس اثنا میں اس کی توجہ دوسرے اہم معاملات کی طرف مبذول ہو چکی تھی۔

غیر ممالک سے دوستانہ تعلقات کی کوشش، احمد نگر اور گولکنڈہ سے شادی بیاہ کے تعلقات

دلاور خاں حقیقت میں اپنے زمانہ کا ایک اچھا مدبر تھا۔ وہ دیکھ چکا تھا کہ غیر ممالک سے تعلقات کے اچھے نہ ہونے کا کیا بُرا نتیجہ ہوا۔ مثال کے طور پر کشور خاں اور اخلاص خاں کے دورِ حکومت اس کے پیشِ نظر تھے، وہ ان واقعات اور حالات کا اعادہ پسند نہیں کرتا تھا، اس کی یہ کوشش تھی کہ کسی طرح سلطنت کو استحکام نصیب ہو، یہ استحکام کی دو شکلیں ہو سکتی ہیں، ایک تو یہ کہ اندرونی انتظامات نہایت اچھے ہوں، دوسرے یہ کہ بیرونی ممالک سے خوشگوار تعلقات پیدا کر لیے جائیں تاکہ ان کی جانب سے کوئی خطرہ اور خدشہ باقی نہ رہے، چونکہ خود اندرونی خرابی بیرونی حملوں کا باعث ہوا کرتی ہے، اس لیے اس نے پہلے اندرونی انتظامات ٹھیک کر لیے۔ اب جو ان سے فرصت ہوئی تو وہ خارجہ پالیسی کو ایک خاص رنگ دینے لگا، گذشتہ حملوں اور لڑائیوں کی وجہ سے احمد نگر اور گولکنڈہ سے بیجاپور کے تعلقات اچھے نہیں رہے تھے اور سخت کشیدگیاں پیدا ہو گئی تھیں، دلاور خاں یہ جانتا تھا کہ اگر بیجاپور کو امن و امان کی ضرورت ہے اور اپنے آپ کو پھر درست کرنا چاہتا ہے تو پہلے ان دو ریاستوں کو دوست بنا لے اور ان سے اچھے تعلقات پیدا کر لے۔ یہ پالیسی حقیقت میں بڑے تدبر اور فراست پر مبنی ہے، بیرونی ممالک سے اچھے تعلقات کا رہنا اور اندرونی انتظامات کا بخوبی انجام پانا حکومت کے اچھے یا بُرے ہونے کی کسوٹی ہے جس پر اسے پرکھا جا سکتا ہے۔ اسی غرض سے اس نے اب اپنی وہ کوششیں شروع کیں جن سے ان دونوں ریاستوں کو اپنا دوست بنانا مقصود تھا۔ خارجہ تعلقات کا مطلع جو اب تک ابر آلود یا گندہ تھا، اسے دلاور خاں صاف کرنا چاہتا تھا، وہ ان تلخ حقیقتوں سے واقف تھا کہ ناخوشگوار تعلقات کیا کیا بُرے نتائج پیدا کر سکتے ہیں۔ اس کی اپنی آنکھوں نے ان مصائب کے مظاہر کا اچھی طرح مشاہدہ کر لیا تھا، لہٰذا اب اس کی دلی خواہش تھی کہ اس آنیوالی مصیبت کا پورے پوری طرح انسداد کر دیا جائے۔ اس غرض سے وہ احمد نگر اور گولکنڈہ سے صلح و اتحاد پر مائل تھا۔ خوشگوار تعلقات پیدا کرنے کا عام طور پر یہی طریقہ ہوتا ہے کہ ایک ملک سے دوسرے ملک کو سفارتیں بھیجی جاتی ہیں، ایک دوسرے کو

بیش بہا تحفہ تحائف روانہ کرتے ہیں اور اچھے تعلقات اور صفائی کی فضا کو قائم رکھنے کی کوشش ہوتی ہے،
جب اس خوشگواری کو ایک مستقل اور مضبوط شکل دینی ہوتی ہے تو حسب موقع آپس کی سلطنتیں ایک دوسرے کے
خاندان سے شادیاں کرتی ہیں کہ رشتہ ازدواج سے رشتہ دوستی واتحاد اور مضبوط ہوجائے۔ یہ طریقہ
کامیاب بھی ثابت ہوا ہے مگر ہمیشہ نہیں، بعض اوقات مقصد کے خلاف نتائج برآمد ہوتے ہیں، اتحاد کی
خاطر شادی ہوتی ہے مگر اس سلسلہ میں لین دین کے بعض ایسے مسئلے چھڑ جاتے ہیں کہ خونریزیاں ہوجاتی ہیں۔
چنانچہ ایسی کئی مثالیں ان ریاستوں کے باہمی تعلقات کے سلسلہ میں ملتی ہیں، اس سے پہلے اس قسم کے
واقعات کے حوالے دئیے جا چکے ہیں۔ یہاں تقریباً وہی صورت حال پیدا ہوجاتی ہے۔

احمد نگر سے تعلقات۔ خدیجہ کی میراں حسین سے شادی ۹۹۲ھ

جس سال کہ ملیبار کی مہم ناکام ثابت ہوئی اسی سال دلاور خاں نے اپنی خارجہ پالیسی کو عملی جامہ پہنانے کے لیے بیجاپور سے چند ایلچیوں کو
مرتضیٰ نظام شاہ کے پاس روانہ کیا۔ اس سے اس کا یہی مقصد تھا کہ نظام شاہی سلطنت سے تعلقات
اچھے ہوجائیں۔ اس وقت احمد نگر میں مرتضیٰ نظام شاہ حکمرانی کر رہا تھا مگر اس کی نیم دیوانگی کی وجہ سے
صلابت خاں ترک وکیل السلطنت ہوکر تمام جزو کل کا مالک بنگیا تھا، جو حیثیت بیجاپور میں دلاور خاں
کی تھی تقریباً وہی حیثیت احمد نگر میں صلابت خاں کو حاصل تھی۔ اس نے بیجاپور کی اس سفارت کی بڑی
خاطر و مدارت کی،[۱] ۹۹۲ھ میں خود نظام شاہی ریاست کی جانب سے چند سفیروں کو عادل شاہی دربار میں
روانہ کیا اور ساتھ ہی ابراہیم کی بہن خدیجہ کو مرتضیٰ نظام شاہ کے بیٹے میراں حسین سے منسوب کرنیکی درخواست
کی گئی۔ اس غرض سے قائم بیگ ولد قاسم بیگ بزرگ، مرزا محمد تقی نظیری اور جمشید خاں کو بیجاپور روانہ کیا گیا تھا۔
جب دونوں طرف سے حسب دلخواہ شرایط منظور کرلیے گئے تو چار مہینوں کے جشن اور جلسوں کے بعد
دلہن کو مرزا تقی اور دیگر امراء کے ساتھ احمد نگر روانہ کیا، چاند بی بی بھی دلہن کے ساتھ احمد نگر گئیں کیونکہ

---

[۱] - فرشتہ۔

[۲] - فرشتہ و برہان ماثر۔

ایک زمانہ سے انھوں نے اپنے ماں باپ کے گھر کی صورت نہ دیکھی تھی اور نیز اپنے بھائی سے ملنے کا بہت اشتیاق رکھتی تھیں۔ ۹۹۳ھ میں دلہن کی پالکی احمد نگر پہنچ گئی اور وہ بیجاپوری اُمراء جو شہزادی کو پہنچانے کے لیے احمد نگر گئے ہوئے تھے وہاں سے بہت کچھ سرفراز ہو کر بیجاپور لوٹے، ان میں سے شیخ سالم عرب نجفی اور غیاث بیگ قزوینی المخاطب بہ چنگیز خاں قابل ذکر ہیں۔[1]

اسی زمانے میں دلاور خاں نے دودمان نظام شاہیہ سے ابراہیم کی شادی کی نسبت کچھ سلسلہ جنبانی شروع کر دی تھی، جب اس کا کچھ اندازہ ہوا کہ محمد قلی قطب شاہ اس رشتہ کو بہ نظر استحسان دیکھتا ہے تو خواجہ علی ملک التجار شیرازی کو سفیر بنا کر دارالسلطنت گولکنڈہ (بھاگ نگر) روانہ کیا گیا تاکہ وہ امور ضروری کو طے کر کے بیجاپور اطلاع کرے۔ جس لڑکی کے لیے خواستگاری کی جا رہی تھی وہ محمد قلی قطب شاہ کی بہن اور ابراہیم قطب شاہ کی بیٹی تھی۔[2] جب محمد قلی قطب شاہ کو اس کا علم ہوا کہ خواجہ علی شیرازی کس غرض سے آیا ہے تو اس نے اپنے اُمراء اور اعیان کو حکم دیا کہ اس کی خاطرداری میں کسی قسم کا دقیقہ نہ اٹھا رکھیں۔ بیجاپور کے سفیر کی بڑی ہی آؤ بھگت کی گئی۔ بھاگ نگر سے کچھ فاصلہ تک آ کر گولکنڈہ کے امیروں نے اس کا استقبال کیا۔ بڑی بڑی دعوتیں اور جشن کئے گئے اور ہر طرح اسے خوش کیا گیا۔ جب خواجہ علی حرف مطلب زبان پر لایا تو محمد قلی قطب نے بڑی خوشی سے اس رشتہ کو قبول کیا، تمام معاملات طے ہو چکے تھے اب صرف رخصتی عمل میں آنیوالی تھی، شدہ شدہ یہ خبر احمد نگر کو بھی پہنچ گئی کہ دودمان نظام شاہیہ و خانوادہ قطب شاہیہ کے درمیان ایک مضبوط اور مستحکم اتحاد قائم کیا جا رہا ہے اور اس اتحاد کو مضبوط تر بنانے کے لیے ہمشیرۂ قلی قطب شاہ کو ابراہیم عادل شاہ کے ساتھ بیاہا جا رہا ہے۔ احمد نگر پر جیسا کہ پہلے بیان کیا گیا ہے صلابت خاں اس وقت

---

[1] فرشتہ۔

[2] برہان مآثر کے مصنف نے لکھا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کی ان بہن سے ابتدائً میراں حسین کی شادی ہونیوالی تھی مگر صلابت خاں جب وکیل السلطنت ہوا تو اس نے گولکنڈہ سے قطع تعلق کر کے بیجاپور کی شہزادی سے میراں حسین کی شادی کی۔ غالباً یہ لڑکی جواب ابراہیم سے منسوب ہوئی رہی تھی۔

حاوی تھا اس کو یہ خبر بہت ناگوار معلوم ہوئی اور بالخصوص اس وجہ سے کہ اس معاملہ میں احمد نگر سے مطلق رائے نہیں لی گئی، بغیر کسی استمزاج کے یہ دونوں ریاستیں ایک دوسرے سے اس طرح وابستہ ہو جا رہی تھیں۔ اور خصوصاً قلی قطب شاہ سے اس نے اپنی ناراضگی اور رنجیدگی کا اظہار کیا۔ قلی قطب شاہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت احمد نگر کی طاقت سے کچھ مرعوب تھا اس لیے اس نے پریشان ہو کر ایک دوسرا ہی رنگ اختیار کر لیا۔ ادھر بیجاپور سے جلدی ہونے لگی کہ شہزادی کو رخصت کر دیا جائے، ادھر احمد نگر کی ناراضگی کا حال سُنکر قطب شاہ تساہل کرنے لگا اور اپنی بہن کی پالکی روانہ نہیں کی۔ فرشتہ اس کی ایک اور وجہ بیان کرتا ہے وہ لکھتا ہے کہ محمد قلی قطب شاہ کے باپ نے مرتے وقت یہ نصیحت کی تھی کہ بغیر احمد نگر کی ریاست کے مشورے کے کوئی کام انجام نہ دینا اور کوئی اتحاد نہ کرنا جب صلابت خاں کی ناراضگی کا حال معلوم ہوا تو اس کو اپنے باپ کی نصیحت بھی یاد آئی، اب وہ اسی ادھیڑ بن میں تھا کہ اس زبردستی کی مخالفت اور کشیدگی سے کس طرح نجات ملے، اگر بہن کو رخصت کر دے تو نہ معلوم کیا نتائج ہوں، کہیں لڑائی کی شکل نہ پیدا ہو جائے۔ نہ تساہل ہی کر سکتا تھا کیونکہ بیجاپور کا زور بڑھ رہا تھا۔ وہ عجیب مصیبت میں تھا۔ بہر حال وہ کوشاں تھا کہ کسی صورت سے احمد نگر کا غصہ ٹھنڈا کر کے اپنی بہن کی شادی کے معاملات طے کر دے مگر اس میں بہت تاخیر ہو رہی تھی بیجاپور کو بھی ان حالات کی اطلاع ملگئی تھی، دلاور خاں اور خصوصیت کے ساتھ ابراہیم کو یہ بات بیحد ناگوار گذری کہ صلابت خاں گولکنڈہ پر اثر انداز ہو کر ایک بنی بنائی کارروائی کو بگاڑ دے۔ اور اس کے ساتھ احمد نگر سے رنج کی اور ایک وجہ بھی پیدا ہو گئی تھی جس کی تفصیل یہ ہے:-

جب ابراہیم کی بہن خدیجہ کو میراں حسین سے منسوب کیا گیا تو صلابت خاں نے اس امر پر اصرار کیا کہ دُلہن کے جہیز میں شولاپور کا قلعہ احمد نگر کو دیا جائے کیونکہ چاند بی بی کے جہیز میں یہ قلعہ بیجاپور کو ملا تھا، برہان ماثر نے تو یہ ظاہر کیا ہے کہ ابراہیم نے (یا صحیح طور پر اس کے وکیل السلطنت) اس شرط کو منظور کر لیا تھا مگر یہ بات کچھ صحیح نہیں معلوم ہوتی کیونکہ دلاور خاں ایسا آدمی نہیں تھا کہ وہ ایسی شرط کو منظور کر لیتا۔ خواہ قبول کیا ہو یا نہ ہو، مگر جب شہزادی احمد نگر پہنچی تو صلابت خاں کا اصرار اور بڑھ گیا۔ جب بیجاپور کی طرف سے کوئی خاطر خواہ جواب نہ ملا تو دُلہن کو دُلہا سے بالکل علٰحدہ رکھا گیا، اور اس وقت تک

شہزادہ کے سپرد کرنے سے انکار کر دیا جب تک کہ احمد نگر کا مطالبہ پورا نہ ہو۔اس میں بیجاپور کی تحقیر تھی ایک تو صلابت خاں کی یہ حرکت اور دوسری طرف اسی کی وجہ سے گولکنڈہ سے شہزادی کا نہ آنا، یہ ایسی چیزیں تھیں جو سلیم الطبع سے سلیم الطبع شخص کو جھڑکانے کے لیے کافی تھیں۔ دلاور خاں اپنی اور اپنی سلطنت کی اس میں ہتک سمجھ رہا تھا بادشاہ بھی جو اس وقت جوان ہو گیا تھا بیحد غضب آلود تھا جب معاملات سلجھتے ہی نظر نہ آئے تو دلاور خاں نے ٹھانی کہ دونوں ریاستوں پر فوج کشی کر کے مطلب براری کی جائے کیونکہ اب اس کے سوا اور کوئی چارہ بھی نہ تھا، چنانچہ حملہ کی تیاریاں ہونے لگیں۔

قطب شاہی اور نظام شاہی سرحدوں پر فوج کشی۔

جب فوجیں آراستہ ہو گئیں تو دلاور خاں نے ابراہیم کو لیکر سرحد نظام شاہی کیطرف پہلے رخ کیا، کیونکہ یہی بانی فساد تھی اور اس سے دوہری دوہری شکایت تھی۔ ابراہیم کی یہ پہلی فوج کشی ہے جس میں اس نے حصہ لیا۔ بیجاپوری فوجوں نے سرحد کے قریب پہنچکر قلعہ اوسہ کا محاصرہ کر لیا! اس مہم میں دلاور خاں نے مزید تقویت کے لیے برید کو بھی اپنے ساتھ لے لیا تھا جب بیجاپوری فوجوں نے اوسہ کا محاصرہ کر لیا اور احمد نگر پر چڑھائی کی تیاری کرنے لگیں تو یہ خبر مرتضیٰ نظام شاہ کو بھی پہنچ گئی جو ایک زمانہ سے گوشہ نشین تھا۔ تمام حالات صلابت خاں سے دریافت کئے اور جب معلوم ہوا کہ سارے جھگڑے اور فساد کا باعث وہی ہے تو فوراً عہدے سے معزول کر کے قید کر دیا۔ نظام شاہی حکومت کی طرف سے صلح کے لیے اکثر امرا، دلاور خاں کے پاس آئے، دلاور خاں بھی معاملات کو زیادہ بڑھانا مناسب نہ سمجھا کیونکہ جب اصلی شکایت رفع ہو گئی یعنی دلہن کو عزت و توقیر کے ساتھ میراں حسین کے سپرد کر دیا گیا تو دلاور خاں نے مراجعت پر رضامندی ظاہر کی۔ بانی شر و فساد یعنی صلابت خاں معزول کر دیا گیا تھا اس لیے گولکنڈہ کی جانب سے بھی اطمینان تھا کہ اب وہ لڑکی کو روانہ کرنے میں تساہل نہیں کریں گے، اس لیے دلاور خاں نے یہاں سے نکل کر سرحد قطب شاہی کی راہ لی۔[1]

---

[1] برہان مآثر نے لکھا ہے کہ جب احمد نگر سے شولاپور کے معاملہ پر بگاڑ ہوا تو ابراہیم نے گولکنڈہ سے اتحاد کیا۔ اور محمد قلی قطب شاہ کی بہن سے شادی کر کے اپنا ساتھی اور ہمنوا بنا کر احمد نگر کا رخ کیا۔ مگر گزشتہ دوسری طرح

جب محمد قلی قطب شاہ کو یہ سُن گُن لگی کہ فوجیں کس غرض سے آرہی ہیں تو اس نے بھی نہایت تیزی سے مصطفےٰ خاں (امیر زنبیل) کی ہمراہی میں (جس کے ساتھ امین الملک، اعتبار خاں، فخر الملک وامین خاں بھی تھے) چاند سلطانہ المعروف بہ ملکۂ جہاں کی سواری باد بہاری نلدرگ روانہ کردی اور وہیں ابراہیم کا عقد ملکۂ جہاں کے ساتھ ہوگیا۔ چالیس روز تک عیش ونشاط کے جلسے ہوتے رہے جب ابراہیم کو معلوم ہوا کہ اس کی دلہن کی سواری آرہی ہے تو خود اس نے اُمراء واعیان کے ساتھ آدھ کوس تک آگے بڑھ کر استقبال کیا اور بڑی جاہ وحشمت وتجمل کے ساتھ ابراہیم کی شادی نلدرگ کے تاریخی مقام پر ہوئی۔[1] چونکہ دونوں مطالب حاصل ہوگئے تھے اس لیے بیجاپوری لشکر ابراہیم اور دلاور خاں کی سرکردگی میں کامرانی وکامیابی کے ساتھ بیجاپور میں داخل ہوا۔

ان حالات کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت دکن کی خارجی فضا اس قدر خراب ہوگئی تھی کہ جو چیزیں اتحاد واخلاص پیدا کرنے والی ہوتی ہیں وہی رنج وفساد کا باعث ہوا کرتی تھیں۔ دلاور خاں نے کوشش تو اس لیے کی تھی کہ دونوں ریاستوں سے خوشگوار تعلقات پیدا ہوں، لیکن اُلٹا جب تک فوج کشی نہ کی گئی مطلب حاصل نہ ہوا۔ اس طرح جیسا پہلے لکھا گیا ہے اس کارروائی کا خلاف توقع نتیجہ برآمد ہوا۔

احمد نگر پر حملہ ابھی ان حالات سے فرصت نہ ملی تھی کہ بیجاپور کو پھر ایکبار احمد نگر کی طرف توجہ کرنی پڑی۔ مرتضیٰ نظام شاہ کی دیوانگی کے بارے میں اس سے پہلے بھی لکھا گیا ہے، اب اس کا جنون اور بڑھ گیا،

(بسلسلۂ گذشتہ) ان واقعات کی تفصیل دیتا ہے جو اوپر دی گئی۔ تاریخ قطب شاہی میں ان تفصیلات کا ذکر نہیں، اور نہ یہ بتلایا گیا ہے کہ محمد قلی نے اپنی بہن کی پالکی روانہ کرنے میں کچھ تساہل کیا، جس کی وجہ فوج کشی لاحق ہوئی۔ تحفتہ الملوک نے بھی یہی لکھا ہے کہ پہلے سرحد قطب شاہ کی طرف توجہ کی گئی اور شادی کے بعد سرحد نظام شاہ کی طرف (ملاحظہ ہو برہان مآثر، تاریخ قطب شاہی، تحفتہ الملوک وتاریخ فرشتہ)۔

[1] تاریخ قطب شاہی۔

اس جنون میں اسے اپنے بیٹے سے شبہ پیدا ہو گیا تھا، اس لیے اس کو قتل کر دینا چاہتا تھا اور اپنے وزیروں اور مشیروں کو اس کام کے لیے مقرر کیا، مگر کوئی ذی ہوش آدمی ایک بے گناہ کو قتل کرنے میں کیا دلچسپی لے سکتا ہے۔ جب یہ ناکام رہے تو انھیں معزول کر دیا، اب مرزا خاں کی باری آئی۔ یہ وکیل السلطنت ہو گیا تھا، اس نے یہ سوچا کہ بادشاہ دیوانہ ہے اسے معزول کر کے میراں حسین کو تخت نشین کر دیا جائے۔ چونکہ وہ تنہا اس کام کو انجام نہیں دے سکتا تھا اس لیے بیجاپور سے مدد طلب کی۔ ابراہیم کی بہن میراں حسین کو دگئی تھی اس لیے بیجاپور نے مدد کا وعدہ کر لیا۔ ۹۹۶ھ میں تیس ہزار سواروں کے ساتھ بیجاپوری افواج میراں حسین کی مدد کے لیے پہنچیں خود ابراہیم بھی اس فوج کے ساتھ تھا لیکن بیجاپور کی یہ فوج میراں حسین کو بادشاہ بنانے میں کوئی مدد نہ دے سکی کیونکہ اسی اثناء میں مرزا خاں کی کوششوں سے میراں حسین تخت و تاج کا مالک بن گیا تھا، اور احمد نگر میں اس کی تاجپوشی عمل میں آچکی تھی۔ ابراہیم کو جب یہ معلوم ہوا کہ میراں حسین بادشاہ ہو گیا ہے تو وہ بہت خوش ہوا اور مبارکباد کے لیے اپنے ہاں سے آدمی روانہ کئے، اور ساتھ ہی یہ بھی ارادہ تھا کہ احمد نگر جا کر اپنی بہن سے ملاقات کر کے پھر بیجاپور لوٹ جائے، مگر اتنے میں خبر ملی کہ میراں حسین نے بادشاہ ہو کر نہایت بیدردی اور بیرحمی کے ساتھ اپنے باپ کو قتل کر دیا ہے (جو دراصل مرزا خاں کے سمجھانے بجھانے سے میراں حسین نے کیا تھا) ابراہیم کو یہ سن کر بہت رنج ہوا کہ ایک ناخلف بیٹے نے اپنے ہاتھ کسی اور کے خون میں نہیں بلکہ اپنے باپ کے خون میں رنگے ہیں، نہایت غصہ اور خفگی کے عالم میں اس نے احمد نگر جانے کا ارادہ ترک کر کے بیجاپور کی راہ لی، اور جاتے ہوئے اس نے مبر حسین کرد کو میراں حسین کے پاس روانہ کیا۔ فرشتہ کے الفاظ بقیہ بیان کے حامل ہیں، ابراہیم نے اس بیباک اور منہ پھٹ سفیر کے ذریعہ کہلا بھیجا کہ "غرض از لشکر کشی ما و آمدن ما بدیں حدود آں بود کہ ترا بر تخت احمد نگر جلوس فرمودہ پدرت مرتضیٰ نظام شاہ را کہ گوشہ اختیار کردہ بود در کنج خانہ با دریچے از فلاع بو کلے سپردہ نگاہ داریم تا بفراغ بال بغاوت قادر ذو الجلال مشغول باشد، اکنوں شنیدہ میشود کہ از دنامت عاقبت و غضب سلطانی روز الست تر سد شدہ قصد پدر بزرگوار نمودی، و احیاناً اگر زیادہ از حد خود را بو سواس شیطانی دادہ بہ توہم بودی بیکے از دو کار بایستی کرد، یا او را نزد من بالستی فرستاد و اورا بحفاظت تمام نگاہ داشتہ ترا از دغدغہ

خلاص سازم یا آں کہ بہ نشتر جفا چشم جہاں بیں او را گزند رسانیدہ مرتکب ہلاک پدر پیر نیکلیٰ "[1]

اور ساتھ ہی یہ بھی کہلا بھیجا کہ "پدر کشی" راس نہیں آتی، تیری سلطنت مبارک نہ ہوگی اور چند ہی روز میں تو اپنے گناہ کے مکافات کو پہنچے گا، اس سفیر کو روانہ کر کے بادشاہ اور دلاور خاں مع فوج کے اپنے مستقر کو واپس ہوگئے۔

دارالسلطنت کی طرف توجہ جب ان دو تین مہموں سے فراغت حاصل ہوئی تو شاہی سواری بیجاپور کو چلی، بیجاپور پہنچنے کے بعد کچھ عرصہ تک تو حسب معمول انتظام سلطنت دلاور خاں کی زیر ہدایت چلتا رہا، ان مہموں کے بعد دلاور خاں کا سکہ ملک پر اور بھی اچھی طرح بیٹھ چکا تھا، تمام انتظامات کی کنجی اس کے ہاتھ میں تھی۔ درحقیقت یہ وہ زمانہ تھا جبکہ حکومت اور بادشاہت ابراہیم نہیں بلکہ دلاور خاں کر رہا تھا کسی بڑے سے بڑے امیر، عالی مرتبت سے عالی مرتبت عہدہ دار کی مجال نہ تھی کہ وکیل السلطنت کے سامنے دم بھی مار سکے، اس نے ایسا انتظام کیا تھا کہ نہ صرف ملک کا سیاسی نظم و نسق اس کے ہاتھ میں کھنچکر آگیا تھا، بلکہ محل کے اندر بھی وہ پورا پورا حاوی تھا۔ بادشاہ کو حق نہ تھا کہ اس کی اجازت کے بغیر گھونٹ بھر پانی بھی پی سکے، بادشاہ کے اردگرد جتنے ملازمین و خدمتگار اور مقربین رہتے تھے وہ سب دلاور خاں کی آنکھ کے اشارے پر کام کرتے تھے۔ اس کے خلاف مرضی تنکا بھی نہ ہل سکتا تھا۔ غرض دلاور خاں اس وقت ریاست کا روح رواں اور ایک طرح سے "آمر مطلق" ہوگیا تھا، وہ بیجاپور پر بادشاہت کر رہا تھا، شاید بادشاہوں کو بھی کبھی اتنا مکمل اختیار حاصل نہ ہوا ہوگا، کیونکہ بالعموم بادشاہ اپنے مقربین اور معتمدین کے اختیار تمیزی پر بہت سارے امور سلطنت کی انجام دہی چھوڑ دیتے ہیں، مگر چونکہ دلاور خاں ایک متولی تھا اور بادشاہ نہ تھا اس لیے اس کے استقلال اور اس کی قوت کی بقاء کے لیے یہ ضروری تھا کہ دوسروں کو معاملات سلطنت میں کم سے کم دخل دینے کا موقع دے اور زیادہ سے زیادہ اختیارات اپنے ہاتھ میں رکھے، اس طرح قدرتی طور پر اس کی طاقت بڑھتی ہی گئی لیکن جب دلاور خاں کی قوت معراج کمال کو پہنچی ہوئی تھی عین اسی وقت ایک ردعمل ہوا، اول تو بادشاہ کو اپنے اتالیق کا

[1] تاریخ فرشتہ۔

غیر معمولی عروج پسند نہ تھا۔ وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس مقتدر نائب کے مقابلہ میں وہ بالکل مجبور محض ہے،
اگر چند سال یہی حال رہا تو ابراہیم کی بادشاہت کا تو فقط نام رہے گا اور بیجاپور پر اصلی اور حقیقی حکومت
کرنے والا دلاور خاں حبشی ہوگا۔ ابراہیم کی والدہ بھی خائف ہو چلی تھیں اور کوئی تدبیر بھی بن نہ پڑتی
تھی، کیونکہ جس کو نمک حلال اور وفادار سمجھ کر وزیر سلطنت بناتے ہیں وہ چند روز کے بعد ایسے
پاؤں پھیلاتا ہے کہ الاماں خود بادشاہ کی بادشاہت خطرہ میں پڑ جاتی ہے، اب اعتماد کیا جائے تو
کس پر، اور مدد لی جائے تو کس سے۔ دلاور خاں سمیت اب تک چار متولیان ریاست گذر چکے ہیں،
جب ایک نے نمکحرامی کی تو دوسرے کو طلب کیا، جب دوسرے نے رنگ بدلا تو تیسرے سے مدد لی،
جب تیسرے کی وجہ سے خرابیاں پیدا ہوئیں تو چوتھے کو وزیر سلطنت بنایا گیا، مگر ان میں سے ہر ایک
دوسرے کا استاد ہی نکلتا گیا۔ اب دلاور خاں کے زمانے میں خود متولی اس قدر حاوی ہو گیا تھا کہ اس کے
مقابل کوئی بھی چوں نہیں کر سکتا تھا۔ طاقت کا غیر معمولی طور پر بڑھا لینا اشتباہ کا باعث ہو جاتا ہے،
خصوصیت کے ساتھ اس وجہ سے کہ جنہوں نے بھی طاقت حاصل کی وہ شرارت پر آمادہ ہوئے، اسلیے
سب سہمے ہوئے ہی تھے کہ دیکھئے اب دلاور خاں کی یہ غیر معمولی طاقت کیا رنگ لاتی ہے۔

بادشاہ کی معزولی کی افواہ اسی اثنا میں یہ خبر یا افواہ پھیل گئی کہ دلاور خاں ابراہیم کو معزول کر دینا چاہتا ہے
اور اس کی جگہ اس کے بھائی اسمٰعیل کو جو اس وقت مصطفےٰ آباد میں قید ہے بادشاہ بنانے کا ارادہ رکھتا ہے۔
اس خبر کا پھیلنا تھا کہ سارے شہر میں ایک آگ سی لگ گئی۔ یوں بھی عوام الناس اور ملک کے مختلف طبقے
دلاور خاں کی ترقی کو مشتبہ نگاہوں سے دیکھ رہے تھے جب یہ خبر ملی تو ان کے نزدیک اس کا وجود
آیۂ آسمانی سے کچھ کم نہ تھا، اس سرے سے اس سرے تک ایک سنسنی پھیل گئی کیونکہ ملک میں جب ایسے انقلابات
رونما ہوتے ہیں تو ملک ان کے برے نتائج سے محفوظ نہیں رہ سکتا، روزمرہ کی معمولی معاشرتی، معاشی اور
تجارتی زندگی پر ان کا گہرا اثر پڑتا ہے، اسی وجہ سے تجارتی اور زراعتی طبقہ کسی ملک میں انقلابات کے
موافق نہیں ہوتا، کیونکہ اس کے معنی حکومت کی مشنری کی سرے سے تبدیلی اور ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے،
ایسی حالت میں ملک میں خونریزیوں کا اندیشہ پیدا ہوتا ہے، ایک فریق دوسرے فریق سے گتھم گتھا اور

دست وگریباں ہو جاتا ہے، جب کوئی خاص اہم سوال اٹھایا جاتا ہے تو اس کے متعلق آراء کا کتنا
اختلاف ہوتا ہے، یہ تو بادشاہ کی تبدیلی کا مسئلہ تھا، ہر ایک طبقہ کے مختلف اغراض ہوتے ہیں
اور وہ ان اغراض کے اعتبار سے کسی خاص فریق کے موافق یا مخالف ہو جاتے ہیں، ذی حیثیت
اور عالی مرتبت اُمراء کی جنگ میں متوسط اور امن پسند طبقہ پس جاتا ہے! ابھی ملک والوں کو
اخلاص خاں کا وہ زمانہ یاد تھا جبکہ حمید خاں، اخلاص خاں اور دلاور خاں کی باہمی مخالفتوں میں
عام شہری گھن کی طرح پس رہے تھے اور روزانہ کی جھڑپ میں بے گناہ لوگ مارے جاتے تھے۔
دوست محمد صاحب کے ساتھیوں کا دوکان میں ایک گولہ کی زد سے مارا جانا اس کی بین دلیل ہے۔
غرض جب عامۂ خلایق کو اس کی خبر لگی تو وہ سراسیمہ و پریشان ہوئے اور ڈر رہے تھے کہ پھر کہیں
ملک میں ایک زبردست خانہ جنگی کا آغاز نہ ہو جائے (اور خانہ جنگی کا ہونا لازمی تھا اگر
دلاور خاں کو یہ خیال آجاتا کہ بادشاہ معزول کر دیا جائے) کیونکہ ہزار دلاور خاں ملک میں انتہائی
طاقت حاصل کرلے مگر جب بادشاہ کی علیحدگی کا سوال اُٹھے گا تو بہت سارے نمک حلال
اور وفادار اُمراء بادشاہ کے لیے اپنی جان پر کھیل جائیں گے، لازمی طور پر ملک میں دو فریق پیدا
ہو جائیں گے، کچھ تو حقیقی نمک حلالی اور وفاداری کے جذبات سے متاثر ہو کر ابراہیم کا ساتھ
دیں گے، اور کچھ دلاور خاں کو نکال باہر کرنے اور اس کے طمطراق کا خاتمہ کرنے کے لیے۔ اس کے علاوہ
کچھ اپنی ذاتی مخالفتوں، کاوشوں اور مخاصمتوں کی وجہ سے بادشاہ کے طرفدار ہو جائیں گے اور
کچھ محض فائدے کی غرض سے دلاور خاں کی ہمنوائی میں اٹھ کھڑے ہوں گے، بہرحال اس طریقہ سے
سخت اندیشہ تھا کہ اک زبردست شورش برپا ہو جائے، اور عوام کا طبقہ بھی بے چین تھا۔
بالعموم عام رعایا کو بادشاہ سے اک خاص دلبستگی اور محبت سی پیدا ہو جاتی ہے، ابراہیم گو ابھی نوعمر
تھا مگر اس کے اخلاق و عادات اس کی رحمدلی اور کریم النفسی کی روایتیں ملک میں عام تھیں، اس کو
تخت شاہی پر تمکن ہو کر اتنا عرصہ گذر چکا تھا کہ ملک کے جذبات اس سے وابستہ ہو جائیں، اور ملک کبھی
یہ گوارا نہیں کرتا تھا کہ صرف دلاور خاں کے ذاتی فائدے کے لیے اپنے لایق، رحمدل اور مقبول بادشاہ کو

بے وجہ الگ کر دیا جائے۔ ان وجوہات کی بنا پر تمام شہر میں اک اضطراب سا تھا جب عام شہر کا یہ حال ہو تو شاہی محل کا کیا عالم ہوگا، یہ خبر ایسی نہ تھی کہ ابراہیم اور اس کی والدہ کے کانوں تک نہ پہنچتی، شاہی محل میں ایک کہرام مچ گیا، بادشاہ اور اس کی والدہ گھڑی بھر نہ سو سکے، تمام رات پریشانی میں کٹ گئی، ابراہیم اس وقت جوان ہو چکا تھا، وہ دلاور خاں کے اس خیال سے آگاہ ہو کر بوکھلا گیا۔

جب صبح طالع ہوئی تو دلاور خاں حسب معمول سلام کے لیے حاضر ہوا اس کو خفیہ طور پر پہلے ہی معلوم ہو گیا تھا کہ محل شاہی میں رات بھر کیا حشر برپا رہا، اپنے معمولی فرائض کی انجام دہی کے بعد وہ بادشاہ کو خلوت میں لے گیا اور اس پریشانی کے متعلق استفسار کیا (اس وقت دلاور خاں اور ابراہیم کے درمیان جو گفتگو ہوئی اس کو اتفاقاً رفیع الدین شیرازی نے لفظ بہ لفظ سن لیا، کیونکہ رفیع الدین شیرازی کو جامدار خانہ اکسوت خانہ کا بھی صدر بنایا گیا تھا، اس لیے وہ بادشاہ کے قریب ہی رہتا تھا، اس وقت اتفاق سے وہ کسی دوسرے حصے میں پردے کے پیچھے تھا کہ دلاور خاں نے بادشاہ کو خلوت میں لا کر گفتگو کی اور اس طرح اس نے سن لیا) ابراہیم ذرا ہچکچایا اس کے بعد جی کڑا کر کے جو کچھ سنا تھا من وعن دھرا دیا۔ دلاور خاں جب نفس معاملہ سے آگاہ ہوا تو اس نے بے اختیارانہ اپنا سر پیٹ لیا اور کہا کہ باوجود اتنی وفاداری اور جاں نثاری کے شک و شبہ جاتا نہیں اور نت نئے طوفان اٹھائے جاتے ہیں، یہ کہہ کر اس نے اپنے گھر کی راہ لی اور جاتے ہوئے جو کچھ اہل دربار دربار حال میں موجود تھے انھیں کہتا گیا کہ آیندہ سرکاری کاروبار سب قلعہ میں انجام پائیں گے۔ کوئی شخص کسی حال میں بھی سرکاری کاروبار کی غرض سے اس کے گھر پر نہ آئے، وہ خود ان کی انجام دہی کے لیے قلعہ حاضر ہو جایا کرے گا، لیکن اس کے بعد اس پر اس قدر خوف و ہراس طاری ہوا کہ وہ بالکل خانہ نشیں ہو گیا اور پانچ چھ روز تک گھر سے باہر قدم نہ ڈالا، تمام سرکاری کاروبار بالکل بند رہے، حکومت کی مشنری یکلخت رک گئی، جہاں روزانہ حکومتی کاروبار کی گرما گرمی رہتی تھی، وہاں ایک سناٹا چھایا ہوا رہنے لگا، سرکاری کاروبار یکایک رک جانے سے ملک کی پریشانیوں میں اور زیادتی ہوگئی، ملک کے سیاہی منش لوگ اس پر تلے ہوئے تھے کہ اگر بادشاہ کا ذرا بھی اشارہ پائیں تو دلاور خاں کو مع اس کے ہمنواؤں کے آن واحد میں

تہ تیغ کرڈالیں۔ بادشاہ کی معزولی کی افواہ نے اس کی ساری طاقت کو یک قلم سلب کر لیا، اور وہ مقہور و معتوب کی طرح اپنی صورت چھپائے بیٹھا تھا، اس کو کوئی صورت اپنی خلاصی کی نظر نہ آتی تھی، اندیشے بڑھتے ہی جا رہے تھے اس کو کسی پر اعتماد باقی نہ رہا تھا، اور وہ کسی کو اپنے پاس آنے بھی نہ دیتا تھا حتیٰ کہ رومی خاں جس کی لڑکی دلاور خاں کے بیٹے عبدالقادر سے منسوب تھی اس پر بھی دلاور خاں کو بھروسہ نہ رہا تھا۔ کاروبار کے تعطل کا یہ عالم تھا کہ رومی خاں جو قلعہ دار تھا قلعہ کے اندر جانے سے احتراز کر رہا تھا، اور رفیع الدین شیرازی کا بیان ہے کہ وہ دو چار روز تک بادشاہ کے کپڑے بدلنے کی خدمت انجام نہ دے سکا۔[۱]

جب چند روز اسی طرح گذر گئے اور صورت حال کچھ ٹھیک نہ ہوئی تو اس امر کی کوشش کی جانے لگی کہ دلاور خاں پھر برسر کار ہو جائے، اس لیے کہ اگر حکومت یونہی معطل رہے تو نہ معلوم ملک میں کتنے فساد اور برپا ہو جائیں۔ شر و فساد پر جو طبقہ ہمیشہ آمادہ رہتا ہے وہ کیا کچھ ستم نہ ڈھائے اور ملک کو مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے، لہٰذا ان آنیوالے خطروں سے ملک کو بچانے کے لیے کوئی مصالحت کی صورت نکالنے کی ازبس ضرورت تھی اور فی الحال سب سے اہم کام دلاور خاں کو سمجھا بجھا کر اس کے اپنے عہدے پر بحال کرنا تھا تاکہ کوئی نازک صورت پیدا ہو جائے تو کم از کم اس کا سد باب کیا جا سکے۔ اب تقریباً ہر شخص یہ جان لیا تھا کہ دلاور خاں اس معاملہ میں بے قصور ہے اور وہ ایسی غداری کا مرتکب نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کے افعال اس کی بے گناہی کو ثابت کر رہے تھے، ورنہ حقیقتاً اگر وہ غداری پر تلا ہوا ہوتا تو اس طرح خانہ نشیں کیوں ہو جاتا۔ پہلے ہی سے ایسے انتظامات کرتا کہ ملک اور فوج اپنے قابو میں رہے اور کسی قسم کی مزاحمت نہ ہو سکے، یہ افواہ دراصل دلاور خاں کے انتہائی عروج کو ایک مشتبہ شکل دینے کے لیے اڑائی گئی تھی۔ چنانچہ ایک مصالحتی کمیٹی بٹھائی گئی اور اس کام کے لیے سید اسمٰعیل دبیر جو معتمدین ریاست میں تھا اور خود دلاور خاں کے بیٹے اور امیر حسین متوفی اسماالک جسے دلاور خاں اپنا بیٹا کہا کرتا تھا، اور رومی خاں منتخب کئے گئے، ان لوگوں نے دلاور خاں کو تمام نشیب و فراز سمجھایا اور بتلایا کہ خود اس طرح معزول ہو کر بیٹھ رہنا خلاف عقل بات ہے، ملک کے ہزار دوست و دشمن لگے رہتے ہیں

[۱] تحفۃ الملوک۔

اس بدنظمی سے فائدہ اٹھاکر ممکن ہے شریرالنفس طبقہ بغاوت کر دے اس لیے بہتر ہے کہ پھر وہ معاملات سلطنت کیطرف رجوع کرے، لیکن دلاور خاں پر ان باتوں کا کچھ بھی اثر نہ ہوا آخر کار اس کے ایک بیٹے محمد خاں نے جو نہایت دانشمند زیرک اور لایق و فاضل آدمی تھا اور اس کے علاوہ دلاور خاں پر بھی اس کا بہت اثر تھا، اپنے باپ کو سمجھایا کہ یہ طرز عمل ٹھیک نہیں ہے، اس میں سارے خاندان کی رسوائی ہے اور اگر اس وقت بادشاہ ذرا بھی اشارہ کر دے تو اس کا سارا خاندان برباد ہو جائے گا، عزت و ناموس خاک میں ملجائے گی اور گھر کی عورتیں کہاروں اور چماروں کے حوالے ہو جائیں گی، اس نے اس خوبی سے اس کے طرز عمل کی غلطی ذہن نشیں کروادی کہ وہ معاملات سلطنت کی طرف رجوع کرنے پر راضی ہو گیا اس کا راضی ہونا تھا کہ محمد خاں نے رومی خاں کے پاس آدمی دوڑا دیئے کہ دلاور خاں کو سمجھا لیا گیا ہے، اب کوئی تدبیر مصالحت کی کیجائے۔ رومی خاں خود قلعہ کے اندر جانے سے ڈرتا تھا اس لیے ایک معتمد بڈھیا کو ابراہیم کی والدہ کے پاس روانہ کیا کہ اس کا عندیہ لیا جائے، اس وقت ابراہیم اور ابراہیم کی والدہ دونوں دلاور خاں کے اس عجیب طرز عمل سے حیران و پریشان تھے ان کو بھی کچھ نہ سوجھتا تھا کہ کیا کیا جائے، اگر دلاور خاں نے واقعی نمک حرامی کی تھی تو وہ ان حالات کے معلوم کرتے ہی خانہ نشیں کیوں ہو گیا، وہ کچھ زور و قوت سے بھی کام لے سکتا تھا، مانا کہ ملک کا بیشتر حصہ اس کے خلاف ہو گیا تھا مگر پھر بھی وہ ایک زمانے سے وکیل السلطنت تھا، اسکا اثر و رسوخ بھی کافی تھا، اس کے حامی اور طرفدار موجود تھے آخر کچھ نہ کچھ قوت تو اس کے پاس تھی وہ کچھ تو ہاتھ پاؤں مار سکتا تھا، لیکن اس کا خانہ نشیں ہو جانا اور از خود معزولی یہ بتا رہی تھی کہ یہ محض افواہ ہی افواہ ہے اور اس کے دل میں نمک حرامی کا خیال تک نہ تھا چونکہ وہ محض خالی الذہن تھا اس لیے واقعات کا یکایک یہ رنگ دیکھ کر گھبرا گیا، پریشانی میں اس سے اور تو کچھ بن نہ پڑا صرف ذاتی محافظت کے لیے خانہ نشیں ہو گیا۔ اس لیے ابراہیم اور اس کی والدہ کا دل دلاور خاں کی طرف سے صاف ہو چکا تھا اور بدگمانیاں جاتی رہی تھیں، اگر بفرض محال اب دلاور خاں کی جانب سے انھیں بدگمانی تھی بھی تو وہ اتنا ضرور سمجھتے تھے کہ دلاور خاں تنہا انھیں اتنا نقصان نہیں پہنچا سکتا جتنا کہ تمام ملک میں

شورش کی آگ پھیل جانے سے ہوسکتا تھا۔ دوسرے ملک نے اس تھوڑے سے عرصہ میں بادشاہ سے جو اپنی وفاداری کا اظہار کیا تھا اس سے دلاور خاں کی قوت دفعتہً سلب ہوگئی تھی اور اس کی عقل بھی ٹھکانے لگ گئی تھی۔ اگر وہ غداری کی طرف راغب بھی تھا تو ان حالات کے مشاہدے کے بعد اس میں ہمت نہ رہی تھی کہ اپنے خیال کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے، اسی بنا پر ابراہیم کی والدہ کا بھی یہی خیال تھا کہ دلاور خاں حکومت کو پھر اپنے ہاتھ میں لے لے اس کے علاوہ جب اس کو یہ معلوم ہوا کہ دلاور خاں کو منا لیا گیا ہے تو اس نے رومی خاں کی بتائی ہوئی تدبیر پر عمل کروانے کا وعدہ کر لیا۔

مصالحت دوسرے روز صبح ابراہیم کی والدہ نے اسے سمجھا بجھا کر دلاور خاں کے گھر روانہ کیا، دلاور خاں کی بدگمانی اور پریشانی دور کرنے اور عوام الناس پر یہ ظاہر کرنے کے لیے کہ بادشاہ کو دلاور خاں پر کامل اعتماد ہے یہ طریقہ اختیار کیا گیا تھا، اس سے ایک طرف تو دلاور خاں کی تالیف قلب ہوگئی، دوسرے دلاور خاں کی جانب سے جو ملک میں بدگمانی و نفرت پھیل گئی تھی، وہ دور ہوسکتی تھی، کیونکہ اس سے یہ ظاہر ہوجائے گا کہ بادشاہ اپنے ریجنٹ پر پورا پورا اعتماد رکھتا ہے، جب بادشاہ کا ہی اعتماد ظاہر ہوجائے گا تو پھر عوام الناس کو دلاور خاں سے بدگمانی کی کوئی وجہ باقی نہ رہے گی۔ درحقیقت تمام ملک کی اسی بدگمانی نے دلاور خاں کی ساری طاقت اور اختیارات کو آن کی آن میں سلب کر لیا تھا۔ غرض رومی خاں کی بتائی ہوئی تدبیر پر عمل کرکے بادشاہ بہ نفس نفیس دلاور خاں کی کوٹھی پر آیا، بادشاہ کی آمد کی خبر سنتے ہی دلاور خاں نے دوڑتے ہوئے آکر بادشاہ کے پاؤں چوم لیے اور اپنی وفاداری کا اظہار کیا، بادشاہ نے بھی اسے تسلی اور دلاسا دیا اور اپنے ساتھ قلعہ کو لے گیا، ابراہیم جس گھوڑے پر سوار ہوکر آیا تھا اسی پر دلاور خاں کو بٹھایا گیا اور خود ابراہیم سنگاسن[1] میں بیٹھ گیا، اس سے بھی یہی منظور تھا کہ بادشاہ کا کامل اعتماد اہل ملک پر ظاہر ہوجائے، دلاور خاں کی کوٹھی سے شاہی محل تک اس طرح بادشاہ اور ریجنٹ کی سواریاں گئیں، خلقت نے بھی اس ملاپ کو بہ نظر استحسان و اطمینان دیکھا اور ملک میں ایک قسم کی طمانیت پیدا ہوگئی، بادشاہ نے مزید تالیف قلب کے خیال سے دلاور خاں کو بہت کچھ تحفہ و تحائف سے سرفراز کرنا چاہا مگر دلاور خاں نے عرض کی اس وقت حضور کے جسم پر جو لباس ہے

[1] تحفۃ الملوک

وہی عطا کر دیا جائے کہ وہ دنیا کے سارے بیش بہا خلعتوں سے اس کو زیادہ بہتر سمجھتا ہے، بادشاہ نے دلاور خاں کی یہ خواہش پوری کردی، دلاور خاں نے اس کو اپنی خاص عزت افزائی پر محمول کیا، اس لین دین اور سرفرازی کے بعد دلاور خاں کو رسمی طور پر پھر سے وکیل السلطنت کے عہدے پر فائز کیا گیا، اور پھر دلاور خاں کے ہاتھ میں ملک کے انتظامات آ گئے، اس کارروائی سے وہ تمام پریشانیاں اور بدگمانیاں جو نہ معلوم کتنے بڑے فساد کا موجب ثابت ہوتیں یکایک اس طرح دب گئیں جس طرح دبی ہوئی آگ پر پانی چھڑک دیا جائے تو وہ بھسم ہو جاتی ہے۔ جب حکومت کی مشنری چلنے لگی تو ملک کے اس عنصر کو جو فتنہ و فساد کی طرف مائل تھا، اپنی کارروائیوں کو عملی جامہ پہنانے کا موقع نہ رہا اور یکبارگی ملک میں امن و امان قائم ہو گیا۔

دلاور خاں کی استحکامی تدابیر اس واقعہ کے بعد دلاور خاں کی آنکھیں کھل گئیں، وہ اچھی طرح دیکھ چکا تھا کہ ہزار طاقت و قوت اس کو حاصل ہو جائے، مگر ذرا سی غداری اور نمک حرامی کا خیال برباد کر دینے کے لیے کافی ہے۔ دلاور خاں اب تک خوابِ غفلت میں تھا اور اس کو اندازہ نہ تھا کہ ملک میں جذبۂ بادشاہ پرستی کا کیا عالم ہے، حالانکہ وہ وکیل السلطنت اور ملک کا سب سے اعلیٰ اور طاقتور ترین عہدہ دار تھا، فوج اس کے حکم میں، قلعہ اس کے تحت، حتیٰ کہ بادشاہ بھی اس کے ہاتھ میں تھا مگر آن کی آن میں یہ سب اس کے قابو سے اس طرح نکل گئے جیسا کہ پہلے تھے ہی نہیں۔

لہٰذا دلاور خاں اب چونک گیا تھا، اس کی جان جاتے جاتے بچ گئی تھی، وہ برباد ہوتے ہوتے رہ گیا تھا اس لیے وہ پہلے سے بھی زیادہ اپنے استحکامی تدابیر کرنے لگا۔ اب وہ مزید فوج جمع کرنے میں مشغول ہو گیا۔ (محض مزید فوج جمع کر لینا ہی کافی نہ تھا، بلکہ اس کو براہ راست اپنے ہاتھ میں رکھنا بھی از حد ضروری تھا کہ جب چاہے اور جس کے مقابل چاہے اسے لا کر کھڑا کر دے) اور اس زبردست فوج کی تیاری میں اسٹیٹ کا بے دریغ روپیہ خرچ کرنے لگا۔ قدیم فوج کو بھی نئے ساز و سامان سے آراستہ کیا اور اس کی تنظیم و ترتیب کی، تقریباً پانچ چھ ہزار ہون[1] خرچ کر کے نو ہزار سوار، چار ہزار پیادہ، تین سو ہاتھی کی اس نے ایک جرار و کرار فوج تیار کر لی، بہترین ساز و سامان اعلیٰ درجہ کے گھوڑے، طاقتور تنومند سپاہی

[1] تحفۃ الملوک۔

اور زبردست ماہرین فن جنگ جمع کئے گئے۔ اور اس فوج کو بہترین جنگی اصولوں پر تیار کی ہوئی فوج بنانے میں اس نے کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ جب فوج تیار ہوگئی تو اس کی کفالت کا سوال پیدا ہوا جو کچھ روپیہ منظور تھا وہ پہلی فوج کی خوراک و ضروریات کے لیے تھا اب اس مزید فوج کے لیے خزانہ پر بار ڈالنا پڑتا تھا لیکن بادشاہ کی منظوری ضروری تھی اس لیے منظوری حاصل کرنے کے لیے یہ چال چلی کہ ایک فوجی مظاہرہ کیا۔ بادشاہ کو ایک برج پر بڑی شان و شوکت سے بٹھایا گیا اور نیچے سے یہ نئی تیار شدہ فوج نہایت آراستگی و پیراستگی کے ساتھ گذرنے لگی۔ بادشاہ نے اس نئی فوج کا معائنہ کرکے بڑی مسرت ظاہر کی، دلاور خاں کی تعریف و تحسین کی اور اس کو اس کے بیٹوں کو خلعتہائے فاخرہ سے سرفراز فرمایا خلعت کے ساتھ ایک انگشتری بھی عنایت ہوئی جو الماس و یاقوت کی تھی، مرصع و زرنگار زین و لگام کے ساتھ ایک اسپ تازی، ہاتھی، شمشیر و خنجر اور ان کی زرین میانیں، غرض دلاور خاں کو بہت کچھ سرفراز کیا گیا اس تمام عطا کا اندازہ رفیع الدین" تقریباً دو لاکھ ہون" بتاتا ہے، یہ تو فقط عطیہ اور تحفہ تھا، اب اس فوج کے اخراجات کے لیے ایک سو قریے مزید دلاور خاں کے تفویض کئے گئے۔ عمال ریاست کو ہدایت دی گئی کہ یہ سو قریے فی الفور دلاور خاں کے حوالے کئے جائیں۔

اسی سلسلہ میں اکثر اُمرا کی جاگیروں کو ضبط کرکے دلاور خاں نے اپنا قبضہ کر لیا کہ فوج کی کفالت کا سامان ہو۔ چنانچہ بلال حبشی جو کچھ "خیالات فاسد"[1] پیدا کر رہا تھا اسے قید کرکے اندھا کر دیا گیا اور جاگیر چھین لی۔ شرزہ خاں اور جلال نامی ایک شخص کی جاگیریں ضبط ہو کر دلاور خاں کے قبضہ میں آگئیں۔ غرض اس طریقہ سے اس نے استحکامی تدابیر کا سلسلہ جاری رکھا۔ ہمعصر مورخ رفیع الدین شیرازی نے اس کارروائی پر جو رائے ظاہر کی ہے وہ نہایت بہتر ہے، وہ لکھتا ہے کہ "از عمل پنجہزار سوارانہ لشکر عالم پناہ کم شد۔ بر لشکر دلاور خاں افزود، غرض او ہمیں بود کہ خود را سنگین سازد، و عالم پناہ را سبک گرداند ہمیشہ مستولی

---

[1] بساتین السلاطین۔

[2] تحفۃ الملوک۔

باشد وقدرت بر دفع او نداشته باشند۔"[۱] ان جملوں سے صورت حال پر نہایت اچھی روشنی پڑتی ہے، وہ صاف طور پر لکھتا ہے کہ ان تمام افعال سے اس کا مقصد یہی تھا کہ خود اس قدر طاقتور اور باقوت ہو جائے کہ اگر بادشاہ چاہے بھی تو اسے حکومت سے خارج نہ کر سکے، گو اس کا خیال بادشاہ کو الگ کرنے کا نہ تھا مگر اس میں شک وشبہ کی گنجایش نہیں کہ وہ حکومت کا حریص تھا اور بادشاہ کو عضو معطل بنا کر خود حکومت کرنا چاہتا تھا، اس لیے ان غیر معمولی استحکامی تدابیر پر عمل کر رہا تھا، دلاور خاں کے ہاتھ سے حکومت جا کر دوبارہ آئی تھی، لہٰذا وہ اس کی حفاظت کو اپنا ایمان سمجھتا تھا۔ اپنے مزید استحکام کے لیے وہ نظام شاہی ریاست کے معاملات میں دخل دیتا ہے تاکہ اپنا اقتدار اور رسوخ بڑھے۔

احمد نگر دلاور خاں کو جب پورا استحکام حاصل ہو گیا تو اس نے احمد نگر کی طرف توجہ کی کیونکہ یہاں کے حالات اس امر کے متقاضی تھے، ابھی ان واقعات کو گذرکر بمشکل ایک سال ہوا ہوگا کہ میراں حسین نظام شاہ قتل کر دیا گیا، احمد نگر میں سخت اختلافات پیدا ہو گئے، دکنی اور غیر ملکی فریق میں وہ خوں ریزیاں ہوئیں کہ الاماں والحفیظ۔ غیر ملکی فریق کا رہبر مرزا خاں مارا گیا اور دکنی فریق کو فروغ حاصل ہوا جس کا رہبر اور لیڈر جمال خاں مہدوی تھا۔ اس نے اسمٰعیل کو (جو برہان کا بیٹا تھا) بادشاہ تسلیم کر لیا جو ایک کم لڑکا تھا اور خود معاملات سلطنت پر حاوی ہو کر مختار کل بن گیا۔ آدمی قابل اور کارداں ضرور تھا مگر مہدوی ہونے کی وجہ سے دوسرے طبقہ کے لوگ اسے پسند نہ کرتے تھے، ان وجوہات کی بنا پر احمد نگر کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔

جب احمد نگر میں یہ خرابیاں رونما ہوئیں تو دلاور خاں کو یہاں کے معاملات میں دخل اندازی کرکے کچھ تو اپنی طاقت ورسوخ میں اضافہ کرنے اور کچھ نظام شاہی علاقے حاصل کر لینے کی سوجھی، جیسا کہ احمد نگریوں نے اس سے پہلے بیجاپور کی اندرونی خرابیوں سے فائدہ اٹھا کر کیا تھا، چنانچہ ۹۹۷ھ مطابق ۱۵۸۹ء میں پھر دوبارہ بیجاپوری افواج نے احمد نگر کا رُخ کیا، یہ فوجیں یہاں سے روانہ ہو کر شاہ درگ پہنچیں اور وہاں فی الحال قیام گزیں ہو گئیں، اس غرض سے کہ بلبل خاں اپنی بھاری فوج کے ساتھ دلاور خاں سے یہاں ملحق ہو جائے اور اس کے بعد متحدہ قوت سے احمد نگر پر دھاوا بول دے۔

[۱] تحفۃ الملوک۔

مالابار کی دوسری مہم اوپر لکھا گیا ہے کہ دلاور خاں نے بلبل خاں کے انتظار میں شاہ درگ پر اپنی فوجیں ٹھیرادیں تو اب یہ معلوم کرنا چاہیئے کہ بلبل خاں کہاں گیا ہوا تھا اور کس لیے، جب ابراہیم اور دلاور خاں میراں حسین کی مدد کے لیے جاکر واپس آئے تو دلاور خاں نے بلبل خاں کو دوسری مرتبہ مالابار (کرناٹک) روانہ کیا کہ وہ جاکر کئی سال کا وصول طلب خراج حاصل کرے، اور وہاں کے سرکش زمینداروں، راجاؤں کی اچھی طرح سرکوبی کرے۔ تاریخ فرشتہ سے معلوم ہوتا ہے کہ تین سال کا خراج وصول طلب تھا جو تقریباً اسّی دیک لکھ پنجاہ ہزار ہون تک بڑھ گیا تھا۔ یہ مالابار کی دوسری مہم تھی پہلی مہم کا حال تو بالتفصیل دیا گیا اور اس کی ناکامی کے وجوہ بھی بتا دیئے گئے۔ بلبل خاں اسی وقت سے یہ چاہتا تھا کہ اسے موقع ملے تو وہاں کے زمینداروں کی اور بالخصوص شنکر نائک کی تنبیہ کرے مگر دلاور خاں نے ایک عرصہ تک اس طرف توجہ نہ کی تھی، کچھ تو اس وجہ سے کہ اسے دوسرے معاملات نے گھیر رکھا تھا، اور کچھ بلبل خاں کی حماقت کے باعث وہ بگڑا ہوا تھا، لیکن جب احمد نگر سے فوجیں واپس ہوئیں اور اس کا کوئی خاص نتیجہ بھی برآمد نہ ہوا تو اس نے بلبل خاں کو مالابار کی طرف روانہ کر دیا۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اتنا جلد پھر احمد نگر پر حملہ کرنے کی ضرورت ہوگی اور فوجوں کی موجودگی لاحق ہوگی، لیکن زمانے نے ایسا جلد پلٹا کھایا کہ بلبل خاں کے مالابار جانے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد احمد نگر کے حالات بگڑ گئے اور حملہ کا موقع ملا۔ چونکہ دلاور خاں کو جلدی تھی اس لیے وہ بلبل خاں کے آنیکا انتظار کئے بغیر فوجوں سمیت شاہ درگ آگیا اور صبا رفتار قاصدوں کو مالابار روانہ کیا کہ وہاں کے حالات جس رنگ پر ہوں انھیں ویسا ہی چھوڑ کر بلبل خاں اپنی ساری فوجوں کے ساتھ شاہ درگ آجائے۔ بلبل خاں کو دلاور خاں کا حکم تو ملا مگر وہاں کی صورت حال ایسی تھی کہ چھوڑ کر نہیں آسکتا تھا، اس لیے اس نے آنے میں تاخیر کی، ادھر دلاور خاں نے بلبل خاں کے انتظار میں ایک مہینہ گذار دیا اور شاہ درگ ہی میں پڑا رہا۔ مگر جب دیکھا کہ دیر کرنے سے جمال خاں کی قوت بہت بڑھ جاتی ہے تو توقف کو مناسب نہ جانکر احمد نگر کی طرف کوچ کر دیا۔ جمال خاں کو بھی ان حالات سے آگاہی تھی، بیجاپور کی فوج حملہ پر آتے ہوئے دیکھ کر وہ بھی پندرہ ہزار سواروں کے ساتھ دلاور خاں کے مقابلہ کو نکلا۔ قصبۂ آشٹی پر دونوں افواج نے پڑاؤ کیا چونکہ موسم بارش کا تھا اس لیے باقاعدہ جنگ شروع نہ ہوئی

[1] تاریخ فرشتہ

البتہ کبھی کبھی جھڑپ ہو جاتی تھی، جب بیس روز یونہی گذر گئے تو جمال خاں نے کوشش کی کہ صلح ہو جائے، اور اکثر سفیر اور ذی اثر لوگوں کے ذریعہ گفت و شنید شروع کی کیونکہ ابھی وہ کمزور تھا اس لیے لڑنا نہیں چاہتا تھا ادھر دلاور خاں بھی بلبل خاں کے نہ آنے سے فوجوں کی کمی محسوس کر رہا تھا جب اس نے دیکھا کہ جمال خاں آمادہ صلح ہے تو ان شرائط پر صلح کر لی کہ جنگ کا ہرجانہ ادا کیا جائے اور ابراہیم کی بہن خدیجہ کو مع جہیز کے واپس کر دیا جائے (جو میراں حسین مقتول کی بیوی تھی) جمال خاں نے دونوں شرائط کی تکمیل کی "ہفتاد و پنجہزار ہون[1] نعل بہا (یا ہرجانہ جنگ) ادا کئے، جب ان شرائط کی تکمیل ہو گئی تو بیجاپوری افواج واپسی کی تیاریوں میں تھیں کہ بلبل خاں اپنی فوج لیکر بڑی شان و شوکت سے ابراہیم کی خدمت میں حاضر ہوا۔

بلبل خاں اور دلاور خاں کی مخالفت۔ اول الذکر کا مقید اور محروم البصارت ہونا

جب بلبل خاں واپس آیا تو دلاور خاں اس سے بہت کبیدہ خاطر ہو چکا تھا کیونکہ اس نے حکم کی تعمیل میں تساہل کیا تھا، اگرچہ بلبل خاں کی یہ مہم کامیاب رہی تھی لیکن دلاور خاں نے اس پر شاہی فرمان کی خلاف ورزی کا الزام لگایا اور بادشاہ کو بددل کرنے کے لیے جو کچھ نقد و جنس وہ مالابار سے بطور خراج کے وصول کر لایا تھا، اس کی گھٹا گھٹا کر قیمت لگائی اور کہا کہ پوری رقم وصول نہیں ہوئی ہے بنا بریں بقیہ رقم کی تکمیل کی جائے، اس طریقہ سے یہ ثابت کرنا منظور تھا کہ نافرمانی اور تاخیر کے باوجود خاطر خواہ رقم وصول کر کے نہیں لایا۔ جب دربار میں دلاور خاں نے اس پر یہ الزامات دھرے تو بلبل خاں نے بیباکی سے جوابات دئے (کیونکہ جانتا تھا کہ بادشاہ اندرونی طور پر اس سے راضی ہے) اس نے حقیقت میں کوئی نافرمانی نہیں کی تھی، جس وقت شاہی فرامین پہنچے وہ تقریباً پوری مہم کو کامیاب بنا چکا تھا اسب زمیندار اور راجہ مطیع ہو چکے تھے، اور اب صرف روپیہ ہی وصول کرنا تھا، اگر ایسی حالت میں وہ نکل آتا تو ساری کی کرائی محنت اکارت جاتی اور اس دوسری فوج کشی کا بھی کچھ نتیجہ نہ نکلتا۔ پھر جب کبھی ادھر توجہ کی جاتی تو اتنی ہی کارروائی ازسرنو کرنی پڑتی، اسی لیے اس نے پندرہ دن کی دیری کو کچھ مضائقہ نہ جانکر رقم وصول کرنے میں مصروف رہا، اور اس میں وہ حق بجانب بھی تھا، اگر وہ ان زمینداروں پر یہ ظاہر کر دیتا کہ اسے واپسی کے احکام آ گئے ہیں تو ایک حبہ بھی وصول نہ ہوتا، فوج کی واپسی کو وہ لوگ مشکل کر دیتے اور شر و فساد پر اتر آتے غرض

[1] تاریخ فرشتہ۔

اس نے بڑی خوبی سے دلاور خاں کے الزامات کا جواب دیا اور اپنے آپ کو ہر طرح جرم سے بری ثابت کیا، الٹا اس نے دلاور خاں پر الزام لگایا کہ اس کی اپنی جلد بازی نے بے وجہ معاملات کو خراب کر دیا ورنہ وہ اگر اور پندرہ روز شاہ درگ میں اس کا انتظار کر لیتا تو مالا بار کی فوجیں اس سے آملتیں اور اس احمد نگری حملہ کو ایک کامیاب حملہ بنا سکتے، بغیر فوج کے محض مٹھی بھر آدمیوں کے برتے پر اس نے بادشاہ کو اتنی تکلیف دی جس کا کوئی بہتر نتیجہ بھی نہ نکلا۔

غرض بلبل خاں کے استدلال کے سامنے دلاور خاں کی کچھ پیش نہ گئی اس لیے اس نے اپنی ناراضگی ظاہر نہ کی الٹے بادشاہ سے سفارش کر کے بلبل خاں کو ایک خلعت فاخرہ سے سرفراز کروایا اور خود بھی بہت خندہ پیشانی سے پیش آیا اور خانگی طور پر اس سے کہا کہ اس کی اپنی یہ خیرخواہی محض مصلحت پر مبنی تھی کیونکہ اگر وہ ایسا نہ کرتا تو لوگ یہی کہتے کہ اپنا "آغوشی فرزند" ہونے کی وجہ سے رعایت کی۔ دلاور خاں کی ان چکنی چپڑی باتوں نے بلبل خاں کو غافل کر دیا، اس نے اپنی حفاظت کی کوئی تدبیر نہ کی بالآخر دلاور خاں نے موقع پا کر اسے قید کر لیا اور بعد کو اپنے حکم سے اس کی آنکھیں بھی نکلوا دیں، حالانکہ دلاور خاں پر اس حبشی غلام کے بہت سے احسانات تھے، اس کی وجہ سے دلاور خاں نے اخلاص خاں کے مقابلہ میں کامیابی حاصل کی تھی اور اس کو اپنا "آغوشی فرزند" بنا لیا تھا۔ بہرحال دلاور خاں سیاسیات کے میدان میں مروت و محبت کے اصول و آئین کا لحاظ نہیں رکھتا تھا۔

برہان کی مدد کے لیے احمد نگر پر حملہ۔	احمد نگر پر جو گذشتہ حملہ ہوا تھا وہ میراں حسین کے مارے جانیکے بعد ہوا تھا، اس حملہ کا جو کچھ حشر ہوا اور جس طرح مالا بار کی مہم کی الجھن نے اسے پورا کامیاب نہ بنایا اسکی تفصیل

دیدی گئی، اور اس کے علاوہ بلبل خاں کو جو اندھا کیا گیا اس کا بھی ذکر ہو چکا اب ۹۹۸ھ م ۱۵۸۹ء میں پھر ایک ایسا موقع پیش آیا کہ بیجاپور نے احمد نگر کے معاملات میں دخل اندازی مناسب سمجھی، اور بتایا گیا ہے کہ جمال خاں مہدوی، اسمٰعیل کو بادشاہ تسلیم کر کے احمد نگر میں حکومت کر رہا تھا، اسمٰعیل برہان کا بیٹا تھا اور برہان اس وقت اکبر کے دربار میں پناہ گزیں تھا، وہ اپنے بھائی مرتضیٰ نظام شاہ کے عہد میں احمد نگر سے فرار ہو کر بیجاپور آیا تھا، علی عادل شاہ کا زمانہ تھا، یہاں چند روز قیام کر کے وہ آگرہ چلا گیا اور

اکبر کے سلسلہ ملازمت میں داخل ہو گیا، اکبر نے اسے ایک جاگیر دے دی تھی اور مدد کا بھی وعدہ کیا تھا مگر اب تک اس کو کوئی ایسا موقع نہیں ملا۔ مرتضیٰ نظام شاہ کے مرنے کے بعد احمد نگر میں جو طوائف الملوکی جاری رہی، اس سے برہان کے کچھ حوصلے بڑھ گئے، اور وہ اپنی موروثی سلطنت کے حاصل کرنے کے خواب دیکھنے لگا جب اسے معلوم ہوا کہ جمال خاں مہدوی اسی کے بیٹے اسمٰعیل کو بادشاہ تسلیم کر کے حکومت کر رہا ہے تو اس نے ارادہ کر لیا کہ دکن آ کر کچھ قسمت آزمائی کرے، اکبر نے مدد دینی چاہی مگر برہان نے مدد لینے سے انکار کیا، اور کہا کہ اگر وہ اکبر سے مدد لیگا تو پورا دکن اس کا مخالف ہو جائے گا، اور اس وقت تخت حاصل کرنے کی جو کچھ امید ہے وہ بھی جاتی رہے گی لیکن اکبر کے حکم سے راجہ علی خاں نے مدد کا وعدہ کیا، برہان کی پہلی کوشش ناکام رہی، اس کے بعد راجہ علی خاں کی رائے[1] سے اس نے بیجاپور سے مدد طلب کی اور ایک خط محمد قاسم فرشتہ کو لکھا (جو کچھ دنوں سے بیجاپور آ گیا تھا اور ابراہیم عادل شاہ کی ملازمت میں داخل ہو گیا تھا) محمد قاسم فرشتہ نے یہ خط دلاور خاں کے روبرو پیش کیا، دلاور خاں نے بھی مدد دینے کا عزم کیا،[2] اس سے دلاور خاں کے دو تین مفاسد تھے، سب سے پہلے یہ کہ ایک بڑی سلطنت میں دخل اندازی کر کے کچھ فائدہ اٹھائے، مثلاً کچھ علاقے مل جائیں یا کچھ قلعے حاصل ہو جائیں اس کے علاوہ اگر کوشش کامیاب رہی تو برہان نظام شاہ بادشاہ ہونے کے بعد اس کا ممنون احسان ہو جائے گا، ایک ریاست اور ایک بادشاہ کو مفت میں ممنون بنا لینا کوئی بری بات نہ تھی نیز اس کا مقصد کچھ ذاتی استحکام بھی تھا، یہ بات محتاج تشریح نہیں کہ جنگ اور حملہ کے وقت حاکم اعلیٰ کے اختیارات میں غیر معمولی وسعت ہو جاتی ہے خواہ وہ حاکم اعلیٰ بادشاہ ہو یا وزیر سلطنت یا کوئی اور عہدہ دار، فوج براہ راست ماتحت اور تیار رہتی ہے، قانون اور آئین ایک حد تک معطل ہو جاتے ہیں اور صرف قانون جنگ پر عمل ہوتا ہے۔ غرض جنگ حکومت کرنیوالے کے لیے توسیع اختیارات کا باعث ہوتی ہے، دلاور خاں تو اپنے اختیارات اور قوت کو بڑھانے پر تلا ہوا ہی تھا، اگر جنگ ہو تو وہ سپہ سالار رہے گا، بادشاہ اسکے

---

[1] تاریخ فرشتہ۔

[2] " "

تحت رہ سکتا ہے، اور دیگر ایسے انتظامات کئے جاسکتے ہیں جو معمولی حالات میں ممکن نہیں، پھر مزید یہ کہ اگر کامیابی ہوئی تو قدر و منزلت بڑھ جاتی ہے اور ملک پر اس کی عظمت و جلال کا سکہ بیٹھ جاتا ہے۔

دلاور خاں نے ابراہیم سے بھی رسمی طور پر اس حملہ کی اجازت لے لی، اور فوجوں کی تیاریوں میں مشغول ہوگیا، دو تین روز کے بعد ۹۹۰ھ مطابق ۱۵۸۲ء میں دلاور خاں نے ایک زبردست فوج کے ساتھ بادشاہ کے ہمرکاب احمد نگر کی سرحد کا رُخ کیا۔ ادھر برہان راجہ علی خاں والی خاندیس کی مدد حاصل کر کے اُمرائے برار کی تالیف قلوب میں مصروف تھا اور عنقریب حملہ کرنا چاہتا تھا، تدبیر یہ تھی کہ دونوں طرف سے حملہ کر کے جمال خاں کو پیس دیا جائے۔ غرض بیجاپوری فوج نے شاہ درگ کا رُخ کیا، جمال خاں کو جب یہ معلوم اس نے ارادہ کیا کہ برہان اور راجہ علی خاں کے روکنے کے لیے برار کی طرف توجہ کرے اور برہان نے دلاور خاں کو یہ کہلا بھیجا کہ اگر بیجاپوری افواج شاہ درگ سے اور آگے بڑھ آئیں تو جمال خاں پہلے برار کی طرف رُخ کرنے کی ہمت نہ کرے گا، اس سے مزید فائدہ یہ ہوگا کہ وہ اُمرائے برار جو جمال خاں کی قربت کی وجہ سے خائف ہیں، اور حلیفوں کا ساتھ دینے میں تساہل کر رہے ہیں اس وقت مل جائیں گے، جب جمال خاں بیجاپوری افواج کے مقابلہ کو آگے نکل جائے گا اس پر دلاور خاں شاہ درگ سے فوجیں بڑھا کر دھاریوں کی طرف لے چلا۔

جس وقت شاہی فوج شاہ درگ پہنچی بادشاہ کو یہ مقام اور یہاں کی آب و ہوا بہت پسند آئی اس لیے یہاں کچھ قیام کیا، اسی قیام کے عرصہ میں دلاور خاں نے ایک سیاسی اور شاطرانہ چال چلی جس سے اس کا مقصد اپنا ذاتی استحکام تھا، پہلے اشارہ کیا گیا ہے کہ اس حملہ سے منجملہ اور مقاصد کے دلاور خاں کا ایک یہ بھی مقصد تھا کہ اپنی قوت اور طاقت میں اضافہ کرے، اس کی تصدیق حسب ذیل واقعہ سے ہوتی ہے، اور یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ عین اس وقت جبکہ وہ خارجی معاملات میں اُلجھا ہوا تھا اندرونی طور پر وہ اپنے ذاتی استحکام کی تدبیر سے بے خبر نہ تھا، بلکہ خود ان واقعات کو اپنے استحکام کا ممد و معاون بنانا چاہتا تھا۔

جب بادشاہ اور دلاور خاں اپنی فوجوں سمیت بغرض جنگ شاہ درگ روانہ ہوئے ہیں تو

بیجاپور کی حکومت قدرتاً رومی خاں کے ہاتھ میں آگئی تھی جو بیجاپور کا قلعہ دار تھا (اس کا ابراہیم سے کچھ دودھ کا رشتہ تھا) دلاور خاں کو یہ منظور نہ تھا کہ رومی خاں بیجاپور کا قلعہ دار رہے، کیونکہ وہ اس کا ہواخواہ نہ تھا، اس کی مرضی تھی کہ قلعہ پر قابو رکھنے کے لیے کوئی ایسا آدمی ہو جس پر اعتماد کر سکے، اس لیے وہ رومی خاں کو نکال کر اپنے کسی عزیز یا ہواخواہ کو قلعہ دار بنانا چاہتا تھا، اور موقع کی تاک میں تھا چنانچہ جب بادشاہ مع فوج کے شاہ درگ آگیا تو اس نے رومی خاں کو نکالنے کے لیے یہ تدبیر کی کہ یکایک شہر میں چوروں اور ڈاکوؤں نے سر اٹھایا اور دن رات چوریاں ہونے لگیں، شہریوں کی جان تک کی خیر نہ رہی اور ملک کے امن و امان میں خلل پڑ گیا، رومی خاں پریشان ہو گیا، اس نے ہزار انتظام کئے مگر قزاقوں کی دلیری بڑھتی ہی گئی اور شہر میں مار پیٹ، لوٹ کھسوٹ روز آنہ کا ایک معمولی مظاہرہ بن گئی (دراصل یہ چوروں کی شرارتیں، رومی خاں کو ہٹانے اور بدنام کرنے کے لیے دلاور خاں کی جدت طرازی کا نتیجہ تھیں، اسی نے چند لٹیروں کو جمع کر کے سکھایا، پڑھایا تھا جس کی وجہ سے شہر میں یہ ہلڑ ہو گئی)۔

جب یہ لوٹ اور غارتگری ملک میں عام ہو گئی تو چاروں طرف سے بادشاہ کے حضور میں عرضیاں گذرائی گئیں اور بے شمار شکایتیں ملک کے انتظام کے متعلق بظاہر دلاور خاں تک بھی پہنچیں، دلاور خاں نے جب صورت حال کو دیکھا تو نہایت معصومانہ انداز میں بادشاہ سے اس امر کی اجازت چاہی کہ رومی خاں کو ہٹا کر اس کی جگہ کسی دوسرے قابل تر اور بہتر آدمی کو متعین کر دے تاکہ وہ چوری اور ڈکیتی کا انسداد کر سکے اور ملک میں امن و امان پیدا ہو جائے، چونکہ رومی خاں سے بادشاہ کو اک خاص قسم کی وابستگی تھی اور دودھ کا رشتہ بھی تھا اور اسے چاہتا بھی تھا اس لیے بادشاہ نے دلاور خاں کی تدبیر کا ساتھ نہ دیا اور صاف کہہ دیا کہ رومی خاں ایک نہایت وفادار، نمک حلال اور جاں نثار آدمی ہے اس کو اس منصب سے علحدہ کرنا سراسر ظلم ہوگا، وراس کے علاوہ وہ کچھ نااہل بھی نہیں، مگر نہ معلوم کیا وجہ ہوئی کہ اس مرتبہ اس کے انتظام کے متعلق اتنی شکایات وصول ہوئیں وہ ہمارے خانہ زادوں میں سے ہے، ہم جب تک مہم پر رہیں، اس کو اسی منصب پر بحال رکھیں گے، البتہ اسے یہاں سے تاکید کر دی جائے کہ وہ ملک کے انتظام سے بے خبر نہ رہے اور ان دلیر اور جیوٹ ڈاکوؤں کا اچھی طرح انتظام کر دے۔ بادشاہ کے اس جواب سے

دلاور خاں کی آرزوں پر اوس سی پڑگئی اور اس کی تمام شاطرانہ چالیں صرف ایک "نہیں" سے رد ہوگئیں۔ یہ یاد رکھنا چاہیئے کہ ابراہیم اب سن شعور کو پہنچ چکا تھا اور اچھے برے کو سمجھنے لگا تھا۔ وہ تاڑ گیا تھا کہ دلاور خاں بہت حوصلہ مند ہے اور خود اس کو ایک عضو معطل بنا کر آپ حکومت کرنا چاہتا ہے، وہ دل میں سمجھا ہوا تھا کہ حکومت اور سلطنت اس کی اپنی آبائی ہے نہ کہ دلاور خاں اور اس کے آباو اجداد کی' اس لیے شاہانہ ہمت روز بروز اس میں پیدا ہوتی جارہی تھی۔ تاریخوں کے مطالعہ سے یہ واضح ہوتا ہے کہ ابراہیم کے سن شعور کو پہنچنے کے بعد یہ بالکل پہلا موقع تھا کہ اس نے ریجنٹ کی صلاح کو ایک طرف رکھ کر اپنے احکام نافذ کئے اور دلاور خاں کو مجبور کیا کہ وہ اس کے حکم پر عمل کرے' ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بادشاہ نے اب عزم کر لیا تھا کہ یا تو حکومت دلاور خاں ہی کرے یا وہ خود' اسی بنا پر دلاور خاں کو اس نے انتظام میں کوئی دخل نہ دینے دیا' دلاور خاں بلا کا ہوشیار اور فریس تھا' وہ کب یہ ظاہر کرتا کہ بادشاہ کے اس حکم سے اس کی امیدوں پر پانی پھر گیا یا رومی خاں کو ہٹانے میں بجز انتظام مملکت کے اس کی کوئی خاص ذاتی دلچسپی تھی' بلکہ اس نے یہی ظاہر کیا کہ ایک ذمہ دار وزیر کی طرح اس نے صلاح دی تھی' اب بادشاہ کی مرضی کہ اسے قبول کرے یا نہ کرے۔

جب یہ وار خالی گیا تو دلاور خاں پست ہمت اور کمزور نہیں ہو گیا بلکہ پہلے سے بھی زیادہ قوت کے ساتھ دوسرے داؤں پیچ چلنے لگا کہ کم از کم ان کے ذریعہ اپنے حریف کو مغلوب کرلے۔

دلاور خاں کی اک زمانے سے خواہش تھی کہ بادشاہ کو اس کی والدہ سے علٰحدہ کر دیا جائے کیونکہ یہ عورت بہت فریس اور دانا تھی' بادشاہ کو وقت بے وقت اپنے بہترین مشوروں سے مستفید کرتی تھی اور اس ڈھنگ پر نے چلتی تھی کہ وہ پوری طرح ریجنٹ کے قبضہ میں نہیں رہتا تھا اس کا خیال تھا کہ اس ہشیار عورت کی علٰحدگی سے بادشاہ پر اس کا قابو بڑھ جائے گا اور وہ من مانے حکومت کرسکے گا' یہ وہ تدبیر تھی جو اس سے پہلے بھی اکثر متولیان سلطنت اختیار کر چکے تھے' چنانچہ کامل خاں نے چاند بی بی کی طاقت اور قوت کو رفتہ رفتہ کم کر کے اسے حکومت کے معاملات سے بالکل بے دخل کر دیا تھا' اور کشور خاں نے اسے قید کر کے "ستارہ" روانہ کر دیا تھا' اس زمانے میں چاند بی بی تو تھی نہیں کہ اس کے خلاف کوئی کارروائی کی جاسکے اور دلاور خاں نے ابراہیم کی والدہ کو پھر ابراہیم سے الگ کرنے کی کوشش کی' اس کا مقصد یہی تھا کہ بادشاہ کو جس کی وجہ سے قوت حاصل ہے جس کی فراست کی

بدولت وہ اس کے واروں کو خالی دیتا ہے، اسی کو ہٹا دیا جائے۔ یہ فکر تو اس کو روز اول ہی سے تھی مگر جب رومی خاں والا معاملہ پیش آیا تو دلاور خاں نے سمجھا کہ ہو نہ ہو بادشاہ نے اپنی والدہ کی رائے اور مشورہ پر ہی عمل کیا ورنہ کیسن اور کم عمر لڑکا اتنی گہری چال کیا جانے۔ وہ کھلم کھلا شاہی خاندان کی اتنی ذی وقار عورت کو قید بھی نہ کرسکتا تھا، اور کشور خاں سا بیوقوف بھی نہ تھا کہ اپنی بیباکانہ حرکت سے ایسی بدنامی کا ٹیکہ اپنے سر لے کہ سر بازار لوگ گالیاں دیں اور صلواتیں سنائیں، اس کے نام پر لاحول بھیجیں اور اس پر ابلیس کی طرح لعنت کریں، لہذا یہاں اس نے ایک زبردست چال چلی۔ یہ تو بتلا دیا گیا ہے کہ آب وہوا کے خوش آنے سے بادشاہ فوجوں سمیت اس وقت شاہ درگ میں ٹھیرا ہوا تھا، اب تھوڑے اور قیام کے بعد صلاح تھی کہ غنیم کے مقابلے کے لیے آگے بڑھیں، بادشاہ کے ساتھ اس کی والدہ بھی موجود تھی، بادشاہ کو کمزور کرنے کے لیے دلاور خاں اس کی والدہ کو یہیں چھوڑ کر آگے بڑھنا چاہتا تھا، اسی غرض سے اس نے اپنے زنانے کو بھی بیجاپور سے بلوا لیا۔ جب کوچ کا وقت آیا والدہ ابراہیم سے درخواست کی کہ اب فوجیں غنیم کے لیے جا رہی ہیں شکست و فتح نصیبوں سے ہوتی ہے، میدان جنگ کا اپنے ہاتھ رہنا محض خدا کی دین اور عنایت ہے ورنہ کسے یقین کہ کون جیتے اور کون ہارے، کون جیئے اور کون مرے، مارنے مرنے کے لیے تو جاتے ہیں ایسی صورت میں شاہی محل بھی ساتھ ہو تو پریشانیاں بڑھ جاتی ہیں، اس کی حفاظت کے لیے وقت، فوج، روپیہ سب ہی لگتا ہے، اور پھر وہ اطمینان قلب بھی حاصل نہیں رہتا جو حرم محترم کے شہر میں محفوظ رہنے سے ہوتا ہے، لہذا مناسب یہی ہے کہ سرکار یہیں آرام فرمائیں اور ہم مردانہ وار میدان میں نکل کر دشمن کو مار بھگا آتے ہیں، والدہ ابراہیم کو یوں بھی اپنے بادشاہ بیٹے سے بڑی محبت تھی، اس سے قطع نظر وہ متولیان ریاست کے رنگ ڈھنگ دیکھ چکی تھی، اور پھر دلاور خاں کے گرگٹ والے رنگوں سے تو خوب واقف تھی، بھلا وہ اس قصاب کو کیوں پنپانے چلی، نہایت مستعدی سے کہا کہ جب میرا لڑکا میدان جنگ میں جا رہا ہے، جب اس کی لاکھوں کی جان خطرے میں ہے تو مجھ بڑھیا کی زندگی اور موت کیا اہمیت رکھتی ہے، میں ہر حال میں اپنے بیٹے کے ساتھ رہوں گی اور جو کچھ اس پر پڑے گی میں سہونگی۔ دلاور خاں اپنا سا منھ لیکر رہ گیا، سوائے اس کے کچھ بن نہ پڑا کہ شاہی مستعدی کی تعریف کرے اور حکم بجا لائے غرض یہ ملی ہی دلمیں

گو وہ کراس پر راضی ہو گیا اور مجبوراً اپنے زنانے کو یہیں چھوڑ کر کوچ کی تیاریاں کرنے لگا۔

احمد نگری افواج سے مقابلہ[1] پہلے فتح اور اسکے بعد شکست

جب جمال خاں کو اطلاع ہوئی کہ برہان دکن میں آگیا ہے اور راجہ علی خاں اس کی مدد کے لیے تیار ہے، اُمرائے برار جن میں اکثر شیعہ اور غیر ملکی ہیں، دکھنی سرگروہ پر دانت پیس رہے ہیں، اور جوق جوق اس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو رہے ہیں، اور دلاور خاں بھی برہان کی حمایت پر فوجیں لیکر شاہ درگ آگیا ہے تو وہ پریشان ہوا کہ چاروں طرف سے نرغے میں گھر گیا ہے مگر چونکہ نہایت بہادر اور دلیر تھا اس لیے ہمت نہ ہاری بلکہ مردانہ وار مقابلہ کرنے اور جان دینے کے لیے تیار ہو گیا (حقیقت یہ ہے کہ جس بہادری سے لڑ کر اس نے جان دی ہے اور آخر وقت تک کوشش کئے گیا ہے اس پر بے اختیارانہ زبان سے تعریف کے جملے نکل جاتے ہیں مختصر یہ کہ اس نے افغانی بہادری کے جوہر دکھا دئیے، اس سے بحث نہیں کہ وہ کس قدر حق بجانب تھا مگر جو کچھ بھی اس نے اپنا مقصد اور نصب العین بنا لیا تھا خواہ وہ غلط ہو کہ صحیح اس کی حمایت میں اس نے ذرا بھی کوتاہی نہیں کی اور مقدور بھر کوشش کرتا رہا حقیقی عظمت دراصل اسی کا نام ہے کہ انسان اپنا جو نصب العین بنا لے اس پر آخر وقت تک کاربند رہے، خواہ اس میں کامیابی ہو کہ ناکامی) اور اپنی فوجوں کو آراستہ کر کے احمد نگر سے نکلا، اس وقت بیجاپوری لشکر اس سے بہت قریب تھا، اور اسی کے حملہ سے وہ ذرا خوفزدہ بھی تھا۔ لہذا پہلے اس نے اسی طرف توجہ کی، جب دونوں لشکر بالکل قریب ہو گئے تو موزوں اور مناسب موقعوں کو منتخب کر کے پڑاو کیا، اور لڑائی کی تیاریاں ہونے لگیں، دلاور خاں کی طرح جمال خاں اپنے ساتھ جنگ میں اپنے بادشاہ اسمٰعیل کو لایا تھا، چند روز تک تو یہ فوجیں ایک دوسرے کے مقابل پڑی رہیں اور آئے دن کچھ نہ کچھ جھڑپ ہو جاتی تھی مگر ابھی تک جنگ باقاعدہ طور پر شروع نہ ہوئی تھی، غالباً کچھ موسم ناموافق تھا یا یہ کہ ایک فریق دوسرے فریق کی حرکتوں کا بغور مطالعہ کر رہا تھا کہ جہاں ذرا سی غفلت ہو قابو پالے، آخر کار باقاعدہ طور پر جنگ شروع ہو گئی، خوب کشت و خون ہوا، ابھی کوئی قطعی فیصلہ نہ ہونے

---

[1] یہ تفصیل بساتین اور تحفۃ الملوک سے لی گئی ہے۔

پایا کہ رات ہوگئی، رات بھی اندھیری گھپ، لہذا دونوں فوجوں نے مناسب سمجھا کہ رات کی رات جنگ موقوف کرکے کل صبحدم طبل جنگ بجاکر میدان میں کود پڑیں، دوسرے دن صبح صبح میدان کارزار گرم ہوا، دونوں فوجیں ایک دوسرے سے بھڑ گئیں، جمال خاں نے اس جنگ میں اپنی دانائی اور خصوصیات کا زبردست اظہار کیا۔ ایک پختہ کار اور آزمودہ کار جرنیل کی طرح اس نے اس بیوقوفی کو اپنے نزدیک نہ آنے دیا کہ ایک ہی مرتبہ اپنی پوری فوج کو میدان میں اُلجھا دیا جائے، اور اگر اتفاق سے میدان ہاتھ سے جاتا رہے تو سوائے سرپہ پاؤں رکھکر بھاگنے کے چارہ ہی نہ رہے۔ وہ ایک بہترین سپاہ کے دستے کے ساتھ اپنی اصلی فوج سے علیحدہ ہوگیا اور بادشاہ کو لیکر ایک موقع کی جگہ تلاش کرلی اور اسی میں چھپکر بیٹھ رہا، ادھر جنگ شروع ہوئی، دلاور خاں نے اپنی پوری فوج کو بیک وقت میدان میں مشغول کردیا، اس کارروائی کا نتیجہ یہ ہوا کہ عادل شاہی افواج کامیاب و منصور میدان سے واپس ہوئیں، جب غنیم پران کو غلبہ حاصل ہوا اور نظام شاہی فوج کے قدم میدان سے اکھڑ گئے تو یہ اپنی ساری جنگی تنظیم و ترتیب کو بالائے طاق رکھکر نہایت ناعاقبت اندیشانہ طور پر شکست خوردہ فوج پر ٹوٹ پڑی، نظام شاہی فوج تاب مقاومت نہ لاکر میدان سے بھاگ نکلی، اور اس کے ساتھ ہی عادل شاہی فوج لوٹ مار کی فکر میں چاروں طرف پھیل گئی، مال غنیمت کی تلاش روپیہ اور دولت کے لالچ میں فوج کا بیشتر حصہ دور دور تک نکل گیا، یہ فتحیاب فوج اس بدنظمی کے ساتھ تتر بتر ہوئی کہ شکست خوردہ فوج بھی نہ ہوئی ہوگی۔ نیز عادل شاہی فوج کا ایک بہترین دستہ جو نہایت بہادر، دلیر اور آزمودہ کار (۸۰۰) ہندوؤں پر مشتمل تھا جنکی بدولت فتح حاصل ہوئی تھی، اسی مال غنیمت کی دُھن میں میدان سے نکل کھڑا ہوا۔ جمال خاں ان سب حالات کا اپنی کمین گاہ سے مطالعہ کررہا تھا، اور موقع کا طالب تھا جب میدان بالکل صاف نظر آیا اور دلاور خاں کے پاس معدودے چند سپاہی رہ گئے تو یہ اپنی کمین گاہ سے نکلا۔ ابھی راستہ ہی میں تھا کہ عین الملک اور آنکس خاں سے اس کا مقابلہ ہوگیا عین الملک اور آنکس خاں ابتدا ہی سے دلاور خاں سے ناراض تھے (اس لیے کہ جب دلاور خاں کی طاقت میں بیحد اضافہ ہوگیا اور ہر طرح وہ ریاست پر چھا گیا تو اس کے دشمن بن گئے) اس وقت شاہی فرمان کی تعمیل اور محض رسمی طور پر یہ اپنی فوجیں لیکر میدان میں

آئے تو تھے، لیکن جب جنگ شروع ہوئی تو اپنے کو علیحدہ ہی رکھا اور ایک طرف کو ہٹ گئے، لڑائی میں قطعاً حصہ نہ لیا۔ بھلا ان کو کیا غرض پڑی تھی کہ جانفشانی سے لڑیں، خون بہائیں اور نام دلاور خاں کا ہو جو ان کا رقیب، دشمن اور حریف تھا۔ ممکن ہے کہ انھی آپس کے جھگڑوں کی بنا پر دلاور خاں کو شکست دلانے کے لیے انھوں نے جنگ میں حصہ نہ لیا ہو مگر جب بادشاہ کی اقبالمندی سے بیجاپوری افواج کو فتح حاصل ہوئی تو یہ ابراہیم کو اس کی اپنی کامیابی پر مبارکباد دینے کے لیے اپنے اپنے مقام سے نکلکر خراماں خراماں چلے جا رہے تھے کہ اتفاقاً ایک بلائے ناگہانی کی طرح جمال خاں سے مڈبھیڑ ہو گئی۔ دونوں فوجوں کی حالت میں بڑا فرق تھا ایک تو اپنی ہزیمت سے غضبناک اور انتقامی جوش میں چور دشمن کو تباہ و برباد کرنے اور اپنی جان تک دینے کے لیے کمین گاہ سے نکلی تھی اور دوسری محض شادمانی اور کامیابی سے مسرور، خنداں و فرحاں، جشن منانے کے لیے لاپرواہی سے انجان آگے بڑھ رہی تھی، لہذا اس مڈبھیڑ کا نتیجہ یہ ہوا کہ عین الملک اور آنکس خاں جمال خاں کے حملے کی تاب نہ لاسکے اور دیوانہ وار جس طرف منھ اُٹھا بھاگ نکلے، جمال خاں کو اس کامیابی سے بڑی خوشی ہوئی، اس کی کھوئی ہوئی دولت ہاتھ آگئی اور اُجڑی ہوئی امیدیں تازہ ہو گئیں، شاہی فوج کا یہ حصہ بڑی بدحواسی سے اپنی جانیں مٹھی میں لیکر بھاگا تھا، اس سراسیمگی میں ساز و سامان کی کس کو فکر تھی، جمال خانیوں نے اس خداداد مال غنیمت سے خوب فائدہ اٹھایا، تقریباً پچاس ساٹھ ہاتھی اور کئی گھوڑے نظام شاہیوں کے حصے میں آئے، ان کی ہمت بندھ گئی اور حوصلے بڑھ گئے، گو جمال خاں کو اس لڑائی میں کامیابی ہوئی مگر یہ معرکہ کچھ اس کی فوج کی بہادری سے سر نہیں ہوا تھا بلکہ کہنا چاہیئے کہ محض اتفاقی تھا اور قسمت نے ساتھ دیا، البتہ حیلہ جنگ کو اس میں بہت دخل ہے۔ دلاور خاں کو جب اس اچانک حادثہ کی خبر لگی تو اس نے اپنی آس پاس نظر دوڑائی، دیکھا تو یہ دیکھا کہ جمال خاں ایک سیلاب کی طرح اُمڈا چلا آ رہا ہے اور یہاں بے سر و سامانی کا یہ عالم کہ مدافعت تک ممکن نہیں، ساری فوج دور دور بکھری ہوئی تھی، اب اسکو مجتمع کرنا اور منظم کرنا کچھ کھیل نہ تھا، جو کچھ باقی ہے وہ جمال خاں کی گرد کو نہیں پہنچتی، ایسی حالت میں لڑنا عین حماقت تھی اور زبردستی دشمن کے ہاتھ میں پھنسنا تھا، دلاور خاں اگر لڑتا تو شکست یقینی کھاتا اور خود یا تو مارا جاتا یا قید ہو جاتا، نیز بہت ممکن تھا کہ بادشاہ پر بھی کوئی

آفت آجاتی، اس وقت اس نے بہت حاضر دماغی سے کام لیا، فوراً باقیماندہ سپاہیوں کو لیکر بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور تمام حال کہہ سنایا، اور صلاح دی کہ اب یہاں ٹھیرنا غلطی ہے جتنا جلد ممکن ہو کوچ کرنا چاہیئے، بادشاہ بھی راضی ہو گیا۔ دلاور خاں انتہائی سرعت اور تیزی کے ساتھ ابراہیم کو لیکر میدان جنگ سے گھوڑے اڑاتا ہوا نکل گیا، تھوڑی دور تک تو نظام شاہیوں نے پیچھا کیا مگر اسکے بعد ہمت نہ پڑی اور بے سود سمجھ کر تعاقب چھوڑ دیا۔ تمام رات اس تاریکی میں کہ منھ کو منھ دکھائی نہ دیتا تھا شاہی فوج پہاڑی علاقوں میں فرار ہونے پر مجبور تھی۔ اٹھارہ فرسخ طے کرنے کے بعد دوسرے دن بارہ بجے شاہ درگ پہنچے اور بادشاہ کو آرام کرنے کا موقع ملا۔ اگرچہ زیادہ سامان دشمن کے ہاتھ نہ لگا تھا، مگر اس کوہستانی علاقے میں راتوں رات بھاگنے سے اور راستے کی ناہمواریوں سے مال و اسباب کو خاصہ نقصان پہنچا، اس طریقہ سے یہ جنگ ختم ہوئی، اور فی الحال جمال خاں ہی کامیاب رہا۔ دلاور خاں کی یہ شکست دراصل اتفاقی تھی، اس سے دلاور خاں کی بہادری اور جرنیلانہ خصوصیات پر کچھ اثر نہیں پڑتا جمال خاں کی تدبیر درحقیقت نہایت غیر متوقع تھی اور ایسے اتفاقی واقعات سے بعض وقت بہتر سے بہتر جرنیل بھی مغلوب ہو جاتے ہیں، یہ کہا جاتا ہے کہ دلاور خاں کو ذرا ہشیاری اور دانائی سے کام لینا چاہیئے تھا، اور دشمن کو حقیر جاننا ایک اچھے جرنیل کے خصوصیات سے بعید ہے، اس نے یقیناً بہت بے پروائی کی جس کی وجہ شاید یہ ہو کہ اسے اپنی کامیابی کا پورا یقین تھا، بالخصوص ان حالات کے مد نظر جو اس سے پہلے یا ابھی ابھی احمد نگر کی ریاست میں رونما ہو چکے تھے۔ اس جنگ کی تفصیلات فرشتہ بالکل دوسرے طریقہ سے دیتا ہے اور اکثر جگہ ان دونوں بیانات میں اختلاف نظر آتا ہے۔ چونکہ یہ اختلاف اہم بھی ہے اور دلچسپ بھی اس لیے فرشتہ کی تفصیلات کو من وعن درج کیا جاتا ہے۔

احمد نگری افواج سے مقابلہ شاہ درگ میں دلاور خاں نے اپنے ذاتی استحکام کے لیے جو تدبیریں کیں ان کے ناکام رہنے کے بعد وہ دھاراسیوں روانہ ہوا کیونکہ برہان کی جانب سے اس امر کی خواہش کی گئی تھی کہ برار کے اُمرا جو جمال خاں سے خائف ہیں، اس کے دوسری طرف متوجہ ہو جانے سے برہان سے مل جائیں گے جمال خاں نے بھی یہ دیکھا کہ بیجاپوری افواج یہاں تک بڑھ آئی ہیں تو وہ برار کا قصد ترک کر کے

ان کے مقابلے کو نکلا، پہلے اس نے سید امجد الملک مہدوی کو جو سر لشکر برار تھا لکھا کہ وہ برہان اور
راجہ علی خاں کے حملوں کو روکے اور ممکن ہو تو برار کے اُمراء کو کسی صورت سے بھی ان حملہ آوروں سے ملحق نہ ہونے
دے، اور ادھر خود دلاور خاں کے مقابلہ کی تیاریوں میں مصروف ہوگیا۔ جمال خاں کا خیال تھا کہ کسی طرح
ابراہیم اور دلاور خاں سے صلح کرے جیسا کہ اس نے پہلے کی تھی، اور جب یہ خطرہ نکل جائے تو پھر برہان اور راجہ علی خاں کا
ایک ہی حملہ میں کام تمام کردے جمال خاں کو سب سے بڑا خوف بیجاپور کی جانب سے تھا، اس پر جب وہ دونوں
طرف سے گھر گیا تو بہت پریشان ہوا، وہ کسی طرح بیجاپور کی بلا ٹالنا چاہتا تھا، مگر جمال خاں کے خلاف خود
اس کی قسمت تھی، چنانچہ اس نے دھاماسیون پہنچتے ہی سب سے پہلے صلح کی گفت وشنید شروع کردی، اپنے
سفیروں کو روانہ کیا، چاپلوسی کی، اور بہت کچھ دینے دلانے کا وعدہ بھی کیا، لیکن دلاور خاں نے ایک
نہ سُنی یہ پہلی دفعہ جب اس نے جمال خاں کے مقابلہ میں مُنہ موڑا تھا تو اسے بہت گراں گذرا تھا، اور
بلبل خاں کی سُستی پر اپنی ناکامی کو محمول کرکے اس غریب کی آنکھیں نکلوادی تھیں، اب اس کو ہرگز ہرگز صلح
منظور نہ تھی۔ جمال خاں کی موجودگی سے اس کا کچھ فائدہ نہیں ہوسکتا تھا، البتہ برہان اگر تخت نشین
ہوجائے تو احمد نگر کی ریاست اس کی ممنون ہوجاتی، اسی بنا پر اس نے صلح سے قطعاً انکار کیا، ادھر دلاور خاں کو
یہ دھوکہ ہوا کہ اس کا حریف اور مد مقابل کمزور ہوگیا ہے اور لڑنے کی ہمت نہیں رکھتا، اسی اثنا میں
بعض ایسے واقعات پیش آئے کہ جس سے دلاور خاں مزید دھوکہ میں پڑ گیا، سب سے پہلے تو یہ کہ نظام شاہی
فوج کا ایک حبشی سردار آہنگ خاں، جمال خاں کی کسی بات پر ناراض ہوکر دلاور خاں کے لشکر سے
آملا جس سے جمال خاں کی قوت کو کاری ضرب لگی۔ جب جمال خاں نے دیکھا کہ صلح کی کوشش میں وقت
گذرتا جارہا ہے اور فوج اس سے بددل ہوکر ساتھ چھوڑ رہی ہے تو اس نے لڑائی کا عزم مصمم کرلیا،
اور اپنی جگہ چھوڑ ایک بہتر مضبوط اور اونچے مقام پر کیمپ ڈال دیا تاکہ دشمن پر قابو رہ سکے۔ دلاور خاں
کے جاسوس اور خوشامدیوں نے جمال خاں کی اس حرکت کو یوں سمجھایا کہ وہ میدان سے فرار ہونا
چاہتا ہے، اور نانک دوں کے جنگل کی راہ اختیار کرنے کی فکر میں ہے۔ ان خبروں سے دلاور خاں کو
جمال خاں کی کمزوری کا یقین واثق ہوگیا۔ لہٰذا فوراً تیس ہزار کی فوج کے ساتھ بلا سوچے سمجھے اور

ابراہیم سے بغیر اجازت لیے وہ روانہ ہوگیا تاکہ دو چار ہاتھ مار کر جمال خاں کو گرفتار کر لے۔ یہاں اس نے بڑی بیوقوفی کی، جب وہ دشمن کے لشکر سے دو تین کروہ کے فاصلہ پر آگیا تو اسے یہ تک معلوم نہ تھا کہ یہ سامنے والی فوج جمال خاں کی ہے یا ابراہیم کی، جس سے کچھ عرصہ پہلے وہ جدا ہوچکا تھا۔ اتنے میں جاسوسوں نے یہ تحقیقی خبر پہنچائی کہ جمال خاں مقابلہ کے لیے تیار اپنی فوجیں لیے ہوئے پڑا ہے۔ یہ سنتے ہی دلاور خاں کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، اس کو خیال نہ تھا کہ جمال خاں لڑنے کے لیے تیار ہوگا۔ دلاور خاں کی فوج بے ترتیب ہوگئی تھی، سپاہی تھکے ہوئے تھے۔ راستہ کے نشیب و فراز اور وادیوں اور گھاٹیوں کی ناہمواریوں نے اس کے لشکر کو پریشان کر دیا تھا، صورت حال ایسی نہ تھی کہ دلاور خاں جمال خاں سے لڑتا، لیکن اب واپس ہونا بھی باعث ننگ تھا، اس سے اس کی بزدلی اور نامردی ظاہر ہوتی، وہ عجیب کشمکش میں تھا کہ اسی اثنا میں بادشاہ کی طرف سے کچھ سواروں نے آکر کہا کہ ابراہیم کی مرضی آج جنگ موقوف رکھنے کی ہے کیونکہ سپاہ بہت بدنظم ہو گئی ہوگی، اور ایسے میں لڑنا ہزیمت اٹھانا ہے، مگر دلاور خاں نے یہ لکھکر بھیجا کہ فدوی جمال خاں کو ابھی ہتکڑی اور بیڑی پہنا کر حاضر خدمت کرتا ہے اور دو ایک حملوں میں دشمن کو تباہ و تاراج کر دیتا ہے۔ غرض دلاور خاں نے جنگ کی تیاریاں شروع کر دیں، پانچ چھ ہزار امرائے برکی کو اپنی فوج سے علیحدہ کر کے اس کام پر مامور کیا کہ عقب سے دشمن کو تنگ کریں اور کسی کو راہ فرار اختیار کرنے نہ دیں، اور خود ۵ جمادی الاول کو میدان کارزار میں جم گیا، عالم خاں، آنکس خاں اور عین الملک یوں تو پہلے ہی سے دلاور خاں کے مخالف تھے، اب یہ دیکھ کر کہ شاہی احکام کے خلاف یہ آمادۂ جنگ ہے شکست کی صورت بنا کر میدان سے الگ ہوگئے اور سیدھے داراسنگ کی راہ لی کہ بادشاہ کے حضور میں حاضر ہوجائیں[1]۔ اس طرح دلاور خاں اکیلا رہ گیا، مگر باوجود اس کے نہایت بہادری سے مقابلہ کرتا رہا۔ اور ایسے زبردست حملے کئے کہ جمال خاں کی فوج تتر بتر ہوگئی۔ جب عادل شاہیوں کو کامیابی ہوئی تو فوج کا اکثر حصہ مال غنیمت کی تلاش میں ادھر ادھر نکل گیا اور میدان کی فکر کو چھوڑ کر اپنے کام میں مشغول ہوگئے، دلاور خاں صرف دو سو سپاہیوں کے ساتھ میدان میں رہ گیا۔

جمال خاں مع اپنے داماد خداوند خاں کے اسمٰعیل نظام شاہ کے ہمرکاب ایک بہترین فوجی دستہ

[1] "دولتیست" فرشتہ

لیے ہوئے کمین گاہ میں چھپکر بیٹھا تھا جب اس نے میدان کا یہ رنگ دیکھا اور دلاور خاں کو بھی تنہا پایا تو اپنی کمین گاہ سے نکلکر دلاور خاں پر ٹوٹ پڑا، دلاور خاں کو اس اچانک حملے کا گمان بھی نہ تھا وہ یہ سمجھا تھا کہ میں نے میدان مار لیا ہے، مگر جب یہ نئی آفت سر پر آئی تو پریشان ہو کر صرف سات آدمیوں کے ساتھ میدان سے بھاگ نکلا، کیونکہ اس وقت مقابلہ کرنا جان جوکھوں کا کام تھا، انھیں سات ساتھیوں میں ہمارا مورخ فرشتہ بھی تھا، راستہ میں دلاور خاں کو معلوم ہوا کہ عالم خاں آنکس خاں اور عین الملک پہلے ہی بادشاہ کے پاس چلے گئے ہیں، ان سے دلاور خاں کو خطرہ تھا، وہ جانتا تھا کہ یہ لوگ اس سے پہلے پہنچکر بہت کچھ زہر اُگلیں گے اس کی ہزیمت و نا فرمانی، اس کے غرور و تکبر کو بدترین رنگ اور پیرایہ میں پیش کرنے کی کوشش کیجائے گی اس لیے اس نے اپنی رفتار کو تیز کر کے ان لوگوں سے پہلے ہی تین ہزار سپاہ کے ساتھ داراسنگ پہنچا (راستہ میں اس کی ہزیمت خوردہ فوج اس سے ملحق ہو کر تین ہزار تک تعداد پہنچ گئی تھی) داراسنگ پہنچکر دلاور خاں نے اس خوف سے کہ کہیں جمال خاں تعاقب نہ کرے بادشاہ کو یہاں سے چلنے کی رائے دی، اس طرح بیجاپوری افواج اپنی تباہی کے بعد شاہ درگ روانہ ہوئیں جمال خاں کو اس غیر متوقع کامیابی سے بڑی خوشی ہوئی اور اس کی مردہ تمناؤں میں جان سی آگئی، اس نے داراسنگ تک مفرور فوج کا تعاقب کیا، لیکن جب یہ لوگ یہاں سے بھی بھاگ نکلے تو ان کا پیچھا چھوڑ برار کی طرف متوجہ ہوا، جہاں برہان اور راجہ علی خاں پاؤں پھیلا رہے تھے، بے حساب مال غنیمت اور تین سو ہاتھی اور بے شمار اسلحہ جات جمال خاں کے ہاتھ لگے۔

برہان کی مدد کے لیے دلاور خاں کا فوج روانہ کرنا

جب دلاور خاں اس بے سرو سامانی سے شاہ درگ واپس پہنچا تو اسے بڑی خفت ہوئی، اس داغ ناکامی کو دور کرنے اور اپنے حریف کو نیچا دکھانے کے لیے افواج کی درستگی و آراستگی میں ہمہ تن مشغول ہو گیا، اور چند دنوں کی محنت و مشقت سے ایک زبردست فوج تیار کر لی۔ جب یہ دس ہزار کی فوج تیار ہو گئی تو دلاور خاں نے ایک لائق سپہ سالار کے زیر کمان اس کو شاہ درگ سے روانہ کر دیا تاکہ جلد از جلد وہ برہان نظام شاہ کی فوج سے ملحق ہو جائے، جس میں راجہ علی خاں اور دیگر ذی اثر اُمرائے برار بھی شریک ہیں۔

جمال خاں بھی اس عرصہ میں بیکار نہ رہا، اس کے لیے یہ جنگ موت و حیات کی اہمیت رکھتی تھی، اس کی اس کے خاندان کی آبرو اور اس کے فریق کی خیر اسی میں تھی کہ وہ اس جنگ کو کامیاب بنالے؛ ورنہ جس طرح اس دکھنی فریق نے غیر ملکی فریق پر غلبہ پاکر مرزا خاں اور اس کے ساتھیوں پر مظالم توڑے تھے، جس بیدردی سے ان کا خون بہایا تھا، جس بیباکی سے انھیں سر بازار رسوا کیا تھا اور جس سنگدلی سے انھیں امان نہ دی تھی، اسی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ ظلم و ستم غیر ملکی فریق کے ہاتھوں دکھنیوں پر ڈھائے جائیں گے۔ اگر اسمٰعیل کی بجائے برہان احمد نگر کے تخت کا مالک بن گیا ان وجوہات کی بنا پر جمال خاں اور اس کا فریق مرنے اور مارنے پر تلا ہوا تھا، جس وقت جمال خاں نے بیجاپوری افواج کو شکست دی اور دلاور خاں ابراہیم کو لیکر میدان سے بھاگا اور سیدھے شاہ درگ کی راہ لی تو جمال خاں نے یہ معلوم کرکے وہ درمیان میں کہیں وقفہ نہیں لیگا، اس کے تعاقب میں وقت اور محنت صرف کرنے کی بجائے اپنے دوسرے دشمن کے مقابلے کے لیے تیاریاں شروع کردیں۔ اس وقت جمال خاں کا اک اک لمحہ قیمتی اور نہایت اہم تھا۔ اگر وہ تعاقب ہی میں وقت گزار دیتا تو ممکن تھا کہ برہان راجہ علی خاں سمیت احمد نگر میں گھس آتا اور جمال خاں محض صورت دیکھتا رہ جاتا۔ اس احساس نے جمال خاں کو مجبور کیا کہ وہ دلاور خاں اور ابراہیم کو اپنے حال پر چھوڑ کر احمد نگر لوٹے اور وہاں جاکر ستا لینے کے بعد از سر نو فوجوں کی ترتیب و تنظیم کرلے۔ نیز دارالسلطنت احمد نگر کے انتظامات ٹھیک کرکے اور کسی معتمد امیر کو حاکم بناکر برہان کے مقابلہ کے لیے پھر احمد نگر سے باہر نکلے قبل اس کے کہ بیجاپوری افواج برہان کی مدد کو پہنچیں، اس کا خاتمہ کردے، اور اس طرح یہ فتنہ دب جائے۔ غرض جمال خاں احمد نگر میں چند دن ٹھیر کر تازہ دم ہوگیا، اور اپنی فوجوں کو لیکر برار روانہ ہوگیا جس طرف سے کہ برہان کے حملہ کا اندیشہ تھا۔

حقیقت میں جمال خاں نے نہایت تیزی اور خوبصورتی سے تمام انتظامات ٹھیک ٹھاک کرلیے جس سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ وہ نہ صرف ایک بہادر جرنیل ہی تھا بلکہ ایک منتظم مدبر بھی۔ یہ اس کی بدقسمتی تھی کہ وہ اپنے ارادوں میں کامیاب نہ ہوسکا اور پورا دکن اس کے خلاف ہوگیا۔ اگر حالات اتنے ناموافق نہ ہوتے تو یقیناً جمال خاں کو شاندار کامیابی نصیب ہوتی اور وہ اپنے آپ کو دکن کی

عظیم الشان شخصیت بنا رکھا تا جب وہ احمد نگر سے برار کا ارادہ کر کے نکلا اس وقت اس کو اطلاع ہوئی کہ دلاور خاں اپنی ہزیمت کا بدلہ لینے اور برہان کی مدد کے لیے دس ہزار سوار کی ایک جرار فوج روانہ کر رہا ہے۔

اس خبر وحشت اثر کے سُنتے ہی وہ سمجھ گیا کہ اب کامیابی دشوار ہے۔ کامیابی خواہ حاصل ہو یا نہ ہو۔ اس مقصد میں جس کے لیے اس نے اپنی زندگی وقف کر دی تھی، مرنا دشوار نہیں تھا! اور یہی حقیقی جوہر کی پہچان ہے۔ اگر جمال خاں کی جگہ کوئی دوسرا ہوتا نہ معلوم ان پریشان کن حالات میں کیا کر بیٹھتا۔ اس قدر خوف و ہراس اس پر طاری ہو جاتا کہ کچھ کرتے دھرتے نہ بنتی اور ہاتھ پاؤں پھول جاتے۔ لیکن وہ تو صرف جمال خاں ہی تھا کہ پیشانی ہمت پر شکن نہ پڑی، اور برابر برار کی طرف بڑھا چلا گیا۔ اس نے برار پہنچنے میں انتہائی تیزی کی اور بالخصوص اس وجہ سے کہ پہنچنے سے عادل شاہی افواج کا سیلاب امڈا چلا آ رہا تھا۔ پانچ چھ روز کے عرصہ میں بڑی کوشش کے بعد برہان کے لشکر کے قریب عادل شاہی افواج سے پہلے جمال خاں پہنچ گیا۔ یہاں آنے کے بعد معلوم ہوا کہ تھوڑی بہت مدد کی توقع جو بعض اُمرائے برار سے تھی وہ بھی جاتی رہی اور تمام اُمراء و شرفاء برہان کے ساتھ لڑنے مرنے پر آمادہ ہیں! ابھی برہان کے ساتھ راجہ علی خاں ملحق نہ ہوا تھا بلکہ برہان نے یہاں آکر خود اپنی ایک فوج تیار کر لی تھی جس میں زیادہ تر اُمرائے احمد نگر شریک تھے اور راجہ علی خاں کا انتظار تھا۔ اسی حال میں اس نے جمال خاں کی آمد کی خبر سُنی تو لڑائی کے لیے تیار ہو گیا۔ جمال خاں آتے ہی بغیر کسی پس و پیش کے بجلی کی طرح برہان کے لشکر پر ٹوٹ پڑا۔ یہ پہلی یورش ہی ایسی زبردست تھی کہ برہان کا لشکر متزلزل ہو گیا۔ غرض آثار یہ کہہ رہے تھے کہ برہان کو شکست ہو گی، جمال خاں یلغار کر کے فوج کے اندر تک گھُس گیا اور میمنہ و میسرہ کو تتر بتر کر دیا۔ اگر ایک آدھ گھنٹہ کی مہلت ملتی تو برہان ختم تھا، اور اگر برہان ختم ہو جاتا تو ایک کیا دس راجہ علی خاں اور بیس دلاور خاں بھی جمال خاں کا کچھ نہ بگاڑ سکتے۔ مگر مشیت ایزدی اس کے خلاف تھی۔ عین اس وقت دلاور خاں کا لشکر ہوا کے پر لگائے ہوئے آدھمکا، اور ادھر راجہ علی خاں طبل جنگ بجا کر میدان میں اُتر گیا! اس وقتی امداد سے برہان کی

فوج میں جان آگئی، اس کے پاؤں جم گئے، امیدیں بڑھ گئیں، حوصلے جو پست ہو چکے تھے ایک لمحہ میں بلند ہو گئے، اور اب وہ پہلے سے بھی زیادہ جم کے ساتھ لڑنے لگے جب جمال خاں کی فوج تین طرف سے شکنجہ میں جکڑ دی گئی تو سوائے اس کے کوئی صورت ہی نہ تھی کہ لڑ کر جان دیدے جمال خاں نے اس بہادری سے ان تینوں کا مقابلہ کیا کہ دشمنوں کے بھی چھکے چھوٹ گئے اور وہ اس کی جانبازی کا لوہا مان گئے! اس حالت میں خواہ کوئی کتنا ہی بہادر اور جانباز کیوں نہ ہو فوج کو اپنے قابو میں لانا بڑا مشکل کام ہے! اول تو مخالفین کی فوج کی تعداد بڑھ گئی تھی اور دوسرے وہ لوگ تازہ دم تھے، جمال خانی لڑتے لڑتے تھک گئے تھے، مگر آفریں ہے کہ انھوں نے پست ہمتی اور بزدلی سے کام نہیں لیا، جنگ نہایت زور و شور سے جاری تھی کہ اسی اثناء میں ایک تیر جمال خاں کے آ لگا، اور وہیں اس کا خاتمہ ہو گیا۔ خداوند خاں جو جمال خاں کا داماد تھا، وہ بھی اسی معرکہ میں کام آیا۔ جب ان دونوں سرداروں کی موت دفعتاً واقع ہو گئی تو لشکر جو محض اُن ہی کے بل بوتے پر لڑ رہا تھا بھلا غنیم کا کیا مقابلہ کر سکتا۔ رہا ان کا بادشاہ اسمٰعیل سو وہ ابھی ایک کمسن بچہ تھا، ایسی حالت میں میدان کے رنگ کو بدلنے کی قابلیت اس میں کہاں سے آتی! جب فوج اپنے سردار سے محروم ہو جاتی ہے تو اس کو سوائے بھاگنے کے کچھ سوجھتا ہی نہیں۔ غرض ان کو مکمل اور فاش شکست ہوئی، اسمٰعیل کو قیدیوں کی طرح باپ کے سامنے لایا گیا، محبت پدری کو جوش آیا، برہان نے اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے کو سینہ سے لپٹا لیا، اور اس کے بعد وہ منصور و کامیاب احمد نگر کی طرف متوجہ ہوا۔ برہان کے حلیف اس سے وہیں رخصت ہوئے، راجہ علی خاں نے تھوڑی دور تک برہان کا ساتھ دیا اور پھر مع اپنی مال غنیمت کے جس میں دو ہزار گھوڑے اور کئی ہاتھی اور بہت کچھ متفرق مال تھا، خاندیس روانہ ہوا[۱]

---

[۱] فرشتہ نے اس دوسری جنگ میں بھی تھوڑا بہت اختلاف کیا ہے جو بساتین اور تحفۃ الملوک کے بیانات سے مختلف ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ جمال خاں دشمن کی فوج سے مقابل ہونے سے پہلے بہت لمبا چوڑا راستہ قطع کر کے آیا تھا، راستہ میں کہیں پانی کا نام و نشان نہ تھا! اس کی فوج بہت پیاسی تھی اور تشنگی سے ہر ایکا

دلاور خاں کے پنجہ سے ابراہیم کی رہائی

یہ تو بار بار لکھا جا چکا ہے اور خود واقعات کے مطالعہ سے بھی واضح ہو جاتا ہے کہ دلاور خاں اس وقت ملک کے تمام امور سیاسی و انتظامی پر حاوی تھا، حتیٰ کہ بادشاہ پر بھی اس کو پورا پورا اختیار تھا، وہ جیسا چاہتا حکومت کرتا تھا، اس نے ابراہیم کو ایک طرف کر رکھا تھا، ہمیشہ اسی کوشش میں لگا رہتا تھا کہ اپنے اختیارات میں مزید وسعت ہو اور کوئی اس کی حکومت میں دخل اندازی نہ کر سکے۔ مختصر یہ کہ اس وقت وہ ریاست بیجاپور کا مطلق العنان حاکم تھا۔ ابراہیم کو یہ چیزیں اور دلاور خاں کے یہ افعال ناگوار تھے، وہ جس طرف نظر ڈالتا دلاور خاں کے ہی آدمی نظر آتے تھے، اب وہ جوان ہو گیا تھا اور چاہتا تھا کہ خود حکومت کرے مگر دلاور خاں نے ایسا جکڑ دیا تھا کہ کچھ کرتے بن نہ پڑتی تھی، سوائے جشن و آرام کرنے اور رسمی طور پر اجازت نامہ دینے کے اسے کوئی کام ہی نہ رہا تھا۔ جس طریقہ سے اکبر کے سن بلوغ کو پہنچ جانیکے بعد بھی زمام سلطنت بیرم خاں کے ہاتھ میں تھی، تقریباً یہی حال دلاور خاں کا تھا جس طرح اکبر بیرم خاں کی سخت نگرانیوں اور عملی قیود سے تنگ آگیا تھا بالکل یہی عالم ابراہیم کا تھا کہ اس کے سر پر چڑھے ہوئے نوکر کی گستاخیوں سے وہ زچ ہو گیا تھا۔ یہ بہت ممکن ہے کہ دلاور خاں اور بیرم خاں نمکحرام نہ ہوں، وہ اپنے بادشاہ یا ملک کے بدخواہ نہ ہوں، ان کے ارادے اپنے آقائے ولی نعمت کی موروثی حکومت غصب کرنیکے نہ ہوں، وہ ظالم و سفاک نہ ہوں، مگر وہ اپنی طبیعت سے مجبور تھے، ان کی فطرت میں حکومت کرنیکا شوق تھا، جب ایک مرتبہ انھوں نے حکومت کا مزہ چکھ لیا تھا تو وہ نہیں چاہتے کہ یہ نعمت ان سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) بُرا حال تھا قریب تھا کہ پیاس سے ہی بہت ہلاک ہو جائیں لیکن بڑی مشکلوں کے بعد ان لوگوں کو اتنا پانی ملگیا کہ جانیں بچ گئیں۔ ایک تو فوج تھکی ماندی تھی، دوسرے تشنگی سے اس کا بُرا حال ہو چکا تھا اور ایک لمبا سفر طے کر چکی تھی، ان حالات میں دشمن سے مقابلہ ہوا، جمال خاں کیساتھ دس ہزار مہدوی تھے انھوں نے بہادری سے اپنے سردار کی ماتحتی میں لڑکر جان دی (فرشتہ)۔

(متن میں جو تفصیل دی گئی ہے وہ تحفۃ الملوک اور بساتین سے لی گئی ہے)۔

چھین لیجائے، یا یہ کہ وہ اپنی دانست میں یہ سمجھتے ہوں کہ شہزادوں کی عمریں ابھی ایسی نہیں کا امور مملکت و معاملات سلطنت کو بالکلیہ ان کے تفویض کر دیا جائے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر ان دونوں کے حالات پر نظر ڈالی جائے تو نمکحرامی کی بو تک بھی ان کے افعال سے نہیں آتی، بلکہ تھوڑی بہت سختی اور سخت گیری نے ان کی اکثر اچھائیوں پر بھی پردہ ڈال دیا ہے، ورنہ اگر یہ ذرا سی سمجھ سے کام لیتے تو غالباً زیادہ عرصہ تک حکومت ان کے ہاتھ میں رہتی، اور بادشاہ بھی ان سے خوش رہتے، ملک کو ان کی قابلیتوں سے زیادہ عرصہ تک مستفید ہونے کا موقع ملتا، صرف ضرورت اس امر کی تھی کہ وہ بادشاہ کی ذہنیت کا اندازہ کر کے اسے اس کے پورے اختیارات پر بحال کر دیتے اور پھر خود بحیثیت ایک ملازم کے اس سے اپنے اختیارات حاصل کرتے، کیونکہ بادشاہ چاہے وہ کتنا ہی حکومت کا شائق کیوں نہ ہو اسے کسی نہ کسی وزیر یا وکیل کی ضرورت ہوتی ہے، جس کے ہاتھ میں تقریباً ملک کے تمام انتظامات ہوتے ہیں اور جو ملک کا سب سے بڑا عہدہ دار ہوتا ہے۔ بہرحال ابراہیم اب دلاور خاں کے ضرورت سے زیادہ حاوی آجانے سے بیزار سا ہو گیا تھا، اور چاہتا تھا کہ جہاں تک جلد ہو سکے دلاور خاں کو نکال کر رہے، اب اس کا پیمانۂ صبر لبریز ہو چکا تھا وہ محض موقع اور وقت کا منتظر تھا۔

دلاور خاں کے مکمل زوال کے بیان کرنے سے پہلے ان دو ایک باتوں کا ذکر بھی کر دینا چاہیئے جو خصوصیت کے ساتھ اس عرصہ میں بادشاہ کو ناگوار گذریں، چنانچہ تاریخ فرشتہ سے واضح ہے کہ جب فوجیں جمال خاں کے مقابلہ سے ہزیمت خوردہ واپس ہوئیں اور اس کے بعد پھر ایک جرار فوج برہان کی امداد کے لیے شاہ درگ سے روانہ کر دی گئی تو اس وقت بادشاہ یہ چاہتا تھا کہ کچھ دن اور یہاں قیام کرے، کیونکہ اس کو یہاں کی دلفریب آب و ہوا، خوبصورت اور حسین قدرتی مناظر، میوہ دار اور گھنے درختوں کے مسحور کن جھنڈ، صاف و شفاف پانی نہریں اور ندیاں، اونچے نیچے ٹیلے، غیر ہموار لیکن خوبصورت گھاٹیاں اور حسین وادیاں نہایت پسند آگئی تھیں۔ اس سے بحث نہیں کہ اس وقت یہاں ٹھہرنا قرین مصلحت تھا یا نہ تھا، لیکن چونکہ بادشاہ کی خواہش تھی اس لیے دلاور خاں کا فرض تھا کہ کم از کم وہ اس کی خوشنودی کے لیے شاہی حکم کی تعمیل کرتا، دلاور خاں کو تو صرف یہ فکر تھی کہ

جلد سے جلد یہاں سے کوچ کردے۔ لہٰذا دوسرے ہی روز بادشاہ کی مرضی کے بالکل خلاف اس نے کوچ کا حکم دیدیا۔ (دوسرے جمال خاں سے جو جنگ ہوئی اس میں بادشاہ کی یہ مرضی تھی کہ فی الحال جمال خاں پر حملہ نہ کیا جائے، اور اس نے دلاور خاں کو خصوصیت کے ساتھ کہلا بھیجا کہ آج جنگ موقوف رکھی جائے، مگر بادشاہ کے صریح احکام کے خلاف اس نے جمال خاں سے جنگ چھیڑدی اور شکست کھائی یہ شکست اور عدول حکمی ابراہیم کے دل میں کانٹے کی طرح کھٹک رہی تھی۔ نیز بلبل خاں کے قتل کا واقعہ بھی اسے سخت ناگوار گذرا تھا۔ ان تینوں واقعات کو اس کے زوال کے فوری اسباب سمجھا جا سکتا ہے) بہرحال ابراہیم اب دلاور خاں سے متنفر ہو گیا تھا، اور چاہتا تھا کہ کسی طرح بھی اس کے پنجے سے چھٹکارا ملے۔

ابراہیم نے اپنی نجات کے توڑ جوڑیوں شروع کئے کہ عین الملک کنعانی، انکس خاں اور علی خاں (جن میں ہر ایک ذی مرتبت اور پایہ کا امیر تھا) کے پاس اپنے ایک دو آدمی روانہ کر کے ان سے اس معاملہ میں گفت و شنید کی، بادشاہ نے جن لوگوں کو ان کے یہاں بھیجنے کے لیے منتخب کیا تھا، وہ دو ہندو ادنیٰ درجہ کے ملازمین تھے جن پر یہ گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا کہ وہ بادشاہ کے اتنے بڑے معاملہ میں رازدار ہوں گے۔ اسی بنا پر ابراہیم نے اتنی ہشیاری سے اس کام کے لیے ان لوگوں کو منتخب کیا کہ سوائے ان کے جتنے با اثر اور اس کے اپنے مقرب تھے، وہ سب دلاور خاں کے حکم میں تھے۔ بادشاہ ان لوگوں پر اعتماد نہیں کر سکتا تھا اس کارروائی میں ابراہیم کی والدہ بھی شریک تھی، ہم اوپر لکھ آئے ہیں کہ دلاور خاں کے غرور و تکبر اور طاقت و اقتدار کے باعث عین الملک اور انکس خاں اس سے نفرت کرتے تھے، اور دل سے چاہتے تھے کہ بادشاہ اس کے پنجے سے چھٹکر ہمارے زیر اثر آجائے، ابراہیم اور اس کی والدہ کو بھی معلوم تھا کہ دلاور خاں سے ان امیروں کو کتنی نفرت ہے جس کا کافی ثبوت گذشتہ جنگ ہی میں ملگیا تھا، اسی وجہ سے ابراہیم نے بالخصوص ان سے گفت و شنید شروع کی، جب یہ دونوں ہندو بادشاہ کا یہ پیغام لیکر گئے کہ وہ دلاور خاں کی سخت گیریوں سے تنگ آکر ان کی امان میں آنا چاہتا ہے اور ان سے توقع رکھتا ہے کہ وہ اس کی مدد کریں گے اور دلاور خاں سے نجات دلائیں گے (بالخصوص

اس وجہ سے کہ ان کے آبا و اجداد میں شاہی خاندان کے واسطے کیا کیا خونفشانیاں اور جاں نثاریاں کی ہیں اور کس قدر خوشگوار تعلقات رہے ہیں) عین الملک اور آنکس خاں نے جب یہ خبر سُنی تو خوشی سے پھولے نہیں سمانے لگے، اس کے معنی یہ تھے کہ آیندہ دلاور خاں ذلیل وخوار ہوگا اور حکومت میں ان کا اپنا بول بالا رہے گا۔ غرض انھوں نے بادشاہ سے وعدہ کرلیا کہ وہ ہر طریقہ سے اس کی مدد کے لیے تیار ہیں اور تدبیر یہ بتائی کہ ابراہیم مع اپنے چند ساتھیوں اور رازداروں کے ٹھیک آدھی رات کو جب تمام لشکر غافل پڑا سوتا رہے گھوڑے پر سوار ہوکر شاہی کیمپ سے نکلے اور عین الملک اور آنکس خاں کے کیمپ میں آجائے، جو شاہی کیمپ سے قریب ایک آدھ کوس کے فاصلہ پر ڈالا گیا تھا، بادشاہ کو یہ تدبیر پسند آئی اور اس نے کسی کو اس کی خبر نہ کی، جب رات ہوگئی تو دلاور خاں جس کا ڈیرہ شاہی ڈیرہ کے بالکل قریب تھا، بادشاہ کو اپنی خواب گاہ میں پہنچا کر خود اپنے ڈیرہ میں شب بسری کے لیے آگیا بیان کیا جاتا ہے کہ دلاور خاں اسی رات اپنی بدقسمتی سے ایک حسین و مہ جبین کے وصال کے مزے لوٹ رہا تھا، جس پر وہ ایک زمانے سے عاشق تھا، اس لیے اس نے حکم دے رکھا تھا کہ کسی صورت میں بھی آج رات کوئی اس کے آرام میں خلل انداز نہ ہو۔ یہ واقعہ من گھڑت یا صحیح، ابراہیم کے لیے تو اچھا ہی ہوا کہ وہ بآسانی دلاور خاں کی قید سے چھوٹ گیا۔ غرض جب آدھی رات ہوگئی تو ابراہیم خاموشی کے ساتھ اپنے ڈیرہ سے نکلا اور ایک جاں نثار ملازم سے (جو شاہی غلام تھا اور جس کا نام کفشدار خاں تھا) کہا کہ ایک گھوڑا حاضر کرے، یہ شخص سیدھے شاہی اصطبل گیا، اور جلودار شاہی سے ایک گھوڑا شاہی سواری کے لیے حاضر کرنے کو کہا جلودار نے کچھ پس وپیش کیا اور پھر دلاور خاں کے حکم کے بغیر گھوڑا دینے سے قطعاً انکار کردیا، جب اس وفادار ملازم نے دیکھا کہ اس کورنمک کی شرارت سے سارا بنا بنایا کام بگڑ جاتا ہے تو غصہ سے بیتاب ہوکر وہیں اس کے ایک ایسا زبردست تھپڑ رسید کیا کہ وہ چکرا کر گر پڑا اور بیہوش ہوگیا۔ دوسرے جلودار نے جب یہ رنگ دیکھا تو فوراً حکم کی تعمیل کی گھوڑا حاضر کیا گیا اور بادشاہ چپ چاپ اپنے چند ساتھیوں کے ساتھ نکل گیا، الیاس خاں راستہ میں ملا اور اس بے وقت روانگی کے متعلق کچھ استفسار کیا، ابراہیم نے کہا کہ یہ وقت باتوں میں گنوانے کا نہیں بلکہ ہر ہر لمحہ قیمتی ہے اگر تو چاہتا ہے تو ہمارے ساتھ ہولے۔ بادشاہ کا اشارہ

پاتے ہی یہ بھی مع ایک سو ساتھیوں کے ہمراہ ہوگیا تھوڑے ہی عرصے میں بادشاہ کی سواری مین الملک اور آنکس خاں کے کیمپ میں پہنچ گئی۔ یہ لوگ تو چشم براہ بیٹھے ہوئے تھے، جب بادشاہ آن پہنچا تو انکی جان میں جان آگئی، فی الحال بادشاہ کے آرام کا انتظام کر دیا اور خود دلاور خاں کے مقابلہ کیلیے تیاریاں کرنے لگے۔ بادشاہ کی فراری کی خبر پھیلتے پھیلتے پھیل گئی، جو وفادار تھے اس کے جھنڈے کے نیچے جوق جوق آکر جمع ہو گئے، جن میں رفیع الدین شیرازی اور قاسم فرشتہ (مورخین) بھی تھے اس طرح تھوڑے ہی عرصہ میں تین ہزار سپاہیوں کی ایک اچھی فوج تیار ہو گئی، اور چند ہاتھیوں کی ایک قطار سامنے لگا دی گئی کہ اگر دلاور خاں ہمت کر کے لڑنے کے لیے آئے تو اسے ہاتھیوں سے کچلوا دیں۔ ادھر یہ تیاریاں ہو رہی تھیں اور ادھر دلاور خاں اپنی معشوقۂ دلنواز کے وصال سے لطف اندوز ہو رہا تھا، خدا خدا کر کے جب صبح ہوئی تو وہ آنکھیں ملتے ہوئے اٹھا منھ ہاتھ صاف کر کے غسل خانہ سے بادشاہ کے سلام کی غرض سے باہر نکلا تو دیکھا کہ شاہی کیمپ کی دنیا ہی بدل گئی ہے، ہر طرف ایک بے چینی اور اضطراب کی کیفیت ہے۔ جسے دیکھو سرگوشیاں کرتا ہوا نظر آتا ہے۔ دلاور خاں یہ حال دیکھ کرتا ڑ گیا کہ معاملات کچھ ٹھیک نہیں، دریافت کرنے سے معلوم ہوا کہ وہ سونے کی چڑیا جسے قفس میں بند رکھ کر خود حکومت کے مزے لوٹ رہا تھا، گذشتہ شب ذراسی غفلت کے باعث ہاتھ سے نکل گئی، دلاور خاں ہاتھ ملتا رہ گیا، عمر بھر وہ ہمیشہ مستعد، تیار اور ہشیار رہا، مگر شومئ قسمت سے آج ہی اسے غافل ہونا تھا، یہ بھی زمانے کی ستم ظرفی ہے، وقت ہاتھ سے نکل گیا تھا، اب وہ کر ہی کیا سکتا تھا، اور سمجھ گیا ہوگا کہ اب جو کچھ کارروائی کیجائے گی وہ بعد از وقت ہوگی، مگر انسان کو ہمت نہیں ہارنی چاہیئے اور آخر وقت تک کوشش کرنی چاہیئے، دلاور خاں ایسی ہی مستقل طبیعت رکھنے والا آدمی تھا، وہ جانتا تھا کہ اس کی ترقی کا آفتاب رو بہ زوال ہے اور غروب ہوا ہی چاہتا ہے، چلو ایک آخری کوشش اور سہی کہیں بعد کو یہ خلش نہ رہ جائے کہ کاش یوں کیا ہوتا تو کام بن جاتا تدبیر اور ہمت تو اس کے غلام تھے ہی اب ان دونوں سے وہ کام لینا چاہتا تھا، گو بادشاہ کو پھر سے اپنے قبضہ میں لانا دلاور خاں کے بس کی بات نہ تھی، اس نے خیال کیا کہ اب جو کچھ کوشش وہ کرے گا محض اسکی اپنی قسمت آزمائی ہوگی، اگر اپنی کھوئی ہوئی عظمت کے رعب و داب سے جو لوگوں کے دلوں پر اب تک

چھایا ہوا تھا کام نکل جائے تو ٹھیک ہے، اور نہ نکلے تو وہی ہوگا جو ہونا ہے۔ غرض خدا کا نام لیکر وہ اپنی فوج کے ساتھ نہایت شان وشوکت سے عین الملک کیمپ کی طرف بڑھا اور اپنے ساتھ اپنے بیٹوں کو بھی لے لیا، جب بادشاہ کا کیمپ بالکل تھوڑے سے فاصلہ پر رہ گیا (یعنی ایک تیر کے فاصلہ پر) تو اپنی بیشتر فوج وہاں چھوڑ دی اور صرف پانچسو سواروں اور چند ہاتھیوں کے ساتھ سیدھے کیمپ کی راہ لی۔ جب بادشاہ کو معلوم ہوا کہ دلاور خاں اس پر جبر کرنے کے لیے آرہا ہے تو عین الملک کو دلاور خاں کے روکنے کے لیے مقرر کیا، عین الملک اور آنکس خاں نے وعدہ کرتے وقت تو بڑی کشادہ دلی سے کام لیا تھا، لیکن جب کام کا وقت آپڑا تو ان کا بھرم کھل گیا، وہ دلاور خاں کے دشمن تھے، نفرت کرتے تھے مگر اس کی عظمت وشوکت کے آگے ان کی روح پرواز کر جاتی تھی، ان کی ہمت نہ بڑی کہ اس کا مقابلہ کریں، اس وقت عین الملک نے ایسی بزدلی کا ثبوت دیا ہے کہ شاید ہی کسی نے دیا ہو، جب دلاور خاں قریب پہنچا تو بجائے اس کی مدافعت کے اسے کہلا بھیجا کہ بادشاہ بے بلائے آپ ہی آپ ہمارے کیمپ میں چلے آئے ہیں، چونکہ شاہی سواری کو روکنا خلاف آداب ہے اس لیے ہم نے ان کو ٹھیرالیا ہے، آپ آکر بخوشی بادشاہ سلامت کو لیجا سکتے ہیں۔ دلاور خاں نے جب یہ سنا تو سمجھا کہ کام بنگیا، ابراہیم کو جن پر ناز تھا وہی ایسے نکلے، مدعی سُست اور گواہ چُست کا مضمون تھا، اس لیے دلاور خاں اپنی پیشانی پر بل ڈال کر اور غضب آلود ہوکر بادشاہ کے حضور میں پہنچا، سامنے جو ہاتھیوں کی قطار تھی وہ بھی ہٹادی گئی اور کسی نے روکا ٹوکا تک نہیں۔ وہ تیزی کے ساتھ بڑھتا ہوا بادشاہ تک پہنچ گیا اور نہایت درشت اور تحکمانہ لہجہ میں گویا ہوا کہ "آدھی رات کو یوں یکایک تبدیل مقام کرنا سخت نامناسب تھا، اب حضور کو چاہیئے کہ اپنے اصلی کیمپ کو میرے ہمراہ چلیں"۔ بادشاہ نے جو اس کے طور دیکھے تو آگ ہوگیا، آج وہ دن تھا کہ اس کا نوکر اس سے تحکمانہ لہجے میں گفتگو کر رہا تھا، بلکہ حکم دے رہا تھا۔ ابراہیم نہایت سنجیدہ مزاج تھا، غصہ کو پی گیا اور اپنی حقیقی شان وشوکت کا لحاظ رکھکر بجائے دلاور خاں کے اس جملہ کا جواب دینے کے صرف اتنا کہا کہ "کوئی نہیں جو اس نمکحرام کی گستاخیوں کا بدلہ لے، اور مجھے اس سے نجات دلائے"! اسکی زبان سے اتنا نکلنا تھا کہ ایک جاں نثار غلام جس کا نام ادب خاں تھا برق کی مانند کوندا، اور دوسرے ہی لمحے

دلاور خاں پر تھا، ایک ایسا زبردست تلوار کا وار کیا کہ اگر دلاور خاں ذرہ سی غفلت کرتا اور اس وار کو خالی دینے کی کوشش نہ کرتا تو وہیں ڈھیر تھا لیکن دلاور خاں بھی بہادر، مستعد اور کئی معرکہ مارا ہوا آدمی تھا، اسی لیے توانا دل بھی کیا تھا، وہ ان تمام پیش آنیوالے واقعات کو سمجھتا تھا اور سمجھ کر ہی اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈالا تھا، اس نے بڑی پھرتی سے پیچھے ہٹنے کی کوشش کی لیکن وہ پوری طرح بچ نہ سکا، اس کے تلوار لگی پر اچٹتی ہوئی، اس کے گھوڑے سے نیچے گرتے ہی قریب تھا کہ کام تمام ہو جائے مگر بعض دلاور خاں کے ہمدرد بھی وہاں موجود تھے، چنانچہ ایک فیلبان نے اپنا ہاتھی درمیان کر دیا اتنی مہلت ملنی تھی کہ دلاور خاں اٹھا اور اپنے داماد کے پیش کیے ہوئے گھوڑے پر سوار ہو کر سرپٹ بھاگا، یوں اس کی جان تو بچ گئی مگر اس کی شوکت و عظمت کا آفتاب اب ہمیشہ کے لیے غروب ہو گیا، اس کا بھاگنا تھا کہ اُس کے بیٹے محمد خاں اور حیرت خاں بھی اس کے ساتھ ہو لیے، شاہی فوج نے اس کا تعاقب مناسب نہ سمجھا، جب اس کی فوج نے اپنے افسر کی یہ حالت دیکھی تو خود پریشان و منتشر ہو گئی اور بادشاہ کو اس "آمر مطلق" سے ہمیشہ کے لیے نجات ملگئی۔ جس وقت دلاور خاں وہاں سے بھاگا اسی وقت سے ابراہیم عادلشاہ ثانی، حقیقی معنی میں بادشاہ بیجاپور کی حیثیت سے حکومت کرنے لگا، اب تک وہ متولیان ریاست کے ہاتھ میں گویا ایک بے جان مورت تھا کہ جس طرف چاہو موڑ لو، ابراہیم اور دلاور خاں کا یہ سین بالکل اس سین کے مماثل ہے جو کسی زمانے میں انگلستان کے ایک بادشاہ اور ایک سرکش امیر کلیسا کے درمیان واقع ہوا تھا، ہنری بھی بیکٹ کی سرکشیوں اور نافرمانیوں سے بیزار ہو گیا تھا، بالآخر بادشاہ اور اس امیر کلیسا کی کشمکشوں کا خاتمہ یوں ہوا کہ ایک وقت بادشاہ اس کی نافرمانیوں اور شرارتوں سے بہ تنگ آکر پکار اٹھا کہ "کیا کوئی نہیں جو مجھے اس غدار کی غداریوں سے نجات دلائے"۔ بادشاہ کی زبان سے یہ الفاظ نکلے ہی تھے کہ ایک جاں نثار نے ادب خاں کی طرح اپنی وفاداری کا ثبوت دیا، فرق صرف اتنا ہے کہ یہاں دلاور خاں اپنی جان بچا کر بھاگ گیا تھا اور وہاں بیکٹ کٹ کر ڈھیر ہو گیا۔

دلاور خاں نے سیدھے بیدر پہنچکر پناہ لی مگر یہاں ٹھیرنا بھی بے سود سمجھ کر اس نے پھر احمد نگر کا رُخ کیا، جہاں اس وقت برہان تخت نشیں ہو چکا تھا، یہاں پہنچتے ہی اس نے دربار میں رسائی

حاصل کرلی اور تھوڑے ہی دنوں میں برہان کی ناک کا بال بنگیا۔ یہاں رہ کر اس نے ان دو ریاستوں کے درمیان لڑائیوں اور فتنہ و فساد برپا کئے جن کی تفصیل آگے آئیگی۔ دلاور خاں اپنے دو بیٹوں محمد خاں اور حیرت خاں سمیت بھاگ نکلا مگر اس کا ایک لڑکا کمال خاں جو داراسنگ کی طرف فرار ہوا تھا بہت جلد پکڑا گیا اور شاہی سپاہیوں کے ہاتھ اس کا خاتمہ ہوا۔

دور وکالت پر اک عام نظر

دلاور خاں کے بھاگ جانیکے بعد "عہد ابراہیم" کا چونکہ ایک نیا دور شروع ہوتا ہے جبکہ خود ابراہیم بنفس نفیس مہمات و انتظامات ملکی میں مشغول ہو جاتا ہے اور چونکہ یہیں اس طویل زمانے کا اختتام ہوتا ہے جسے "عہد ریجنسی" اگر کہا جائے تو مناسب ہے، جو ابراہیم کی تخت نشینی یا علی عادل شاہ کی موت سے لیکر ابتک جاری تھا، علی عادل شاہ کی موت تقریباً ۹۸۰ھ میں ہوئی اور دلاور خاں کی فراری ۹۹۱ھ کا واقعہ ہے، اس طریقے سے تقریباً دس سال کا طویل زمانہ گذر چکا ہے، یہ یاد ہوگا کہ بادشاہ تخت نشینی کے وقت نُو سال کچھ مہینے یا قریب قریب دس سال کا تھا، تخت نشینی کے بعد سے ابتک دس سال گذر چکے ہیں تو گویا اس طرح اس کی عمر اس وقت تقریباً بیس سال کی تھی تخت نشینی کے بعد سے یہ دس برس تو ایسے گذرے ہیں جس میں بادشاہ محض عضو معطل رہا، اور یکے بعد دیگرے متولیان سلطنت غالب آتے رہے اور اپنی اپنی قابلیت و لیاقت کے اعتبار سے اچھا یا برُا انتظام مملکت انجام دیتے رہے، اس طویل زمانے کی تاریخ گذشتہ صفحات میں پیش کردیگئی ہے، حقیقت میں یہ زمانہ بادشاہ کی کمسنی کی وجہ سے بیجاپور کے لیے ایک پُر آشوب زمانہ تھا، ایک طرف بادشاہ کم عمر تھا تو دوسری طرف کوئی نمک حلال، وفادار اور سچا خادم ملک نہ ملنے کی وجہ سے ملک میں ایک عام خرابیوں کا سلسلہ پیدا ہو گیا تھا جس میں کچھ وقفہ سے کمی اور زیادتی ہوتی رہی، چونکہ اُمرائے ملک ایک طاقتور عنصر سلطنت تھے اور جب کوئی ان کو اپنے قابو میں رکھنے والا نہ رہا تو انھوں نے ملک میں ایک شور مچا دیا اور ہر ایک کو زیادہ تر یہی فکر تھی کہ اپنا ذاتی فائدہ ہو، ملک کے بڑے بڑے عہدے اپنے اور اپنے عزیز و اقارب اور ہمنواؤں کے ہاتھوں میں رہیں اور دوسرے اپنے رقیب حکومت کے دائرے سے خارج ہو جائیں، کسی کو بھولے سے بھی یہ خیال نہ آتا تھا کہ اسٹیٹ ایک پبلک ٹرسٹ ہے اس کا انتظام یوں ہونا چاہیئے کہ

ریاست بھی قائم رہے اور ملک کے امن و امان میں بھی خلل نہ پڑے اگر اتنا احساس بھی اس وقت کسی
امیر کو ہوتا تو یہ خانہ جنگیاں ہی برپا نہ ہوتیں، اخلاص خاں اور دلاور خاں کی کشمکش میں جو گولہ باری ہوئی تھی
اس میں کئی معصوم جانیں تلف ہوگئیں، جو متولی سلطنت مقرر ہوتا وہ پہلے چاند بی بی کے اختیارات
سلب کرنے کی کوشش کرتا، کیونکہ اس کی موجودگی اس کی اپنی من مانی حکومت میں روڑے اٹکاتی تھی،
کور مغزی اور باہمی مخالفتوں کا یہ عالم تھا کہ یہ چیزیں ملک اور وطن فروشی کی حد تک پہنچ چکی تھیں چنانچہ اخلاص خاں
کے زمانے میں قطب شاہی اور احمد نگری حملے کے وقت جبکہ بیجاپور کا محاصرہ ہو چکا تھا بجائے اس کے کہ
متحدہ و متفقہ طور پر ان غیر ملکی دشمنوں کو مار نکالتے صرف اخلاص خاں سے مخالفت کی بنا پر بعض اُمرائے سلطنت
انھیں سے مل چکے تھے، بد نظمی کی یہ حالت کہ جس کا موقع ملتا وہ اپنے حریف کو گرفتار کر لیتا، قید کر دیتا اور
خود اس کی جگہ پر مامور ہو جاتا جب بڑے بڑے اُمرا کا یہ حال ہوا اور جب انکی کشمکش کی یہ کیفیت
ہو تو اندازہ ہو سکتا ہے کہ ملک کا اندرونی انتظام کس قدر درہم برہم ہو رہا ہوگا، کوئی کسی کا
پرسان حال نہ تھا حتیٰ کہ جن کے سپرد انتظام مملکت اور امن و امان قائم کرنا تھا، جن کے
ذمے عدل و انصاف کا پھیلانا، اہل ملک کو جابروں اور ظالموں کے دست ستم سے محفوظ رکھنا
تھا وہی اپنے ذاتی اغراض کے لیے ملک میں غارتگری اور لوٹ مار کی دھوم مچا دینے سے پیچھے
نہ ہٹتے تھے، اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ ملکی ہمدردی اور سچی وفاداری کا جذبہ کہاں تک ان
امیران وطن فروش کے سینوں میں اس وقت موجزن تھا، غرض امن عامہ کا کوئی صحیح طور پر ضامن
اور محافظ نہ تھا۔ بادشاہ کے ساتھ ان امیروں کی وفاداری کا یہ عالم تھا کہ کئی مرتبہ یہ تحریکیں
انھیں اُمرا کے جلسوں میں پیش ہوئیں کہ بادشاہ کو معزول کر دیا جائے، قید کر دیا جائے اور دوسرے کو
تخت پر بٹھا دیا جائے، یہ اس وجہ سے نہیں کہ بادشاہ نا اہل ہے، نالائق ہے، بیوقوف ہے اور
عیش پسند ہے، بلکہ صرف اس لیے کہ ایک اچھے قابل اور ہونہار لڑکے کو بادشاہ بنا کر یہ زیادہ
عرصہ تک اندھیر نگری نہیں چلا سکتے تھے، اور اگر اس کی جگہ کسی نا اہل کو تخت نشیں کر دیں تو پھر
دل کھول کر اپنی دراز دستیوں سے کام لے سکیں گے۔ اس کے علاوہ چونکہ اس وقت اُمرا کا ایک فریق

بادشاہ کی طرفداری کر رہا تھا اس لیے فقط اس کو کمزور کرنے کے لیے یہ اپنا ایک نیا دعویدار پیش کرنے سے
نہیں جھجکتے تھے، یہ تدبیریں محض اس واسطے عملی صورت اختیار نہ کر سکیں کہ دوسروں نے اس بنا پر
مخالفت کی کہ اگر کسی اور کو بادشاہ بنا دیا جائے تو بادشاہ بنانیوالا فریق زیادہ طاقتور ہو جائے گا۔
غرض ملک میں اس طویل زمانے میں برابر کشمکش جاری رہی، کبھی علی الاعلان، کبھی اندرونی سازشوں کے
ذریعہ، کبھی ریشہ دوانیوں اور دیگر طریقوں سے، بہرحال جب تک ابراہیم کے ہاتھ میں حکومت نہیں آئی
اس وقت تک خود اس کو بھی یقین نہ ہوگا کہ کسی روز وہ بھی اپنے باپ دادا کی طرح بادشاہ کہلائے گا،
اور ان ظالموں کے پنجہ سے صحیح وسلامت بچکر نکل جائے گا، مگر چونکہ وہ ایک اقبالمند بادشاہ تھا
اور ساتھ ہی صاحب تدبیر بھی، اس لیے ان سازشوں کی اس کے آگے کچھ پیش نہ گئی اور وہی کامیاب نکلا

دلاور خاں کا کیرکٹر

دلاور خاں کے عروج، ترقی اور زوال کا اس قدر مطالعہ کیا جا چکا ہے جس سے با سانی
اس کے کیرکٹر کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ دلاور خاں سب سے پہلے تو ایک حبشی تھا اور ان تین میں کا ایک تھا جو کچھ
عرصہ تک بیجاپور میں "اتحاد ثلاثہ حبشیان" قایم کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے اسی کے بعد اس کی ترقی
شروع ہوتی ہے، وہ اپنی فطری فراست، دانائی، چالبازی اور بہادری کے باعث ان دونوں پر غالب
آکر آخرکار تنہا مختار السلطنت بن بیٹھتا ہے۔ دلاور خاں چونکہ حبشی تھا اس لیے اس کی فطرت میں
بہادری کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی، عموماً حبشی اچھے جنرل اور عمدہ سپاہی ہوتے ہیں، انھیں کی طرح
وہ موت سے بالکل خائف نہ تھا، اس کے لیے اپنی ترقی وعروج کی خاطر جان پر کھیل جانا معمولی بات
تھی، مگر اس کے یہ معنی نہیں کہ وہ بیوقوفوں کی طرح اپنی زندگی کی کوئی قدر نہ کرتا ہو، اور اس میں وہ
بہادری نہ تھی جس کو "بیوقوفانہ بہادری" کہتے ہیں، بلکہ وہ ایک حقیقی بہادر جنرل کی طرح بعض اوقات اپنی جان کو
خطرے میں ڈالنے سے پیچھے نہ ہٹتا تھا۔ غرض دلاور خاں کی بہادری میں کچھ کلام نہیں۔ اس کا آخر وقت بادشاہ کے
سامنے سے بھاگ جانا بزدلی اور حماقت نہیں بلکہ ایک دانشمندانہ فعل تھا، ایسے موقع پر جبکہ بادشاہ کا
پلہ قطعی طور پر بھاری ہو چکا تھا اور اُس کے اردگرد اُسی کے حامی وہمنوا تھے، دلاور خاں کا ٹھیرنا
خلاف مصلحت تھا اگر وہ اس وقت ٹھیرتا اور بیوقوفانہ بہادری دکھانے کی کوشش کرتا تو سوائے

مارے جانیکے اور کیا ہو سکتا تھا، اس لحاظ سے اس کے بھاگ جانے کو ہم بزدلی سے تعبیر نہیں کر سکتے، بلکہ یہ چیز اس کے تدبر، مستعدی اور حاضر دماغی پر دال ہے۔ ایسے موقعوں پر جبکہ دوسروں کے حواس باختہ ہو جاتے ہیں وہ نہایت اطمینان اور سنجیدگی سے کام کرتا تھا، ہمت اور استقلال اس میں بہت کافی تھا، وہ جس بات کے پیچھے پڑتا اسے پورا ہی کر کے چھوڑتا تھا، اور آخر وقت تک برابر کوشش کئے جاتا تھا اور بڑی مشکل سے اپنی ہار ماننے کے لیے تیار ہوتا، اس کی یہ خصوصیت اس کو ہمیشہ دوسروں کے مقابلہ میں کامیاب بنا دیتی تھی، جہاں دوسرے لوگوں کو نا امیدی اور یاس گھیر لیتی ہے وہاں دلاور خاں اور بھی جری و بہادر ہو جاتا تھا، اگر احمد نگری فوج کے مقابلہ میں وہ ذرا بھی مایوس ہو کر عدم مستعدی سے کام لیتا اور اپنی حاضر دماغی کو کھو دیتا تو جمال خاں وہیں اس کا کام تمام کر دیتا، مگر ایسے نازک وقت میں وہ اپنے حواس کو قابو میں رکھکر برق کی مانند بادشاہ کو لے اڑا کہ آئی ہوئی بلا ٹل گئی، یہی خصوصیات تھیں جو اسے بادشاہ کے سامنے سے صحیح و سلامت لے گئیں، ورنہ اس کے مارے جانے میں کوئی بات باقی نہ رہی تھی۔

اس کا تدبر اتنا بڑھ گیا تھا کہ ایک سازشی اور غدار کی سفاکیوں تک پہنچ گیا تھا، گو اندرونی سازشوں سے ایسا کام لینا غالباً ایک مذموم فعل ہے مگر میکاولی کا اس باب میں فتویٰ ہے کہ ایک سیاس کے لیے ہر بات روا اور ہر چیز جائز ہے، اس کی اس خصوصیت کی مثال اس سے ملتی ہے کہ اس نے اخلاص خاں اور حمید خاں کو اشتعال دیکر لڑا دیا اور خود تماشا دیکھنے لگا، ادھر یہ آپس میں لڑ کر کمزور ہو رہے تھے اور ادھر وہ اپنے کو طاقتور کئے جا رہا تھا، اپنی انھی شاطرانہ چالوں سے اس نے ترقی کی۔ غرض اس کا تدبر ایک حد تک مبتذل طریقہ کا تھا، اور اپنے مقصد کے حصول کے لیے وہ مذموم سے مذموم طریقہ اختیار کرنے سے پیچھے نہ ہٹتا تھا (چوروں والا واقعہ اس کی کافی دلیل ہے) انتقام کا مادہ بھی اس میں ضرورت سے زیادہ تھا، بلبل خاں کو اندھا کرنا، اپنے ساتھیوں اخلاص خاں اور حمید خاں سے اس کا سلوک، اور ابراہیم سے بدلہ لینے کے لیے برہان کو ترغیب دے کر بیجاپور پر چڑھا لانا یہ سب اس کی مثالیں ہیں، فریب کاری اس کا ایک ادنیٰ کرشمہ تھا چنانچہ بلبل خاں کو اس نے دھوکے ہی سے اندھا کیا تھا۔

اس کے ساتھ ہی اس میں بعض ایسی خوبیاں بھی تھیں جو حقیقت میں قابل تعریف ہیں وہ خود

ایک اچھا خاصا عالم و فاضل آدمی تھا! اس نے اپنی اولاد کو بڑی اچھی تعلیم دلائی تھی چنانچہ اس کا ایک لڑکا اپنے زمانے کے قابل ترین اشخاص میں شمار ہوتا تھا جس کو بادشاہ کے استاد ہونے کا شرف بھی حاصل تھا، دلاورخاں اکثر علماء و فضلاء کی صحبت کو پسند کرتا تھا اور بیشتر علماء اور قابل لوگوں کی اس نے قدر و منزلت کی، گجرات اور دیگر علاقوں سے اکثر قابل لوگوں کو اس نے جمع کر لیا، بیجاپور میں اس کے زمانے میں علمی سرپرستی کافی ہوئی ہے جس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ وہ علم نواز اور ایک روشن طبیعت رکھنے والا انسان تھا۔ انتظام مملکت میں بھی وہ کچھ بُرا نہ تھا گو اپنی حوصلہ مندی سے اس نے پوری حکومت اپنے قبضہ میں کر رکھی تھی، مگر لگے ہاتھوں ملک کا ایسا ٹھیک انتظام کیا تھا کہ تھوڑے ہی عرصہ میں سب امن و امان سے زندگی بسر کرنے لگ گئے تھے۔ اخلاص خاں کے دور میں یہ چیز نا پید تھی، اور ملک میں چاروں طرف ہنگامے برپا نظر آتے تھے، اس کی کاردانی، بہادری اور جرنیلانہ قابلیتوں کی وجہ سے ملک کو بہت جلد ہمسایہ دشمنوں سے نجات ملگئی، اس نے احمدنگر کو ایسی موقتی امداد دی کہ اس ریاست کو اپنا ممنون بنا لیا، اس نے ملک کی فوجی طاقت میں اضافہ کر دیا، اس وقت بیجاپور پر حملہ کرنا تو بڑی بات تھی خود دوسری ریاستیں بیجاپور کی امداد کی طلبگار رہتی تھیں، مالابار اور کرناٹک کے علاقوں پر مہیں بھیجکر وہاں کا انتظام ٹھیک کروا دیا، اور یہ وہ کام تھا جس کی طرف اگلے متولیان ریاست نے توجہ تک نہ کی تھی، اور مصطفےٰ خاں کے مرنیکے بعد خراج آنا موقوف ہو چکا تھا! اسی کے عہد میں ابراہیم اور اس کی بہن کی شادیاں ہوئیں جس کی بدولت قطب شاہی علاقہ سے مکمل صلح ہو گئی لیکن گوناگوں وجوہات کی بناء پر احمدنگر سے لڑنا پڑا جس میں بیشتر بیجاپور کو فتح حاصل ہوئی، اس کے دور میں سب سے پہلے مغلوں سے تعلقات کا سلسلہ شروع ہوتا ہے کیونکہ دلاورخاں ہی کے نام اکبر کا فرمان آیا تھا کہ برہان کی مدد کی جائے۔ یہ فرمان خود دلاورخاں کی مرضی سے آیا تھا، اس کا مقصد ہمیشہ یہ رہتا تھا کہ دوسری ریاستوں سے خوشگوار تعلقات پیدا کر کے اپنے حالات درست کر لے، اور اپنی ریاست کو اس ڈھنگ پر رکھے کہ دوسرے اس سے خائف رہیں، مجموعی طور پر یہ کہا جا سکتا ہے کہ دلاورخاں اپنی خارجہ پالیسی میں نہایت کامیاب رہا اور اندرونی انتظام بھی

تحفۃ الملوک۔

اس کا ٹھیک رہا، مگر اس کی یہ مسلسل کوشش کہ ابراہیم کو عضو معطل بنا کر خود کاروبار سلطنت چلائے اس کی پیشانی پر کلنک کا ٹیکہ ہے۔ تذکرۃ الملوک سے واضح ہے کہ اس نے یہاں تک کوشش کی کہ بادشاہ کو معزول کر دے، مگر جب یہ تدبیر الٹی پڑی تو قسمیں کھا کر اس نے اپنے آپ کو بے قصور ثابت کیا۔[1]

غرض دلاور خاں اپنی مختلف خصوصیات کے اعتبار سے انتظام مملکت کے لیے غیر موزوں آدمی نہ تھا، بالکل بیرم خاں کی طرح وہ دشمنوں کا سر کچلنا ملک کا انتظام کرنا اور امن و امان پیدا کرنا خوب جانتا تھا مگر ساتھ ہی ضرورت سے زیادہ بیرم خاں کی طرح حوصلہ منداور حکومت کا خواہاں بھی تھا، اسی مناسبت نے دونوں کو اس پر مجبور کیا کہ اپنے اپنے بادشاہوں کو عضو معطل بنا رکھیں، اور اس کا نتیجہ دونوں کے حق میں برا ہوا کہ دونوں باغی سمجھے جا کر ملک سے نکالے گئے۔ بیرم خاں کی طرح یہ بھی بہت سخت گیر اور تند مزاج تھا، ماتحتین سے نہایت سختی کے ساتھ اپنے حکم کی تعمیل چاہتا تھا، غرض یہ عجیب بات ہے کہ دلاور خاں اور بیرم خاں میں جو قریب قریب ایک ہی زمانے میں ہوئے ہیں اور دو ہمعصر بادشاہوں کے ریجنٹ رہ چکے ہیں، چند خاص فطری مناسبتیں پائی جاتی ہیں اور بعض جگہ تو دونوں کے حالات اور افعال و اعمال میں بھی یکسانی پائی جاتی ہے، جس طرح بیرم خاں اپنی ریجنٹی کے زمانے تک آمر مطلق رہا، اسی طرح دلاور خاں بھی حکمرانی کے مزے لوٹتا رہا، آخر میں دلاور خاں کی ساری کمزوریوں کا لحاظ رکھتے ہوئے بھی یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہ بلاشک و شبہ اپنے زمانے کی بڑی شخصیتوں میں شمار ہونے کے قابل ہے، اس کی ترقی ذاتی قابلیت کی بدولت ہوئی، اگر دلاور خاں میں خصوصاً وہ کمزوری نہ ہوتی (یعنی بادشاہ کو عضو معطل کر دینے کی خواہش) جس کے معنی قریب قریب سلطنت کے غصب کرنے کے ہیں، تو واقعی وہ ہر حیثیت سے ایک قابل تعریف شخص ہوتا۔ اس چیز سے قطع نظر دلاور خاں کے عہد حکومت پر نظر ڈال کر اس کے تدبرا

---

[1] مگر اپنی جگہ یہ ظاہر کر دیا گیا ہے کہ یہ محض افواہ تھی اور اس کی کوئی اصلیت نہ تھی، اگرچہ تحفۃ الملوک نے اس کا تذکرہ کیا ہے۔

انتظام، بہادری اور اس کے غیر ممالک سے تعلقات وغیرہ کی بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ وہ بیجاپور کے متولیوں اور وزیران سلطنت میں سب سے اچھا اور سب سے زیادہ قابل ریجنٹ تھا۔

باب ہفتم

احمد نگر سے جنگ اور دلاور خاں کا خاتمہ

احمد نگر سے جنگ دلاور خاں کی فراری کے بعد سے ہی ابراہیم کی حقیقی بادشاہت کا زمانہ شروع ہوتا ہے، اور متولیوں کا دور دورہ ختم ہو جاتا ہے چونکہ ابراہیم کی حقیقی بادشاہت کا زمانہ ہمارے موضوع سے خارج ہے، اس لیے یہاں پر اس سے یا اس کی حکومت سے متعلق کسی کارروائی پر بحث کرنے کی ضرورت نہیں لیکن اس باب میں اس جنگ کا تذکرہ بالتفصیل کیا جائے گا جو ابراہیم کے زمام حکومت ہاتھ میں لیتے ہی کرنی پڑی کیونکہ اس کا تعلق براہ راست دلاور خاں سے ہے، اور اس جنگ کے اختتام کے ساتھ ہی دلاور خاں کا خاتمہ بھی ہو جاتا ہے۔

دلاور خاں کی فراری کے ساتھ ہی بیجاپور کو احمد نگر سے اک اور جنگ کا سابقہ پڑا! اگر دیکھا جائے تو یہ جنگ دراصل پچھلی جنگ اور دلاور خاں کی فراری کے واقعات کا تتمہ ہے! اوپر لکھا گیا ہے کہ دلاور خاں بیجاپور سے بھاگ کر احمد نگر میں پناہ گزیں ہوا تھا۔ جب وہ احمد نگر پہنچا تو وہاں اس کی بڑی آؤ بھگت ہوئی، اور برہان نظام شاہ جس کی مدد کے لیے بیجاپور کی سلطنت نے اتنا کچھ کیا تھا ان تمام احسانات کو یک لخت بھلا بیٹھا، اور ایک دوست ہمسایہ ریاست کے مفرور اور معتوب ملازم کو اپنے ہاں جگہ دی۔ اس سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ برہان کے ارادے بیجاپور کی نسبت کچھ ٹھیک نہیں تھے، ورنہ یہ طریقہ تو ہمسایہ ریاستوں میں مذموم قرار دیا گیا تھا کہ جب ایک ریاست کا معتوب شخص دوسری ریاست میں آئے تو اسے پناہ دی جائے۔ یہاں نہ صرف پناہ دی گئی بلکہ اس شخص کو اپنا مشیر خاص بنا لیا گیا اور اس کی رائے پر بیرونی تعلقات کا سانچہ ڈھالا جانے لگا! ابراہیم نے جب سُنا کہ دلاور خاں بچکر صحیح وسلامت احمد نگر پہنچ گیا ہے تو اسی وقت وہ کھٹک گیا کہ اب کچھ نہ کچھ گل ضرور کھُلے گا۔ دلاور خاں گھر کا بھیدی تھا، اس کا ایک ایسی ریاست میں جا کر پناہ لینا جو ہمیشہ سے بیجاپور کی رقیب رہی ہو کچھ معمولی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

غرض روزِ اول ہی سے اس کا علم ہو چکا تھا کہ احمد نگر سے زیادہ عرصہ تک تعلقات اچھے نہیں رہ سکتے۔ اگر برہان کی جگہ کوئی اور بادشاہ ہوتا تو غالباً یہ جنگ واقع نہ ہوتی کیونکہ جس ریاست نے ابھی ابھی اس کو تخت نشیں کرانے میں اتنی جان ہار کوشش کی ہو اسی ریاست کے خلاف جارحانہ کارروائی کسی احساس رکھنے والے سے ممکن نہ تھی۔ لیکن برہان نے اس کی مطلق پروانہ کی اور دلاور خاں نے اسے کچھ اس طرح ابھارا اور ورغلایا کہ وہ آمادۂ جنگ ہو گیا۔ دلاور خاں نے اسے یقین دلایا کہ اس وقت بادشاہ کم عمری کی وجہ سے کاروبارِ سلطنت سنبھالنے کے قابل نہیں ہے اور قطعاً نااہل ہے، اور دوسرے جو کچھ اُمراء اور عہدہ دار ہیں وہ آپس کی خانہ جنگیوں اور خود غرضیوں میں اتنے اُلجھے ہوئے ہیں کہ اگر ایسے میں سرحد پر حملہ کر دیا جائے تو بہت سارے سرحدی علاقے جو دست اختیار سے نکل گئے ہیں پھر قبضہ میں آ جا سکتے ہیں۔ بالخصوص علاقہ شولاپور جس کے لیے احمد نگر ہمیشہ بیجاپور پر دانت پیستا رہتا تھا، دلاور خاں کی ان ترغیبوں سے برہان کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اسی اثنا میں جبکہ تعلقات کچھ کشیدہ ہوتے جا رہے تھے، ابراہیم کے ایک لڑکا پیدا ہوا۔ لڑکے کی پیدائش پر اسے چاروں طرف سے تہنیت نامے اور مبارکبادیاں آنے لگیں، اور بالخصوص لڑکے کے ماموں قلی قطب شاہ نے تو بیش بہا تحائف بھجوائے جس میں ایک مرصع زرنگار گہوارہ بھی تھا، اور تہنیت و مبارکباد کے لیے ایک سفارت خاص طور پر بیجاپور روانہ کی۔ سلاطین دکن کے باہمی تعلقات کی یہ اک خصوصیت رہی ہے کہ ایسے موقعوں پہ تہنیتی سفارتیں بھیجی جاتی ہیں، اور جب کوئی ریاست معمول کے خلاف رسوم کے ادا کرنے میں پہلوتہی کرے تو دوسری ریاست اس کو کشیدگی اور رنجش پر محمول کرتی تھی، اور اسے اپنی ایک تحقیر سمجھتی تھی۔ چنانچہ اب یہی ہوا کہ احمد نگر کی جانب سے کوئی تہنیت نامہ یا مبارکباد نہیں آئی۔ ابراہیم کو یہ بات سخت ناگوار گذری، اس پر طرہ یہ ہوا کہ دو ماہ کے اندر اندر ہی لڑکے کا انتقال ہو گیا۔ احمد نگر کی ریاست کم از کم اس وقت تعزیت کی رسم ادا کر کے ابراہیم کے اس رنج میں شریک ہو کر اپنی گذشتہ نازیبا حرکت کو بھلا دے سکتی تھی، اگر وہ حقیقت میں بیجاپور کی دوستی کی کچھ قدر کرتی۔ مگر وہاں دلاور خاں موجود تھا۔ اور وہ تو یہی چاہتا تھا کہ ان دونوں ریاستوں کے تعلقات خراب ہو جائیں، اور ان دونوں کی لڑائی میں وہ خود کامیاب ہو جائے۔ برہان اس کی رائے پر

عمل کر رہا تھا۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ احمد نگر کی اس پہلوتہی کا باعث بھی وہی ہوا۔ ابراہیم کو اپنے لڑکے کے مرنے کا بہت رنج ہوا، اور کیوں نہ ہوتا آخر اولاد تھی، وہ بھی پہلی حسب معمول اس حادثہ پر دوسری ریاستوں نے تعزیت نامے بھیجے اور اظہار ہمدردی کیا مگر احمد نگر اس دفعہ بھی بالکل خاموش رہا، گویا کچھ جانتا ہی نہیں۔ احمد نگر کا یہ سکوت ابراہیم کو پہلے سے بھی زیادہ برا معلوم ہوا۔ اب اس نے دل میں ٹھان لیا کہ اس احسان فراموش ریاست اور اسکے بادشاہ دونوں کو ان کے غرور کا مزہ چکھا دے۔ چنانچہ ایک سفارت ملا عنایت اللہ کی سرکردگی میں بیجاپور سے روانہ کی گئی اور کہلا بھیجا کہ دلاور خاں یہاں کا ایک مفرور اور معتوب خانہ زاد ہے۔ مناسب تو یہ تھا کہ احمد نگر کی ریاست از خود اسے اپنی پناہ میں نہ لیتی، اور آپس کے تعلقات کی خوشگواری کو ناخوشگواری سے بدلنے کا موقع نہ دیتی۔ لیکن احمد نگر نے اپنا اک رسمی فرض ادا کرنے سے پہلوتہی کی ہے۔ اس پر بھی درگذر کیا جاتا ہے، اور یاددہانی کے طور پر احمد نگر کو یہ لوگ روانہ کئے گئے ہیں کہ دلاور خاں جو یہاں سے سرکشی اور بغاوت کر کے بھاگا ہے اس کو ہمارے حوالے کر دیا جائے تو بیجاپور احمد نگر سے اس وقت بھی اچھے تعلقات رکھنے پر تیار ہے۔ مگر احمد نگر کی ریاست تو اس امر کے لیے تیار ہی نہ تھی، اس نے اس سفارت کا کچھ بھی اثر نہ لیا اور دلاور خاں کو واپس دینے سے قطعاً انکار کر دیا۔ نہ صرف انکار ہی کیا بلکہ بیجاپور پر حملے کے لیے تیاریاں شروع کر دیں۔

جب برہان نظام شاہ ایک زبردست فوج تیار کرنے میں کامیاب ہوگیا تو مع اُمرائے دولت اور دلاور خاں کے عازم بیجاپور ہوا۔ ابراہیم کو جب ان کارروائیوں کی خبر لگی تو اس نے بھی چپکے چپکے ایک فوج تیار تو کر لی مگر بظاہر اس حملہ کی طرف کوئی توجہ نہ کی۔ جب نظام شاہی لشکر عادلشاہی سرحدوں تک پہنچ گیا تب بھی یہاں سے ان کے مقابلہ کے لیے کوئی فوج روانہ نہیں کی گئی، اور برہان برابر لوٹ مار کرتا ہوا بیجاپور کی طرف چلا آرہا تھا۔ جب فوجیں منگل وارے (منگلیسرا)[1] تک پہنچ گئیں اور دیکھا کہ مدافعت کے لیے بیجاپور کی طرف سے ذرا بھی کوشش نہیں ہورہی ہے تو برہان پریشان ہوا، اور خیال کیا کہ کہیں یہ سب دھوکا تو نہیں دیا جارہا ہو، اور اس طرح غافل کر کے بیجاپور والے چاہتے ہوں کہ وہ انکی

[1] - فرشتہ۔

ریاست کے اندر چلا آئے اور جب چاروں طرف سے گھر جائے تو اس کا اور اس کی فوج کا قلع قمع کر دیں،
اس لیے وہ چاہتا تھا کہیں سے واپس ہو جائے، لیکن دلاور خاں گرگ باراں دیدہ تھا اس نے
سمجھایا کہ بھلا اس وقت بیجاپور میں ایسا کون بڑا جرنل یا بڑا آدمی ہے جو اس عاقلانہ تدبیر پر
عمل پیرا ہو کر ہم کو گھیر لے گا، ایک بادشاہ ہے سو وہ بھی کم عمر اور عیش و نشاط میں مشغول، ہم کو بلا خوف وخطر
آگے بڑھے چلے جانا چاہیئے اور کسی اچھے موقع پر قبضہ کر کے عادل شاہی فوج کا انتظار کرنا چاہیئے کہ
جب وہ مقابلہ کو آئے تو کاٹ کر رکھدیں، پھر شولاپور اور شاہ درگ ہی کیا چیز ہیں، بیجاپور کی
ریاست بھی ہماری ہے۔ یہ بات برہان نظام شاہ کی بھی سمجھ میں آگئی اور وہ اپنے خیال کو بدل کر
آگے بڑھا اور دریائے بیورہ[۱] (بھیما[۲]) تک پہنچ گیا، اب بیجاپور سے وہ "سی کروہ" کا فاصلہ رہ گیا،
یہاں ایک پرانا قلعہ تھا جو کسی ہندو راجہ کے عہد کا بنا ہوا تھا، مگر اب خستہ اور اجڑی ہوئی حالت میں
تھا بلکہ زمین کے برابر ہو چکا تھا۔ دلاور خاں کی رائے سے اس کی تعمیر شروع کی گئی اور راتوں رات اس کے
بنانے کی طرف تمام احمد نگری لشکر متوجہ ہو گیا، بہت جلد یہ قلعہ بنکر اس قابل ہو گیا کہ فوجوں کو پناہ دیسکے
اور اس کے اندر رہ کر دشمن کا اچھی طرح مقابلہ کر سکیں قلعہ کی تیاری کی خبر بھی ابراہیم کو ملی مگر ابراہیم نے
قطعاً اس سے بے پروائی ظاہر کی، اور کہا کہ برہان نظام شاہ اس مہم میں کامیاب نہیں ہوگا، جو قلعہ
وہ تیار کر رہا ہے اس کی کیفیت بچوں کے گھروندے کی سی ہوگی۔ درحقیقت اس مہم میں برہان نظام شاہ کو
جتنی مشکلوں کا سامنا کرنا پڑا تقریباً اتنی ہی بلکہ اس سے زیادہ ابراہیم نے بے اعتنائی برتی، اور خود
بہ اطمینان کلّی محو عیش و عشرت رہا، موسم بارش کا تھا، چار طرف کیچڑ اور پانی تھا، عموماً اس زمانے میں
فوجکشیاں جاری بھی ہوں تو روک دیجاتی ہیں، کیونکہ نقل و حمل میں بڑی مصیبتیں پیش آتی ہیں، مگر باوجود
ان تمام موسمی تکالیف کے برہان نے اپنی فوجی تیاریاں برابر جاری رکھیں، اسی دھواں دار بارش کے

---

[۱] ۔ فرشتہ ۔

[۲] ۔ برگس ۔

موسم میں قلعہ کی تیاری کچھ آسان کام نہ تھا لیکن اس نے قلعہ بھی تعمیر کر لیا، افسوس تو اس کا ہے کہ غریب کی ساری محنتیں اکارت گئیں، نقصان بھی اٹھانا پڑا اور جو ذلت و رسوائی اس کو اس حملے میں ہوئی وہ گویا اس مہم کا "نفع خالص" تھا) ادھر یہ بیچارے کیمپوں میں پڑے مصیبت اٹھا رہے تھے اور ادھر بیجاپور میں رنگ رلیاں ہو رہی تھیں، برہان متعجب تھا اور اہل احمد نگر بھی حیران تھے کہ آخر اتنی بے پروائی کیا معنی رکھتی ہے۔

باقاعدہ ایک مجلس مشورت میں یہ مسئلہ زیر بحث رہا کہ ابراہیم کیوں اتنی لاپروائی کر رہا ہے بعضوں نے کہا کہ کم عمری اور ناتجربہ کاری ہے، بعضوں نے نااہلی اور تساہل پر محمول کیا، بعضوں نے اندرونی خرابیوں، اُمرا اور فوج کا اختیار سے باہر ہونا ظاہر کیا، بعضوں نے اس کی نوجوانی کے مدنظر عیش و عشرت کو اس کا باعث گردانا۔ غرض جتنے منُھ اتنی باتیں، مگر کسی کا تیر نشانہ پر نہیں بیٹھا، دلاور خاں بھی یہی خواب دیکھ رہا تھا کہ اس کی عدم موجودگی کی وجہ سے بیجاپور میں اتنی ہمت نہ رہی کہ جو فوج سرحدوں کے اندر تک آکر اس قدر لوٹ مار مچا رہی ہے اس کی مدافعت کر سکے چنانچہ اس نے ایک تدبیر کی، وہ تو دل سے چاہتا تھا کہ ممکن ہو تو پھر بیجاپور چلا جائے اور بادشاہ پر قابو پا کر اسی طرح حکومت کرے۔ دلاور خاں کا برہان کو اس جنگ پر آمادہ کرنے کا مقصد ہی یہی تھا کہ ابراہیم مجبور ہو کر پھر اسے اپنے پاس بُلالے اس لیے اس نے خفیہ طور پر ابراہیم کے پاس چند آدمی روانہ کئے کہ فدوی ہمیشہ ملک و مالک کا وفادار رہا ہے اور اب بھی ہے، اعلیٰحضرت کی خفگی اور عتاب نے مجبور کیا کہ جان بچا کر بھاگ نکلے اس وقت دشمن زبردستی حملہ آور ہے اور اس کی مدافعت کی کوئی شکل نظر نہیں آتی، اگر اب بھی اس غلام کی خطا معاف کر کے پھر مہمات ملکی پر سرفراز فرما دیا جائے تو ان احمد نگریوں کو مار بھگاتا ہوں۔ جب ابراہیم کو یہ پیام پہنچا تو وہ بہت خوش ہوا، کیونکہ جس خیال سے وہ یہ چالیں چل رہا تھا بالکل صحیح نکلا، اور اس کا جادو چل گیا، اس نے بھی کہلا بھیجا کہ حقیقت میں اس وقت مجھے وفادار اور نمک حلال ملازمین کا صحیح اندازہ نہ تھا، اب میری آنکھیں کھل گئی ہیں، اور خوب سمجھنے لگا ہوں کہ کون اچھا ہے اور کون بُرا جلد بازی اور تیزی سے کشیدگی پیدا ہو گئی تھی، اب اگر کچھ دل میں رنجش ہے تو دور کر کے سیدھے ہمارے حضور میں چلے آؤ۔ دلاور خاں

یہ خبر سنکر باغ باغ ہوگیا، کیونکہ اس کی منھ مانگی مراد پوری ہوگئی تھی۔ اس کے بعد اس نے ابراہیم کے پاس چند اور آدمیوں کو بھیجکر یہ شرط منظور کرالی کہ اس کے اپنے جان و مال کو کوئی گزند نہ پہنچایا جائے گا، بادشاہ نے اسے بھی قبول کرلیا، پھر تو فوراً دلاور خاں نے میدان جنگ سے اپنے بیٹے محمد خاں اور چند ساتھیوں سمیت بیجاپور کی راہ لی (بیان کیا جاتا ہے کہ برہان سے اجازت لیکر وہ روانہ ہوا، مگر عقل سلیم تسلیم نہیں کرتی کیونکہ برہان نے محض اس کے بل بوتے اور مشورے پر حملہ کیا تھا، دلاور خاں اس حملے کی روح رواں تھا اگر برہان کو یہ معلوم ہوتا کہ دلاور خاں اس طرح خفیہ طور پر بیجاپور سے خط وکتابت کر رہا ہے تو اسے جاسوس سمجھ کر موت کے گھاٹ اتار دیتا اور واپس جانیکی اجازت کبھی نہ دیتا) جب وہ بیجاپور پہنچا تو پہلے آستاں بوسی کے لیے حاضر ہوا، اس وقت ابراہیم "دوازدہ امام باغ" گیا ہوا تھا، عصر کا وقت ہو چکا تھا کہ اس کی سواری قلعہ ارک کی طرف جانے لگی اسی وقت دلاور خاں حاضر درگاہ ہوا، بادشاہ نے خندہ پیشانی سے اس کا استقبال کیا اور ان سب کے ہمراہ قلعہ کی راہ لی، الیاس خاں کو حکم ہوا کہ دلاور خاں کو سوار کر کے قلعہ کے اندر لائے، جب وہ قلعہ کے اندر پہنچا تو دلاور خاں کا ماتھا ٹھنکا اور انداز و فضا سے وہ تاڑ گیا کہ اس کے ساتھ دغا کی گئی ہے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ دلاور خاں کو پکڑ کر اس کی آنکھیں نکال دیجائیں۔ دلاور خاں پریشان ہوا اور الیاس خاں کے ذریعہ سفارش کروانی چاہی اور بادشاہ کو یاد دلایا کہ وہ اپنی جان بخشی اور حفاظت مال کے وعدہ پر بیجاپور آیا ہے، ایسے میں وعدہ خلافی کرنا بادشاہوں کے شان کے خلاف ہے۔ مگر ابراہیم نے ایک نہ سُنی دہیں اس کی آنکھیں نکلوادی گئیں (بیان کیا جاتا ہے کہ بادشاہ نے اس کے جواب میں کہا کہ "بیشک میں نے جان و مال کی حفاظت کا وعدہ کیا ہے، لیکن آنکھ نکلوانے سے نہ جان جاتی ہے نہ مال ہی ضبط ہوتا ہے۔" ظاہر ہے کہ یہ دونوں چیزیں عذر لنگ ہیں جب وعدہ کی اسپرٹ پر غور کیا جائے اور محض الفاظ پر نہیں تو بے کم وکاست کہا جا سکتا ہے کہ بادشاہ نے وعدہ خلافی کی گو اخلاقی اعتبار سے ابراہیم کا یہ فعل قابل تعریف تو کیا ایک حد تک مذموم ہے مگر اخلاقیات کو اس طرح سیاسیات سے ملادیا جائے تو سلطنت کے کاروبار نہیں چل سکیں گے، دلاور خاں کا

پکڑا جانا اور اس کو معذور کر دیا جانا بیجاپور کی سلامتی اور امن کے لیے ضروری تھا ورنہ وہ
جب تک دشمن کے کیمپ میں رہتا بیجاپور اور ابراہیم کو چین نہ لینے دیتا، اور قطع نظر اس سے خود
دلاور خاں نے اپنے زمانے میں دوسروں کے ساتھ جو سلوک کئے تھے وہ اس سے کم نہ تھے۔
جیسا کرے، ویسا بھرے۔ جو چیز اس نے دوسروں کے لیے جائز رکھی تھی وہ اس پر روا ہوئی اگر اسوقت
ابراہیم اپنے وعدہ کا لحاظ کر کے اسے چھوڑ دیتا تو خود اس کی خیر نہ تھی چند ہی دنوں میں وہ رنگ
دکھاتا کہ سب کے ہوش اُڑ جاتے، اب تو اس کو ابراہیم سے کاوش بھی ہو گئی تھی، کچھ تعجب کا مقام نہیں کہ
وہ ابراہیم کو سرے سے معزول کر کے اس کے بھائی کو تخت نشین کر دیتا، اور اپنے پُرانے عہد حکومت کو
تازہ کر لیتا۔ غرض دلاور خاں کے ساتھ جو کچھ کیا گیا اچھا کیا گیا، مگر یہ ساری چیزیں ملکر بھی اخلاقی
نقطہ نظر سے ابراہیم کے اس فعل کی کمزوری اور بُرائی کو نہیں چھپا سکتیں) اس کے بعد وہ "قلعہ کھلکنہ" میں
قید کر دیا گیا اور تقریباً دس سال مزید زندگی کے بعد اسی قید کی حالت میں نطری موت سے مرا۔

اس وقت نظام فوج اپنی رات دن کی کوششوں سے بہترین موقع پر پڑاو ڈالے ہوئے تھی۔
قلعہ بھی تیار ہو گیا تھا، غلّہ اور آذوقہ کافی جمع کیا جا چکا تھا۔ غرض وہ آمادۂ پیکار تھے، بیکار نہ بیٹھ
سکتے تھے اس لیے اطراف واکناف میں لوٹ مار مچا رکھی تھی۔ دلاور خاں سے فراغت پاتے ہی
ابراہیم نے فوج کے اجتماع کا حکم دیا اور جلد سے جلد ایک زبردست فوج تیار کر لی گئی، سب سے
پہلے کوئی سات یا آٹھ ہزار کی "برگی" فوج برہان کے مقابلہ کو روانہ کی گئی کہ وہ برہان نظام شاہ کی
فوج کے اطراف گھیرا ڈال کر اسے تنگ کرنا شروع کرے اور رسد بند کر دے۔ برگی فوج کی خصوصیت
یہ تھی کہ قزاقانہ جنگ وہ خوب کر سکتی تھی جو فوجیں میدانوں میں لڑنے کی عادی ہوتی ہیں ان کا مقابلہ
نہیں کر سکتی تھیں اس فوج کے سپاہی نہایت تیز گھوڑوں پر بیٹھے ہوئے ہوا کے جھونکے کی طرح آتے
اور غفلت کے کسی موقع میں خوب قتل و غارت کر کے ان کے سنبھلنے سے پہلے ہی گھاٹیوں اور پہاڑیوں میں
غائب ہو جاتے۔ بیجاپور اس قسم کی فوج کی ایک زمانے سے سرپرستی کر رہا تھا اور ایسی ایک زبردست
فوج جمع کر لی تھی جو ہمیشہ دشمن کو دوران جنگ میں تنگ کرنے کے لیے متعین کی جاتی تھی، اس کے بعد

اصلی فوج پریشان شدہ دشمن کا خاتمہ کر دیتی تھی، چنانچہ اس جنگ میں یہی ہوا کہ جب برہان نظام شاہ کی فوج کو برگی فوج نے پریشان کر دیا اور ان کی رسد بند کر دی تو اس کے بعد رومی خاں کو سپہ سالار بنا کر دس ہزار کی فوج کے ساتھ بھیجا گیا، اور ایک ہراول تین ہزار سواروں پر مشتمل الیاس خاں سرنوبت کی سرکردگی میں روانہ ہوا! اس وقت نظام شاہی فوج بیورہ کے کنارے ٹھیری ہوئی تھی برگی فوج کے مقابلہ میں برہان نظام شاہ نے اپنے کئی دستے روانہ کئے مگر سب مغلوب ہوتے گئے۔ حتیٰ کہ یہ برگی فوج ندی کو عبور کر کے جس طرف برہان کی اصلی فوج تھی وہاں تک پہنچ گئی برہان نظام شاہ اب خود ان کے مقابلہ کے لیے آیا اس وقت یہ برگی فوج ذرا غافل تھی حملہ سے پریشان ہو گئی اور بیورہ کو عبور کرنے لگی اسی اثنا میں الیاس خاں اور رومی خاں بھی آپکے تھے، برگی فوج نے دریا کو عبور کر لیا اور اصلی شاہی فوج سے ملحق ہو گئی، مگر جب برہان نظام شاہ نے ان کے تعاقب میں بیورہ کو عبور کرنا چاہا تو یکایک طوفان ہوا اور پانی چڑھ آیا۔ برہان نظام شاہ کی فوج پریشان ہو گئی اور وہ اپنے کیمپ واپس ہو گیا۔

اسی دوران میں برہان نظام شاہ کے لشکر میں سخت قحط کی وجہ سے ایک عام پریشانی پھیل گئی، اس قحط کی نوبت یہاں تک پہنچی کہ غلّہ اور آذوقہ کی کمی اور چارہ کی قلت و کمیابی سے انسانوں اور جانوروں کی شرح اموات بہت بڑھ گئی، رسد بالکل بند ہو گئی، فاقوں سے فوج بیزار اور تنگدل ہونے لگی، یہ بلائے آسمانی یہیں ختم نہیں ہوئی بلکہ فوج میں اک عام وبا پھیل گئی جس کی وجہ سے فوج کی تعداد گھٹنے لگی اور حالت ابتر سے ابتر ہو گئی، برہان ہکا بکا ہو گیا اور اس سے کچھ کرتے دھرتے بن نہ پڑتی تھی بالآخر اس امر پر مجبور ہوا کہ قحط اور وبا سے نجات پانے کے لیے دو تین منزل اپنی سرحد کی طرف پیچھے ہٹے اور وہاں ، ٹھیر کر غلّہ وغیرہ حاصل کرے اور فوج کو از سر نو ترتیب دیکر تازہ دم ہو کر پھر میدان میں آئے، اس تدبیر پر عمل کر کے وہ میدان جنگ سے ہٹ گیا، اور اپنی فوج کی حالت درست کرنے میں مشغول ہو گیا چند دنوں کے بعد جب ان دونوں مصائب سے نجات ملی اور تھوڑا بہت اطمینان نصیب ہوا تو وہ پھر عادل شاہی فوجوں کے مقابلہ کے لیے آگے بڑھا مگر اب اس نے حملہ کا مرکز بدل دیا

اور شولاپور کا رُخ کیا کہ اس کا محاصرہ کرکے اپنا قبضہ کرے۔ ابراہیم عادل شاہ نے اپنے جنرلوں کو حکم دیا کہ وہ دریائے بیورہ کو عبور کرکے آگے بڑھیں اور برہان نظام شاہ کو راستہ ہی میں روک دیں تاکہ وہ شولاپور کا محاصرہ نہ کرسکے۔ غرض بجلی کی طرح الیاس خاں و رومی خاں اس کے حکم کی تعمیل کے لیے نکلے اور راستہ ہی میں برہان کو جالیا، جب نظام شاہیوں نے دیکھا کہ راستہ بند ہے اور شولاپور پہنچنے کے لیے سوائے جنگ کے چارہ ہی نہیں تو انھوں نے جنگ کی تیاری شروع کردی اس وقت نظام شاہی فوج کی کمان نُور نگ خاں دکنی امیرالامرائے برار[1] کے ہاتھ میں تھی، گو میدان بیجاپور کے ہاتھ میں رہا مگر مقابلہ اتنا زبردست ہوا کہ آخر وقت تک نظام شاہی فوج میدان میں ڈٹی رہی، بیجاپوری فوج کو فتح حاصل کرنے کے لیے کافی خونریزی اور خونفشانی سے کام لینا پڑا، جب نورنگ خاں یا نور خاں مارا گیا تو نظام شاہی فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور تتر بتر ہوگئی اور اس طرح ہزیمت خوردہ باحال تباہ خستہ و مجروح برہان نظام شاہ سے جاملی جو ایک "کروہ" کے فاصلہ پر جنگ سے ہٹکر ٹھیرا ہوا تھا، اس جنگ میں بہت کچھ مال غنیمت بیجاپور کے ہاتھ لگا جس میں "یکصد و شصت فیل ہزار اسپ و اسلحہ بیشمار[2]" اور فرشتہ کی روایت کے بموجب "صد فیل بزرگ کوہ تمثال و چہار صد سوار[3]" تھے۔ ایک فتح نامہ بادشاہ کے پاس روانہ کیا گیا جس میں اس پتہ کی تفصیلی کیفیت تھی، بادشاہ نے خوش ہوکر رومی خاں و الیاس خاں کو بیش قیمت خلعت عطا کئے۔

اگرچہ بیجاپوریوں کو اس جنگ میں ایک زبردست کامیابی حاصل ہوئی اور نظام شاہی فوج نے اس بری طرح شکست کھائی تھی کہ اب مقابلہ کی تاب نہ لاسکتی تھی مگر اس پر بھی پوری طرح عاجز نہ ہوئی تھی، اس لیے بیجاپوریوں نے اپنے فوجی کارروائیاں جاری رکھیں اور نظام شاہی فوج کو

---

[1] ۔ فرشتہ/بساتین میں اس نام کو نور خاں لکھا گیا ہے۔ برگس نے بھی اس کو قبول کیا ہے۔

[2] ۔ بساتین/صفحہ ۲۲۰۔

[3] ۔ فرشتہ۔

وقتاً فوقتاً تنگ کرنے لگے، گو وہ پیچھے ہٹے جارہے تھے مگران کا تعاقب کیا جارہا تھا، فوج کی بدحالی اورخستگی ہی برہان نظام شاہ کے لیے کیا کم تھی لیکن ایک پُرانی مثل کے بمصداق کہ "مُصیبت کبھی تنہا نہیں آتی" اس کی اندرونی پریشانیاں اس واقعہ سے اور بھی بڑھ گئیں کہ بعض سربرآوردہ اُمراء جن میں دکنی اور حبشی عنصر زیادہ تھا اس کوشش میں تھے کہ برہان کو معزول کرکے اس کے بیٹے اسمٰعیل کو تخت نشیں کردیں، یہ سازش ابھی پوری طرح مکمل نہ ہونے پائی تھی کہ برہان کو اس کا علم ہوگیا، اور وہ عادل شاہی افواج کو بالائے طاق رکھکر اب اس فکر میں لگ گیا کہ کسی طرح احمد نگر جلد سے جلد پہنچ جائے، تاکہ یہ سازش فرو ہوسکے، سازشیوں اور غداروں کو سزا دیجائے اور اپنے استحکام کی فکر کرے، اس غرض سے وہاں سے کوچ کرکے وہ "قصبہ کرور مالیان" کی طرف بڑھا جو حدود احمد نگر میں تھا۔ رومی خاں اور الیاس کو جب یہ خبر ملی تو بُری طرح اس کا تعاقب کرنے لگے، ایسی حالت میں برہان کو اتنا ہوش کہاں رہا تھا کہ ان کے مقابلہ کی تدبیر کرتا اس لیے آمادۂ صلح ہوگیا، اور سمجھ گیا کہ بیجاپوری فوج سے اس وقت خلاصی نصیب نہیں ہوسکتی جب تک کہ باقاعدہ صلح نہ کرلی جائے، اور صلح کی سلسلہ جنبانی شروع کی۔ جب ابراہیم کو برہان کی ان پریشانیوں اور صلح کی درخواست کی خبر ہوئی وہ جان کر بھی انجان ہوگیا اور اس درخواست کی جانب سے بے التفاتی برتی، اور عمداً اس کارروائی کو ڈال رکھا تاکہ احمد نگر کی ریاست اور برہان کو اس کا پورا پورا احساس ہو کہ وہ بیجاپوری دربار کے آگے جبہ سائی کررہے ہیں، ایک مہینے کے بعد کہیں ابراہیم عادل شاہ نے اس درخواست کی طرف توجہ کی اور وہ بھی اسوقت جبکہ برہان نے دیگر سلاطین دکن سے اس معاملہ میں مدد چاہی۔ قلی قطب شاہ والی گولکنڈہ کیجانب سے مصطفےٰ خاں استرآبادی[1] اور راجہ علی خاں وعبدالسلام نے اس صلح کے مسئلہ میں بڑی دلچسپی لی۔ جب ابراہیم کو معلوم ہوگیا کہ برہان بالکل عاجز آگیا ہے اور اسے اپنے کردار کی کافی سزا مل چکی ہے تو

---

[1] امیر زنبیل کو مصطفےٰ خاں کا خطاب دیا گیا تھا اور یہ شخص بھی استرآبادی تھا جس کا ذکر اس سے پہلے آگیا ہے۔

سلسلۂ گفت وشنید جاری کیا۔ صلح کی درخواست پر بادشاہ نے یہ بتایا کہ برہان نظام شاہ سے بیجاپور کی جانب سے کبھی کچھ تعرض نہ کیا گیا، اُلٹا وقتاً فوقتاً مدد دی گئی، لیکن اس نے ان احسانات کو بھلا کر سرحد بیجاپور میں قدم رکھکر لوٹ اور غارتگری شروع کردی۔ اور تمام جارحانہ کارروائیوں کی ابتدا اسی طرح سے ہوئی ہے، بیجاپور نے محض اپنی مدافعت کی ہے اس طرح سارا الزام احمدنگر کی ریاست پر عائد ہوتا ہے، لہذا احمدنگر کو اس جارحانہ کارروائی کا ہرجانہ ادا کرنا چاہیئے، اور اس ہرجانہ کی تفصیل یہ ہے کہ برہان نے جو قلعہ حدود عادل شاہی میں تعمیر کیا ہے اسے وہ خود اپنے ہاتھ سے مسمار کرے۔ اس صلح کی گفت وشنید اور اس کے شرائط کے طے کرنے کے لیے جو شخص بحیثیت نمایندہ کے بیجاپور کی جانب سے مقرر کیا گیا تھا، وہ شاہ نواز خاں تھا، شاہ نواز عالی مرتبت خدام عادل شاہی سے تھا، اور اس خاندان کا بڑا وفادار اور جاں نثار تھا، بیجاپور سے غیر معمولی وابستگی تھی اور ساتھ ہی بڑا راستباز تھا، سچی بات کہنے میں بہت بیباک تھا، تاریخ فرشتہ میں اس صلح کی نسبت ایک واقعہ درج ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس خان ذیشان نے اپنی بیباکانہ گفتگو سے بیجاپور کی شان رکھ لی اور احمدنگر کو یہ محسوس کرایا کہ وہ بیجاپور کے در پر جبیں سائی کر رہا ہے۔ صلح کی گفت وشنید کے لیے ایک خاص مجلس منعقد کی گئی تھی، جب اس کارروائی کی تکمیل کے لیے شاہ نواز خاں نظام شاہی لشکر میں گیا تو اس کی بڑی تعظیم وتکریم ہوئی، اس مجلس میں اکثر ریاستوں کے ایلچی اور حکام دکن موجود تھے، یہ مجلس اپنے رعب وداب کے اعتبار سے بہت بڑی مجلس تھی۔ جس وقت گفتگو شروع ہوئی تو برہان نظام شاہ نے خاموشی اختیار کی اور اپنے منھ سے صلح کی بابت پہلے ایک لفظ نہ کہا اس کا مقصد یہ تھا کہ یوں تھوڑی دیر خاموش ہو جائے تو خود شاہ نواز خاں ہی صلح کی گفتگو چھیڑے گا اور اس طرح حکام دکن اور سلاطین دکن کے ذیشان ایلچیوں پر یہ ظاہر ہوگا کہ صلح کی خواہش خود بیجاپور کی طرف سے کیجا رہی ہے اور احمدنگر محض اسے قبول کر رہا ہے۔ شاہ نواز خاں ایک زیرک اور معاملہ فہم آدمی تھا، برہان کا مطلب آنکھوں آنکھوں میں تاڑ گیا اور خود مہر بلب ہوگیا، حتیٰ کہ وقت گذرنے لگا دونوں طرف سے

اصل معاملہ کی جانب اشارہ تک ہوتا نظر نہیں آتا تھا، آخر کار مصطفےٰ خاں اور عبدالسلام نے از خود مجلس پر یہ ظاہر کیا کہ برہان نظام شاہ کی یہ خواہش ہے کہ ابراہیم عادل شاہ سے صلح ہو جائے اور کیہ اسی کے متعلق گفت وشنید کرنا چاہتے ہیں، تب شاہ نواز خاں بیباکی سے یہ کہہ اُٹھا کہ "بر عالمیان ظاہر و روشن است کہ دوستی عالم پناہ نہالے است ثمرش بجز راحت و کامرانی نیست، وانحراف از صراط مستقیم محبت و ولائے شاہ عدالت دستگاہ شجریست کہ برش غیر محنت و کلفت نے دوستان جانی را دشمن تصور کردن و دشمنان نہانی را دوست داشتن وبگفتہ سیاہ رویان کور باطن لشکر کشیدن از حزم و اندیشہ دوراست۔" ان الفاظ سے برہان نظام شاہ کے چہرے کا رنگ اُڑ گیا، اور ابراہیم عادل شاہ کی عظمت اور اس کے مقربین درگاہ کی جاں نثاری اور وفاداری کا ایک زبردست ثبوت ملا۔ غرض صلاح اس شرط پر ٹھیری کہ برہان نظام شاہ اپنے ہاتھ سے اس قلعہ کو برباد ومسمار کردے، گو برہان جانتا تھا کہ اس کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی ذلت نہیں ہوسکتی، مگر اس وقت ایسا مجبور تھا کہ سوائے اس شرط پر راضی ہونے کے چارہ ہی نہ تھا، چنانچہ وہ قلعہ گیا اور خود اپنے ہاتھ سے اس کا ایک پتھر نکالا اسکے بعد وہ قلعہ ڈھادیا گیا، اس طرح اس "دلاور خانی جنگ" کا نتیجہ احمد نگر کے حق میں بجز ذلت ورسوائی اور کچھ نہ ہوا لیکن بیجاپور کے لیے یہ جنگ ایک زبردست کامیابی ثابت ہوئی اور بالخصوص اس جنگ کے واقعات سے ابراہیم کی مستقل مزاجی دانائی اور راقبالمندی کا ثبوت ملتا ہے۔
اگر ابراہیم نا اہل اور نا سمجھ ہوتا تو یقیناً یہ جنگ اور یہ حملہ بیجاپور کی کایا ہی پلٹ دیتا لیکن باوجود اپنی کم عمری کے ابراہیم نے اس جنگ میں ایسی مستعدی ہوشیاری اور معاملہ فہمی کا ثبوت دیا ہے کہ اچھے اچھے مدبر اس کے سامنے سر ٹیک دیتے ہیں۔ دلاور خاں جیسا گرم وسرد زمانہ چشیدہ شخص جس نے زندگی کے (۸۰) منازل طے کئے ہوں، جو کئی ایسے انقلابات دیکھ چکا ہو، یوں عاجز ہو جائے! اس کی ساری تدبیریں رائیگاں جائے اور الٹا وہ خود اس جال میں پھنس جائے جس میں ابراہیم کو گرفتار کرنا چاہتا تھا کس قدر تعجب خیز امر ہے! ابراہیم کا فطری تدبر

اس وقت ظاہر ہوا جبکہ اس نے حملے سے بے اعتنائی ظاہر کر کے دلاور خاں کو اپنے دام میں گرفتار کر لیا، ایک تجربہ کار دور اندیش کی طرح وہ تاڑ گیا تھا کہ تمام فساد دلاور خاں کا برپا کیا ہوا ہے اگر دلاور خاں ہاتھ آجائے تو برہان نظام شاہ کو مار بھگانا کوئی بڑی بات نہیں اور اسی لیے اس نے یہ چال چلی جو اس کی دانائی پر دال ہے، اور پھر تاریخوں سے ثابت ہے کہ وہ جنگ کے تمام احکام اپنے سپہ سالار کو اپنے ہی پاس سے بھیجتا تھا، اس طرح اس کی رائے پر یہ پوری جنگ ہوئی ہے۔ اب اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ کم عمر بیس اکیس برس کا بادشاہ نہ صرف مدبر ہی تھا بلکہ جرنیلانہ قابلیتوں سے بھی متصف تھا اسی سلسلہ میں یہ چیز یاد دلانے کے قابل ہے کہ ابراہیم کے زمام سلطنت ہاتھ میں لینے کے بعد اس کی پہلی مہم یہی جنگ ہے جس میں بیجاپوری افواج کو درخشاں کامیابی حاصل ہوئی، اور اس پوری مہم کی کامیابی ابراہیم کے حسنِ تدبر و حسنِ قابلیت کی روشن دلیل ہے۔

(تمت بالخیر)

عثمانیین کی کتابیں

پروفیسر ڈاکٹر سید محی الدین قادری زور — پروفیسر عبدالقادر سروری — ۳۔ مطالعۂ قدرت حصۂ اول۔

۱۔ اردو شہ پارے جلد اول قیمت ۱۲/ ۔ ۱۔ دنیائے افسانہ۔ عہ ۴۔ جدید نصاب طبیعات حصۂ اول و دوم۔

۲۔ روح تنقید۔ عہ ۲۔ کردار اور افسانہ۔ ۱۲/ ۵۔ مصلحان تعلیم۔ عہ

۳۔ تنقیدی مقالات۔ ۲ ۳۔ جدید اردو شاعری۔ ۴/ ۶۔ ابن سعود۔ عال

۴۔ اردو کے اسالیب بیان۔ عہ ۴۔ حیدرآباد کی تعلیمی ترقی۔ ۴/ ۷۔ تجرباتی نفسیات۔ ۴/

۵۔ ہندستانی لسانیات۔ عال ۵۔ چینی اور جاپانی افسانے۔ ۹/ محمد امیر علی اے، بی ٹی

۶۔ تین شاعر۔ میر تقی، میر حسن، اور میر انیس۔ عہ ۶۔ انگریزی افسانے۔ عہ ۱۔ تعلیم مولانا وحید الدین سلیم پروفیسر اردو جامعہ عثمانیہ عہ

۷۔ دیوان زادہ حاتم۔ سید محمد ام اے ۲۔ من کی بانسری مصنف کی وجد آفرین نظموں کا مجموعہ

۸۔ تازیانہ۔ ایک معاشرتی قصہ۔ ۱۔ ارباب نثر اردو فورٹ ولیم کالج کے اردو نثر نگاروں کا تذکرہ ۳۔ شیب و شباب۔ براؤننگ کی مشہور آفاق نظم ابی بن عذرا کا ترجمہ

۹۔ طلسم تقدیر حیدرآباد سے متعلق ایک نیم تاریخی قصہ۔ ۸/ ۲۔ مثنویات میر۔ عال پروفیسر ڈاکٹر میر ولی الدین

۱۰۔ گارسان دتاسی۔ ۳۔ گلشن گفتار۔ ۱۲/ ۱۔ فلسفہ کی پہلی کتاب فلسفہ کی ایک انگریزی کتاب کا ترجمہ۔

۱۱۔ گلزار ابراہیم۔ ۴۔ قصائد ایمان۔ ۸/ ۲۔ مقدمہ مابعد الطبیعات۔

۱۲۔ محمود غزنوی کی بزم ادب۔ ۱۲/ ۵۔ ایمان سخن۔ ۱۲/ ۳۔ برگسان مشہور فرانسیسی فلسفی کی حیات اور نظریہ۔

۱۳۔ انشاپردازی۔ عہ ۶۔ ابتدائی قواعد فارسی۔ ۱۲/ ۴۔ قنوطیت یعنی فلسفۂ یاس جیسا شر نہایات حیات اور رازِ ہستی جیسے دلچسپ و اہم مسائل پر سیر حاصل تبصرہ عال

۱۴۔ عہد عثمانی میں اردو کے دکھنی ارباب قلم کا تذکرہ۔ عہ شیخ چاند مرحوم ام اے ال ال بی — مخدوم علی۔

۱۵۔ کیف سخن۔ ۱۲/ ۱۔ ملک عنبر۔ عہ ۱۔ جغرافیہ سلطنت آصفیہ مدارس کیلیے۔ ۸/

۱۶۔ متاع سخن نواب عزیز یار جنگ بہادر عزیز۔ ۱۲/ ۲۔ ایکنا تھ۔ عہ ۲۔ جغرافیہ عالم۔ ۸/ عہ

۱۷۔ بادۂ سخن ڈاکٹر احمد حسین مائل۔ ۱۲/ ابو المکارم فیض محمد صدیقی بی آ ڈپ ایڈ ۳۔ جغرافیہ کی تعلیم جغرافیہ پڑھانے کا عام طریقہ۔ ار

۱۸۔ مرقع سخن۔ صہ ۱۔ ابتدائی الجبرا عثمانیہ میٹرک کے لیے۔ ۴۔ ذہنی حساب۔ مدارس کیلیے۔ ۲/

۱۹۔ سیر گولکنڈہ۔ عہ ۲۔ ابتدائی ریاضی حصۂ اول و دوم۔ ۵۔ رفیق مدرسین۔ ۸/